حدیث کے اصلاحی مضامین

افادات

حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

ناشر

ادارۃ الصدیق ڈابھیل گجرات

شعبۂ فیض محمود سورت

نمبر	عنوانات	صفحات
	فہرست اخلاص النیۃ واستحضارھا ۱	
۱	عرض ناشر	۱۷
۲	مختصر تعارف امام نووی رحمۃ اللہ علیہ (صاحبِ ریاض الصالحین)	۱۸
۳	تقریظ حضرت اقدس سید مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری نوراللہ مرقدہٗ	۲۲
۴	تقریظ حضرت مولانا ابراہیم صاحب پانڈور ادام اللہ فیوضھم بالعافیۃ التامۃ	۲۴
۵	تقریظ حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم بالعافیۃ التامۃ	۲۵
۶	تقریظ حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم بنارسی صاحب زیدمجدہم	۲۷
۷	تقریظ حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب زیدمجدہم	۲۹
۸	پس منظر	۳۱
۹	اقتباس	۳۴
۱۰	نیت کہتے ہیں دل کے ارادے کو	۳۵
۱۱	دل کا مقام اور اس کی اہمیت	۳۶
۱۲	نیت پر مدار کیوں؟	۳۹
۱۳	عمل کی قدر و قیمت نیت کے مطابق طے کی جائے گی	۴۱
۱۴	وانما لأمرئ مانویٰ کی تشریح	۴۲
۱۵	نیت عمل کی روح	۴۲
۱۶	بدنیتی کا وبال	۴۴
۱۷	اچھی نیت بغیر عمل کے بھی باعث ثواب ہے	۴۶

صفحات	عنوانات	نمبر

فہرست اخلاص النیۃ واستحضارھا ۲

صفحات	عنوانات	نمبر

نمبر	عنوانات	صفحات

فہرست اخلاص النیۃ واستحضارھا ۳

نمبر	عنوانات	صفحات

فہرست توبہ ۱

صفحات	عنوانات	نمبر

فہرست توبہ ۲

فہرست توبہ ۳

نمبر	عنوانات	صفحات

فہرست توبہ ۴

فہرست صبر ۱

نمبر	عنوانات	صفحات

نمبر	عنوانات	صفحات

فہرست صبر ۲

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۲۶	طبعی تکلیف اور بناوٹی تکلیف	۲۵۷
۲۲۷	حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ	۲۶۰
۲۲۸	حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے کچھ مناقب	۲۶۲
۲۲۹	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحبزادی کے نام تعزیت کا پیغام	۲۶۳
۲۳۰	عادت اور عبادت میں فرق	۲۶۴
۲۳۱	جوابی پیغام......صاحبزادی کا اصرار	۲۶۵
۲۳۲	دین دار لڑکے کی کرامت اور اس کی عجیب قربانی	۲۶۷

فہرست صبر ۳

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۳۳	صبر کا صحیح وقت	۲۷۶
۲۳۴	محبوب کے انتقال پر صبر کی فضیلت	۲۷۹
۲۳۵	ہر نیک عمل میں حصولِ ثواب کا استحضار ضروری ہے	۲۸۱
۲۳۶	طاعون کافر کے لئے عذاب......مؤمن کیلئے رحمت	۲۸۲
۲۳۷	طاعون مؤمنین کے لئے رحمت کب بنتا ہے	۲۸۳
۲۳۸	طاعون زدہ علاقہ کے بارے میں شرعی حکم اور اس کی حکمت	۲۸۴
۲۳۹	بینائی نہ ہونے یا ختم ہو جانے کی فضیلت	۲۸۵
۲۴۰	یہ نہ دیکھئے کہ کیا گیا، یہ دیکھئے کہ کیا ملا	۲۸۶
۲۴۱	حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کی سوچ	۲۸۸
۲۴۲	ظاہری بدصورتی کی تلافی	۲۸۸

نمبر	عنوانات	صفحات

فہرست صبر ۴

نمبر	عنوانات	صفحات

نمبر	عنوانات	صفحات

فہرست صبر ۵

صفحات	عنوانات	نمبر

عرضِ ناشر

حامداًو مصلیاًو مسلماً:—اما بعد

تمام تعریفیں اس ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کے لئے ہیں جس کی طرف سے ہرزمانہ میں رشدو ہدایت اوررحمت کی ایسی لہریں چلتی ہیں جن کے سامنے اپنے آپ کوپیش کرنا؛ دنیوی واخروی فلاح وبہبودکا ذریعہ ہے۔اورہر ہرلمحہ درودوسلام کی بارش نازل ہونبی کریم ﷺ کی ذات اقدس پر؛ جن کی زبان مبارک سے بہنے والاکلام کامینھ جب دلوں کی مردہ کھیتیوں پر برستاہےتو وہ کھیتیاں لہلہااٹھتی ہیں۔

اللہ رب العزت کافضل وکرم ہے کہ اس نے ’’حدیث کے اصلاحی مضامین‘‘ کی پہلی جلد منظرعام پرآنے کی شکل وصورت پیدافرمائی، ہرشب یکشنبہ کوبعدنمازِعشاء،مسجدانوار،نشاط سوسائٹی سورت میں حضرت اقدس مولانامفتی احمدصاحب خانپوری دامت برکاتہم ومدت فیوضہم کاعمومی درسِ حدیث کا مقبول سلسلہ پچھلے کئی سالوں سے جاری ہے،اس درس کاکتابی شکل میں اشاعت کاکام بھی ہورہاہے جس کی اب تک دس قسطیں منظرعام پرآچکی ہیں اورتقریباختم ہوچکی ہیں۔قارئین کی طرف سے ان قسطوں کی دوبارہ اشاعت کاشدیدتقاضہ ہورہاتھا،تومناسب معلوم ہواکہ اب قسط واراشاعت کے بجائے جلدوار اشاعت کاکام کیاجائے۔اب تک کے شائع شدہ موضوعات میں جوحدیثیں ریکارڈ نہ ہونے کی وجہ سے شائع ہونے سے رہ گئی تھیں اورحضرت اقدس دامت برکاتہم نے ان احادیث کاتکملہ بھی فرمادیاہے؛ان کابھی اس مجلد سلسلہ میں اضافہ کردیاگیاہے۔اس سلسلہ کی یہ پہلی جلدآپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں پہلی تین قسطوں کومع اضافہ جمع کردیاگیاہے۔

قارئین دعافرمائیں کہ اللہ تعالیٰ یہ سلسلہ جلدازجلدسہولت وعافیت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچائے اورحضرت اقدس دامت برکاتہم کے فیض کوعام وتام فرمائے۔آمین۔

﴿مختصر تعارف امام نوویؒ﴾
(صاحبِ ریاض الصالحین)

امام حافظ شیخ الاسلام محی الدین ابوزکریا یحی بن شرف بن مری بن حسن بن حسین بن محمد بن جمعہ بن حزام نوویؒ محرم ۶۳۱ھ میں دمشق کے ایک گاؤں نویٰ میں پیدا ہوئے وہیں پلے بڑھے اور قرآن مجید حفظ کیا۔

یاسین بن یوسف مراکشیؒ کا بیان ہے کہ میں نے امام نوویؒ کو نویٰ میں دیکھا جب ان کی عمر دس سال کی تھی، بچے ان کو اپنے ساتھ کھیل میں شریک ہونے کے لئے مجبور کر رہے ہیں اور امام ان سے بھاگ رہے ہیں اور بچوں کے مجبور کرنے کی وجہ سے رو رہے ہیں، اور ایسی حالت میں بھی قرآن کریم پڑھ رہے ہیں، یہ دیکھ کر میرے دل میں ان کی محبت بیٹھ گئی۔ ان کے ابا نے ان کو ایک دکان میں رکھ دیا تھا مگر ان کا حال یہ تھا کہ ہر وقت قرآن پڑھنے میں لگے رہتے، دھندے کی طرف دھیان نہ دیتے جب میں نے اس چھوٹی عمر میں قرآن کریم سے ان کا یہ شغف دیکھا تو میں ان کے استاد کے پاس گیا، اور اُن کو اِن کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی اور کہا: کہ مجھے امید ہے کہ یہ اپنے وقت کا بڑا عالم اور بزرگ بنے گا، لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، تو ان کے استاد مجھ سے کہنے لگے: کیا تم نجومی ہو، غیب کی خبریں بتانے والے ہو؟ میں نے کہا: نہیں! لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ بات میری زبان سے کہلوائی ہے، ان کے استاد نے یہ بات امام نوویؒ کے والد سے کہی تو ان کو بھی شوق پیدا ہوا، اور پھر یکسوئی کے ساتھ ان کو قرآن کریم ختم کرنے کا موقع دیا، اب امام بلوغ کے قریب پہنچ چکے تھے۔

پھر آپ نے علم حاصل کرنے کے لئے دمشق کا سفر کیا امام نوویؒ کا بیان ہے: ''جب میری عمر ۱۹/سال کی ہوئی تو میرے والد مجھے ۶۴۹ھ میں دمشق لیکر آئے، میں مدرسہ رواحیہ میں رہنے

لگا، دوسال ایسے گذرے کہ زمین پر کمر ٹیکنے کی نوبت نہیں آئی، اور مدرسہ سے جو وظیفہ ملتا تھا اسی پر گذران ہوتا تھا، تقریباً ساڑھے چار مہینے میں ''التنبیہ'' حفظ کرلی، سال کے باقی حصہ میں ''المھذب'' کے عبادات والے حصہ کا چوتھائی حفظ کیا اور اس کی شرح لکھنی شروع کردی اور تصحیح کے لئے میں نے ہمارے شیخ کمال اسحاق مغربیؒ کا دامن پکڑلیا، جب انہوں نے میرا علمی مشغلہ اور لوگوں سے بالکل نہ ملنا دیکھا تو مجھ سے بہت خوش ہوئے اور مجھے بہت زیادہ چاہنے لگے اور اپنے حلقۂ درس میں جماعت کے اکثر حصہ کے سامنے درس کو دہرانے کی ذمہ داری میرے سپرد فرمادی''۔

ایک مرتبہ مجھے خیال آیا کہ علم طب پڑھنا چاہئے، یہ خیال آتے ہی میں نے فن طب کی مشہور کتاب ''القانون'' خرید لی، اور علم طب پڑھنے کا پکا ارادہ کرلیا، لیکن ان دنوں میرے دل پر ایسی ظلمت چھائی کہ کسی بھی کام میں دل نہیں لگتا تھا، جب میں نے غور کیا کہ آخر یہ ظلمت کہاں سے داخل ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ یہ ظلمت علم طب میں مشغولی کی وجہ سے ہے، اسی وقت وہ کتاب میں نے بیچ دی، بلکہ میرے گھر میں علم طب سے متعلق جو کچھ تھا سب نکال دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ میرا دل پھر سے روشن ہوگیا اور اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔

ایک تذکرہ نویس نے مختلف فنون میں ان کی ۲۸ تصنیفات کا ذکر کیا ہے'' شرح مسلم، ریاض الصالحین'' اور ''الاذکار'' ان کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور ہیں

تقویٰ اور زہد میں بھی بڑے مقام پر تھے۔عیش وعشرت اور آسائش سے دوری، تقوی، قناعت، ورع اور خلوت وجلوت میں اللہ تعالیٰ کا دھیان، اچھے کپڑے، اچھے کھانے اور وضع قطع میں تکلف سے دوری ان کے خصوصی اوصاف تھے، معمولی سالن کے ساتھ روٹی کھانے کا معمول تھا، کچا کپڑا آپکا لباس تھا اور باریک عمامہ کا معمول تھا۔

علاء الدین بن عطارؒ کہتے ہیں کہ وہ دمشق کا میوہ نہیں کھاتے تھے میں نے اس بارے میں ان سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ معلوم ہے کہ ان میووں کے لین دین کی جو شکل دمشق کے بازاروں میں رائج ہے اس میں شرعی اعتبار سے قباحت ہے، باغات یا تو اوقاف کے ہیں یا ذاتی ملکیتیں ہیں دونوں صورتوں میں مالک ایسے لوگ ہیں جن پر معاملات کرنے کی شریعت کی طرف سے پابندی عائد ہے مثلاً بچے پاگل وغیرہ، ان باغات کے منتظمین ان کے اولیاء ہیں اور یہ لوگ سینچائی کرنے والوں کے ساتھ اس طرح معاملہ کرتے ہیں کہ باغات کے اصل مالک سراسر نقصان میں رہتے ہیں، نفع کے ہزار حصوں میں سے بچوں کا صرف ایک حصہ طے کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ اولیاء کو شریعت ایسے تصرف کی ہرگز اجازت نہیں دیتی، جب مجھے یہ صورتِ حال معلوم ہے تو میں اپنے لئے پھل کھانا کس طرح صحیح سمجھوں؟

رشید الدین اسماعیل بن معلم الحنفیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام نوویؒ کو حمام میں داخل نہ ہونے اور گذران میں تنگی کرنے کے بابت عتاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ حمام میں کیوں داخل نہیں ہوتے ہیں، نیز اتنی تنگ زندگی کیوں گذارتے ہیں؟ مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کو کوئی ایسی بیماری نہ لگ جائے جو آپ کو اپنے سوچے ہوئے کام انجام دینے سے روک دے، تو مجھ سے فرمانے لگے کہ ”فلاں آدمی نے کثرت سے روزہ رکھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اتنی کثرت سے کی کہ اسکی ہڈیاں ہری ہوگئیں، میری عبادت اور مجاہدہ تو اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے“، میں ان کے اس جواب سے سمجھ گیا کہ ان کو نہ دنیا میں کوئی دلچسپی ہے، اور نہ ہماری حالت کی طرف کوئی توجہ ہے۔

امراء اور بادشاہوں کے پاس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں جاتے ان کو نصیحت کے خطوط لکھتے کہ رعایا کے ساتھ انصاف کریں، ٹیکس کو ختم کریں، اہلِ حقوق کو ان کے حقوق ادا کریں۔

ابوالعباس بن فرحؒ کا بیان ہے کہ شیخ نوویؒ کو تین ایسے مقامات حاصل تھے کہ ان میں سے ایک مقام بھی اگر کسی کو حاصل ہو جائے تو وہ اس قابل ہے کہ اس کی زیارت و ملاقات کے لئے مستقل سفر کیا جائے، ایک مقام علم، دوسرا زہد اور تیسرا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

یونینی کا بیان ہے کہ امام نوویؒ نے ایک معاملہ میں بادشاہ کی مخالفت کی، تو بادشاہ غصہ ہو گیا اور ان کے ساتھ سختی کرنے کا ارادہ کیا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ رکھا اور بادشاہ بعد میں ان کا گرویدہ ہو گیا، ان کی تعظیم کرنے لگا، کہتا تھا کہ مجھے ان سے ڈر لگتا ہے

۶۷۶ھ میں لوٹ کر پھر سے نویٰ تشریف لائے، اوقاف کی جو کتابیں برائے استعمال لی تھیں سب واپس کیں، اپنے شیوخ کے مقبرہ کی زیارت کی، قرآن پڑھا، دعا کی اور روئے، جو احباب حیات تھے ان سے ملے، اور ان کو الوداع کہا۔

احباب کی ایک جماعت آپ کو دمشق کی طرف روانگی کے لئے رخصت کرنے باہر تک آئی، ان لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ پھر کب ملاقات ہوگی؟ تو آپ نے فرمایا: دو سو سال بعد۔ یہ لوگ سمجھ گئے کہ مراد قیامت ہے۔

اپنے والدِ محترم سے ملاقات کے بعد بیت المقدس کا سفر کیا پھر نویٰ آئے اور بیمار ہو گئے اور اسی بیماری میں ۲۴/ رجب بدھ کی شب میں عالَمِ آخرت کو سدھار گئے۔ جب آپ کے انتقال کی خبر پھیلی تو دمشق اور اس کے اطراف میں کہرام مچ گیا، مسلمانوں کو سخت افسوس ہوا، دمشق سے قاضی القضاۃ عز الدین محمد بن صائغ اور ان کے ساتھیوں کی ایک جماعت نماز جنازہ میں شرکت کے لئے نویٰ روانہ ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے اور آپکا حشر انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین کے ساتھ فرمائے (آمین)

(ماخوذ از مقدمہ ریاض الصالحین، مطبوعہ دہلی)

تقریظ

حضرت اقدس سید مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری نوراللہ مرقدہٗ

(پیدائش شوال ۱۳۲۱ھ مطابق دسمبر ۱۹۰۳ء ☆ وفات ۲/ رمضان ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۸/ نومبر ۲۰۰۱ء)

☆ ☆

دو آتشہ شراب اور سونے پر سہاگہ والی مثل مشہور ہے، اس درس پر جو آپ کے ہاتھوں میں ہے دونوں مثالیں پورے طور پر صادق آتی ہیں، درس حدیث کا ہو اور صاحبِ درس ایک صالح خداترس، پرہیزگار، وفا شعار اور عالم باعمل انسان ہو، جس کی طبیعت میں سادگی ہو، فکرِ آخرت ہو، دنیا سے دوری ہو اور امت وملت کا درد ہو یعنی عزیزِ مکرم مولانا مفتی احمد خانپوری ﴿سلمہٗ اللہ وزادہٗ علماً وعملاً﴾ تو اس درس میں جتنی خوبیاں جمع ہوں قرینِ قیاس ہے۔ سورت میں ہونے والے اس درس کا افادہ کھلے طور پر محسوس کیا جارہا ہے، مفتی صاحب کا طرزِ تفہیم بھی نرالا ہے کہ سامعین کی توجہ مکمل طور پر بیان ہونے والے مضمون پر مرکوز ہوجاتی ہے، سامعین تھوڑی دیر کے لئے ماحول سے بے خبر ہوجاتے ہیں، احادیثِ طیبہ کے مضامین کو الہامی مثالوں اور اسلافِ عظام اور بزرگانِ ملت کے واقعات کی مدد سے خوب کھول کر مخاطبین کے سامنے پیش کرنا مفتی صاحب کی خصوصیت ہے، اندازِ بیان ایسا ہے کہ سننے والا اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا ہے، بہت قوی امید ہے کہ اس کی اشاعت سے ان لوگوں کو بھی فائدہ ہوگا جن تک پہنچے گی۔

عزیز موصوف سے قدیم شناسائی ہے، دارالعلوم اشرفیہ میں دورِ طالبِ علمی میں پابندی سے گھر پر آتے، جو وقت طلبہ کے قیلولہ کا ہوتا ہے یہ اُسمیں نقلِ فتاویٰ کا کام کرتے،

سالانہ تعطیلات میں زیادہ سے زیادہ ایام میرے پاس گذارنے کی کوشش کرتے، ایک مرتبہ تو تعطیل کا مکمل زمانہ بشمول رمضان المبارک میرے یہاں گذارا اور فتاویٰ کے کام میں ہاتھ بٹایا اپنے اساتذہ بالخصوص مولانا اجمیری صاحبؒ کے منظورِ نظر اور چہیتے شاگردوں میں سے رہے ہیں، حضرت مولاناؒ کی خاص نظر تھی ان پر۔ اللہ کرے کہ بقیہ قسطیں بھی جلد از جلد منظرِ عام پر آویں، اس راہ کی تمام رکاوٹیں عافیت کے ساتھ ختم ہو جائیں، اس قسط کو اور بقیہ اقساط کو قبولیت اور مقبولیت عطا فرمائے۔

﴿آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وصحبہٖ وسلم تسلیما کثیرا کثیرا﴾

احقر سید عبد الرحیم لاجپوری غفر لہٗ (بقلم خادم)

۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ

۲۸/ جولائی ۲۰۰۱ء

تقریظ

حضرت مولانا ابراہیم صاحب پانڈورادام اللہ فیوضہم بالعافیۃ التامۃ

﴿خادمِ خاص حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ﴾

باسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

بزرگوں کے ملفوظات اور مواعظ کو افادۂ عام کی غرض سے شائع کرنے کا دستور قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے اور اس کا نفع بھی ظاہر ہے۔

یادگارِ اسلاف جامعِ شریعت وطریقت حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ کے خلیفۂ اجل حضرت اقدس مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب زید مجدہم مفتی و استاذِ حدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات کی ہفتہ واری مجلسِ درس حدیث شب یکشنبہ کو سورت میں ہوتی ہے اس کو مولانا عبدالمنان منیار صاحب زید احترامہٗ ٹیپ کے ذریعہ محفوظ کرتے رہے ہیں پھر انہوں نے مولانا سلمان منیار صاحب زید مجدہٗ کے ساتھ مل کر کتابی شکل میں جمع کیا اور اب اس کو طباعت کے ذریعہ منظر عام پر لانے کا ارادہ فرمارہے ہیں۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا عجیب نظام ہے کہ جو بھی کام اخلاص کے ساتھ کیا جائے اس کے قبول ہونے کی علامت ایک یہ بھی ہے کہ اس کو مخلوق کے نفع اور ہدایت کے لئے عام کرنے کے اسباب آسان طریقہ سے پیدا بھی فرمادیتے ہیں اور خوش نصیب ہیں وہ حضرات جو اس میں حصہ لیتے ہیں اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو قبول فرما کر مخلوق کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

فقط

(مولانا) ابراہیم غفرلہٗ

۲۰/۶/۲۲ھ

تقریظ

حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم بالعافیۃ التامۃ

[سرپرست دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر، مقیم ٹورنٹو۔کینیڈا]

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین ۔ والصلوۃ والسلام علیٰ سید المرسلین ۔ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

یہ بات مسلّم ہے کہ آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں، قیامت تک اب کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں، آپ ﷺ نے قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے دو مضبوط چیزیں چھوڑی ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قرن اول سے آج تک ہر دور اور ہر علاقہ میں ایسے علماء پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے دین کے ان دونوں ماخذوں کی تفسیر وتشریح میں اپنی عمریں تمام کردیں اور امّت کے لئے کتاب اللہ اور احادیثِ رسول اللہ ﷺ سے استفادہ کو آسان بنادیا (فجزاہم اللہ عن المسلمین خیرا)

موجودہ دور میں دنیا کی مختلف زبانوں میں تفاسیر قرآنیہ اور شروحات حدیثیہ کا ایک بڑا ذخیرہ دستیاب ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری وساری ہے۔

خدمتِ حدیث شریف کے سلسلے کی ایک کڑی یہ کتاب بھی ہے جو ''حدیث کے اسباق'' کے نام سے ہمارے دونوجوان فضلاء مولوی عبدالمنان منیار صاحب زادہ اللہ علماً وفضلاً اور مولوی سلمان صاحب منیار سلمہ اللہ تعالیٰ وبارک فی علمہ شائع فرمارہے ہیں۔

یہ ''حدیث کے اسباق'' اُس درس کا خلاصہ اور نچوڑ ہیں جو مصلح العلماء حضرت مولانا

مفتی احمد خانپوری صاحب مدظلہ العالی ہر ہفتہ سورت میں منعقد اصلاحی مجلس میں دیتے ہیں، مولانا موصوف ایک جید الاستعداد اور حدیث وفقہ پر گہری بصیرت کے حامل عالم ہیں اور جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں سالہا سال سے درسِ حدیث وفقہ میں مشغول ہیں اور احادیث کے مفاہیم کو آسان اور عام فہم انداز میں پیش کرنے کا اللہ تعالیٰ نے اُن کو خاص سلیقہ عطا فرمایا ہے، اس لئے ان اسباق کی طباعت ہر خاص وعام کے لئے مفید ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت اقدس مفتی صاحب مدظلہ کی اس عظیم دینی خدمت کو قبول فرمائے، اور اُمّت کو اس سے مستفید ہونے کی سعادت وتوفیق مرحمت فرمائے (آمین)

مولانا عبد المنان صاحب اور مولانا سلمان صاحب سب اہل علم اور دینی ذوق رکھنے والوں کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان حضرات نے اس قیمتی افادات کو شائع کرنے کا بیڑا اُٹھایا، اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

علامہ بوصیریؒ نے اپنے مشہور قصیدہ میں فرمایا ہے

دعا الی اللہ فالمستمسکون بہ مستمسکون بحبل غیر منقصم

یقیناً امتِ اسلامیہ کے لئے اس مضبوط رسی کو تھامنے کے علاوہ نجات کی اور کوئی راہ نہیں۔

مپندار سعدی کہ راہِ صفا تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائے، اور حسن خاتمہ کی دولت سے مالا مال فرمائے [آمین] والسلام

احقر عبد اللہ غفرلہ کاپودروی

۹/ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ

مطابق ۹/۲/ ۲۰۰۳ء

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

تقریب

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم بنارسی صاحب زید مجدہم

شیخ الحدیث ومفتی جامعہ اسلامیہ بنارس ورکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ امر بندہ کے لئے باعث اعزاز وافتخار ہے کہ بندہ کو اپنے رفیقِ درس اور مخلص دوست حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری زید مجدہم کے افادات بعنوان ’’حدیث کے اسباق‘‘ پر چند سطریں لکھنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

۱۳۸۷ھ کا زمانہ حضرت مفتی صاحب کے ساتھ رفاقت کے آغاز کا زمانہ تھا جب حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں رہتے ہوئے مشق افتاء اور استفادہ واستفاضہ کی توفیق حاصل تھی اس وقت بندہ جناب مفتی احمد صاحب کی علمی صلاحیت، استحضار اور اخذ واستنباط کے ملکہ سے مرعوب تھا اللہ تعالیٰ نے فراغت کے بعد جہاں موصوف سے افتاء اور درس حدیث کی خدمت لی؛ وہیں بندگانِ خدا کی ہدایت اور اصلاح کے لئے بھی قبولیت سے نوازا، بفضلہٖ تعالیٰ موصوف کے وابستگان ومستفیدین کا دائرہ گجرات تک محدود نہ رہتے ہوئے افریقہ، امریکہ، ری یونین، انگلینڈ اور بہت سے ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے علم میں برکت رکھی ہے کہ موصوف کی درس گاہ سے ہزاروں تشنگانِ علم سیراب ہوئے، ہزاروں فتاویٰ آپ کے قلم سے صادر ہوئے اور وعظ وتذکیر سے بھی بہت بڑا طبقہ مستفید ہو رہا ہے۔

ربّ العزّت جب کسی سے کام لینا چاہتے ہیں تو اس کو مناسب ماحول اور اچھے رفقاء بھی مہیا فرما دیتے ہیں، خوش نصیب ہیں حضرت مفتی صاحب کے وہ خدام جن کو توفیق ہوئی کہ موصوف کے افاداتِ علمیہ کو مرتب فرما کر کتابی شکل میں شائع کرنے کا سلسلہ جاری کررہے ہیں، اس طرح ان افادات کا دائرہ بھی وسیع ہوگا اور ان کی حفاظت بھی ہوسکے گی۔

خدا کرے یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے اور اس سے بیش از بیش نفع پہونچے، بندہ کا تأثر یہ ہے کہ ان اسباق سے احسان وسلوک کے شیدائیوں کے ساتھ طلبۂ حدیث کو بھی بہت نفع حاصل ہوگا، اپنی کم مائیگی کے سبب خود اگرچہ کچھ نہیں کرسکتا لیکن احباب کے کارناموں سے مسرت ضرور ہوتی ہے۔

بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

ابو القاسم نعمانی غفرلہٗ
جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب۔ بنارس
۱۵/ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ

تقریظ

حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب زید مجدہم

بانی ومہتمم دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ ضلع بارہ مولہ کشمیر

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم......امابعد

خوش نصیب ہیں وہ حضرات جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ قال اللہ اور قال الرسول ﷺ کے مقدس مشغلہ میں لگا دیتے ہیں پھر اگر اس کے ساتھ ساتھ بندگانِ خدا کے تعلق کو خدائے برحق کے ساتھ جوڑنے کا عظیم کام بھی ان سے متعلق ہو تو سونے پر سہاگہ ہے، ہدایت کے وجود وبقا کی یہی صورتیں ہیں اور ان کے لئے من جانب اللہ ہی توفیق شامل حال ہوتی ہے ہمارے اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کو یہی امتیاز اللہ پاک نے عطا فرمایا ہے، اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہمارے محترم ومخدوم مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری بھی ہیں جو سالہا سال سے مشہور اسلامی علمی مرکز (جس کی عظیم تاریخ وانتساب ہے یعنی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل) میں بخاری شریف جیسی عظیم کتاب کا درس دیتے ہیں، نیز حضرت اقدس فقیہ الامت جامع شریعت وطریقت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے خلیفہ مجاز ہونے کی حیثیت سے مخلوقِ خدا کی باطنی وروحانی تربیت اور تزکیہ کے اہم فریضہ کو ادا کرنے میں مصروف ہیں ان کے اس درسِ حدیث (جو ایک ہفتہ وار مجلس میں عوام وخواص کے باذوق شائقین میں کئی سال سے مسلسل ہو رہا ہے) کو قدرداں دوستوں نے ضبط کر کے اس کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

حدیثِ پاک خود مہتم بالشان ہے پھر اس کی تدریس میں مشغول شخصیت جب ظاہری و باطنی امتیاز سے متصف ہو؛ تو اس کی افادیت ظاہر و باہر ہے۔ اس وقت افاداتِ حدیث کے سلسلے کا پہلا جزو ہمارے سامنے ہے جو ظاہری و باطنی خوبصورتی سے آراستہ و پیراستہ ہے، مضامین نہایت سلیس و عام فہم انداز میں بیان ہوئے ہیں جس سے عوام کیلئے بھی استفادہ آسان ہو گیا ہے۔

یہ ناکارہ دل سے دعا کرتا ہے کہ اللہ پاک اس سلسلہ کو مبارک فرمائے اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کو آسان بنائے امت کے لئے نافع بنے اور بارگاہِ خداوندی میں قبولیت کی اعلیٰ منزلیں صاحبِ افادات، اس کے جامعین، مرتبین اور ناشرین وقارئین کو اوران کے طفیل میں اس ناکارہ راقم الحروف کو بھی نصیب ہوں۔ **وماذالك علىٰ الله بعزيز**

اس مبارک سلسلہ پروقت کے مشہور ومعروف جلیل القدر عالمِ دین حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری نور اللہ مرقدہٗ اور خادم فقیہ الامت حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب دامت برکاتہم کی تقریظ کے بعد مزید کسی تقریظ کی حاجت نہیں، لیکن اپنے محبِّ مکرم مولانا محمد سلمان صاحب سورتی زادہم اللہ علما وعملا وعرفانا کے ارشاد کی بنا پر ان حضرات کی حوصلہ افزائی کے لئے یہ چند سطریں سپردِ قلم کر کے اس کارِ سعادت میں شریک ہوا؛ تاکہ اللہ پاک اس ناکارہ کو بھی اس سعادت سے فیضیاب فرمائے۔ آمین۔

وانا العبد الاواہ الیٰ عفو اللہ

محمد رحمت اللہ عفی عنہ وعافاہ (قاسمی کشمیری)

خادمِ دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر (واردِ حال جامعہ محمودیہ میرٹھ)

۱۳/ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ

پس منظر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً ومصلیاً مسلماً......اما بعد

سیدی ومولائی حضرت اقدس فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہ وبرد مضجعہ کی وفات حسرت آیات کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سورت میں مقیم معتقدین و منتسبین خصوصاً محبِّ مکرم مولانا محمد علی صاحب منیار زید مجدہم (خلیفۂ مجاز حضرت اقدسؒ) کا تقاضہ اور اصرار رہا کہ ہفتہ میں کسی ایک دن آپس میں مل بیٹھنے کی کوئی صورت نکالی جائے، کچھ عرصہ تک اس کو عملی جامہ پہنانے میں تردّد رہا اسی دوران حضرت اقدس مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی ﴿نور اللہ مرقدہٗ﴾ کی تشریف آوری ہوئی، اور احقر نے احباب کی اس خواہش اور اصرار کا تذکرہ بغرض استصواب کیا تو حضرتؒ نے بڑی حوصلہ افزائی کے ساتھ تاکید فرمائی کہ یہ سلسلہ ضرور شروع کیا جائے، چنانچہ شب یکشنبہ کو اس کے لئے تجویز کرتے ہوئے مسجد ابرار (شالیمار سوسائٹی سورت) میں جمع ہونا طے ہوا، جس کی ترتیب یہ رکھی گئی کہ مغرب کی نماز وہاں ادا ہو اور بعد نمازِ مغرب تا عشاء مجلسِ ذکر ہو اور عشاء کی نماز کے بعد حدیث کا درس ہو، اور اس کے لئے ریاض الصالحین کا انتخاب عمل میں آیا، چنانچہ اس پروگرام پر بنامِ خدا عمل شروع کر دیا گیا، نیت یہ تھی کہ احباب کی معیت میں دین کی باتوں کے مذاکرہ سے خود بھی فائدہ اٹھانے کی توفیق ہو، اس طرح یہ سلسلہ بحمد اللہ شروع ہوا اور دھیرے دھیرے اس میں شرکت کرنے والوں میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ مسجد ابرار اس کے لئے تنگ پڑنے لگی، بالآخر اس مجلس کو مسجد انوار (نشاط سوسائٹی سورت) میں منتقل کیا

گیا، اور سننے والوں کے ساتھ احقر کو بھی اس سے بڑا فائدہ محسوس ہوا۔

اس مجلس میں ہونے والے درس حدیث کو کیسٹ میں ضبط کرنے کا اہتمام دوسری مجلس ہی سے عزیزِ مکرم مولوی عبد المنان بن شیخ محمد منیار صاحب نے کیا، جس کا سلسلہ آج تک برابر جاری ہے اب تو اس کو ضبط کرنے والے بھی بہت سے احباب ہو چکے ہیں، عزیز موصوف ہی نے بعض رفقاء کی حوصلہ افزائی اور ترغیب پر ان مجالس کو کیسٹ سے کاغذ پر بذریعۂ قلم اتارنے کا سلسلہ شروع کیا، اور بغرض افادہ اس کی بالاقساط اشاعت کی اپنی خواہش کا انھوں نے احقر کے سامنے اظہار کیا جس کی ان کے دیگر رفقاء نے یہ کہہ کر تائید کی کہ ان شاء اللہ اس کی اشاعت سے بھی اللہ کے بندوں کو فائدہ پہنچنے کی قوی امید ہے، چنانچہ اس سلسلہ کو اپنے لئے باعث اجر و ثواب اور ذریعۂ نجات سمجھ کر احقر نے بھی اس کی اشاعت کی اجازت دے دی۔

یہ کوئی باقاعدہ تصنیف و تالیف نہیں بلکہ احباب کی مجلس میں بہ نیت درس کی ہوئی باتیں ہیں جن کو انہی احباب نے تحریر کا جامہ پہنا کر پیش کیا، اس میں جو کچھ قصور اور کمی اور کوتاہی نظر آئے وہ احقر کا حصہ ہے، پڑھنے والے احباب سے اس کی اصلاح کی درخواست ہے ساتھ ہی دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مضامین کو ہم سب کے لئے مفید اور نافع بنائے۔ ﴿ان أريد الا الاصلاح ما استطعت وما توفيقي الا بالله عليه توكلت واليه أنيب﴾

املاہٗ العبد احمد خانپوری عفی عنہٗ

شب ۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ

۲۵/ جولائی ۲۰۰۱ء

اخلاص
و
استحضارِ نیت

﴿ مجلس ۱ ﴾

اقتباس

اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے، گوشت کا ٹکڑا ہے

جب وہ ٹھیک اور درست ہوتا ہے تو سارا جسم ٹھیک اور درست رہتا ہے، سارے اعمال ٹھیک اور درست ہوتے ہیں، اگر ہمارے قلب کے اندر صلاح آ گئی، ہمارا قلب ٹھیک ہو گیا، ہماری نیتوں کے اندر درستگی آ گئی تو سارے اعمال ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور اگر وہ بگڑ گیا تو اعضاءِ جسم سے جتنے بھی اعمال وجود میں آتے ہیں وہ سارے خراب اور بگڑے ہوئے وجود میں آئیں گے۔ اس لئے کہ جہاں سے عمل نکل رہا ہے، عمل کا سرچشمہ ہی بگڑا ہوا ہے تو پھر وہاں سے جو کچھ بھی آئے گا؛ وہ بگڑا ہوا ہی آئے گا۔ جیسے پانی ٹنکی سے سپلائی ہو رہا ہے اگر وہیں گڑ بڑ ہے، وہاں سے پانی زہریلا نکل رہا ہے

تو سب جگہ ایسا ہی زہریلا پہنچے گا، اور وہاں اگر اچھا ہے تو دوسری جگہ اچھا ہی پہنچے گا۔

یہ مجلس تاریخ ۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ مطابق ۲۱؍ستمبر ۱۹۹۶ء کو ''مسجد ابرار'' سورت میں ہوئی

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِأَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَمُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُأَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُأَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ أٰلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراًكَثِيْراً.أمابعد. اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ . بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿وَمَآ اُمِرُوْآاِلَّالِيَعْبُدُوْااللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُواالزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ﴾

وقال تعالىٰ: ﴿لَن يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَاوَلَادِمَآئُهَاوَلٰكِن يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾

وقال تعالىٰ: ﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْامَافِىْ صُدُوْرِكُمْ اَوْتُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾

عن أمير المؤمنين أبى حفص عمربن الخطاب رضی اللہ عنہ قال: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يقول : اِنَّمَاالْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَالِكُلِّ امْرِئٍ مَانَوىٰ فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلىٰ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلىٰ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ لِدُنْيَايُصِيْبُهَاأَوِامْرَأَةٍ يَّنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلىٰ مَاهَاجَرَاِلَيْهِ .

﴿نیت کہتے ہیں دل کے ارادے کو﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کے پہلے باب کو اخلاص اور احضارِ نیت کے عنوان پر قائم کیا ہے کہ آدمی کو ہر عمل خالص اللہ کے واسطے کرنا چاہیے اور اپنے تمام اعمال، افعال، اقوال اور احوال میں نیت مستحضر رکھنی چاہیے ''نیت کہتے ہیں دل کے ارادے کو''۔

﴿دل کا مقام اور اس کی اہمیت﴾

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا ہے اور جو اعضاء انسان کو عطا فرمائے ہیں اس میں ہر عضو اپنی جگہ پر بہت زیادہ قیمتی، اہم اور اپنی اپنی حیثیت کے اعتبار سے بہت زیادہ مفید اور کار آمد ہے۔ آنکھ کو لے لیجئے، آنکھ اپنی جگہ پر بڑی مفید چیز ہے، اگر کوئی آدمی بینائی سے محروم ہو جائے تو اس سے پوچھئے کہ اسکے لئے پوری دنیا اندھیری ہو جاتی ہے۔ کان کی نعمت اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمائی یہ اپنی جگہ پر بہت قیمتی، اہم چیز اور بہت بڑی نعمت ہے۔ زبان بہت بڑی نعمت ہے، ناک بہت بڑی نعمت ہے، ہاتھ پاؤں اور دوسرے تمام اعضاء، یہاں تک کہ بال اور مسامات جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیدا فرمائے؛ وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ان میں سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا عضو بھی اگر اپنا عمل چھوڑ دے تو آدمی کا پورا نظامِ زندگی اس سے متأثر ہوتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاں ان اعضاء کو پیدا فرمایا وہیں اس انسانی جسم میں ایک عضو قلب کے نام سے بھی پیدا فرمایا ہے جس کو ہم دل کہتے ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ دل سارے اعضاء کا رئیس اور سردار ہے ﴿أَلاوَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً. اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَافَسَدَتْ فَسَدَالْجَسَدُ كُلُّهُ أَلاوَهِيَ الْقَلْبُ (مشکوٰۃ ص ۲۴۱ کتاب البیوع فصل اول بحوالۂ بخاری ومسلم)﴾ اس کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ اگر یہ ٹھیک اور درست ہے تو سارے اعضاء ٹھیک اور درست ہیں اور اگر اس میں فساد اور خرابی آ گئی تو تمام اعضاء میں خرابی اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔

اب یہ درستگی وفساد یا اس کا ٹھیک ہونا اور بگڑنا، ظاہری اعتبار سے دیکھا جائے تو اور

باطنی اعتبار سے دیکھا جائے تو؛ دونوں ہی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، اگر کسی کے قلب پر حملہ ہوتو اس کی وجہ سے سارے اعضاء متأثر ہو جاتے ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ بھئی! اس کو تو قلب کا مرض ہے، ہر وقت آدمی خطرے میں رہتا ہے، حرکت بھی اس کے لئے مشکل ہو جاتی ہے۔ یہ تو ظاہری اعتبار سے ہوا،لیکن حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے اس کے باطن کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ویسے اللہ تعالیٰ نے قلب کو جو ریاست اور سرداری کا مقام عطا فرمایا ہے اسی کا یہ تقاضہ ہے کہ انسانی جسم کا کوئی عضو قلب کے بغیر اپنا عمل انجام نہیں دیتا۔آدمی جب کسی چیز کو دیکھنا چاہتا ہے تو پہلے اس کے دل میں اس چیز کے دیکھنے کا ارادہ اور خواہش پیدا ہوتی ہے پھر دل آنکھوں کو حکم کرتا ہے اور آنکھ دل کا اشارہ پانے پر اس چیز کی طرف متوجہ ہوتی ہے، گویا آنکھوں کے دیکھنے کا عمل دل کے ساتھ ہے۔

یہی حال زبان کا ہے، جب آدمی کسی کے ساتھ محبت کی یا بغض کی اچھی یا بری بات کرنا چاہتا ہے تو پہلے دل میں اس کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور دل ہی کی طرف سے اشارہ اور حکم پا کر زبان حرکت میں آتی ہے اور پھر جو کچھ بولنا ہوتا ہے دل کے ارادے کے مطابق اپنا عمل ظاہر کرتی ہے۔

کانوں کو لے لیجئے، ہاتھوں کو لے لیجئے، پاؤں کو لے لیجئے، ہر عضو کے عمل کا یہ حال ہے۔آپ کسی کو کوئی چیز دینا چاہیں اور اس کو لاکھ کہیں لیکن جب تک اس کا دل آمادہ نہیں ہوگا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر یہ چیز لے تو ہاتھ یوں ہی رکھے ہوئے ہیں جب تک اس کا دل نہیں چاہے گا اور دل اس کے ہاتھوں کو آگے بڑھنے کے لئے حکم نہیں کرے گا تب تک ہاتھ

آگے نہیں بڑھیں گے اوراس چیز کوقبول کرنے کے لئے تیارنہیں ہوں گے،اسی لئے تو کبھی کسی کوہم سمجھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بھئی! تمہارا دل اگرآمادہ ہوجائے تو پھر معاملہ آسان ہے۔جیسے کہ اردو میں کہتے ہیں کہ :-

تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

آدمی کوئی کام کرنانہیں چاہتا تو بہانے کرتا ہے اس وقت لوگ کہتے ہیں کہ تیرا جی نہیں چاہ رہاہے، تیرا جی چاہتا تو یہ سب بہانے ایسے ہی رکھے رہ جاتے۔

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قلب کو وہ مقام عطا فرمایا ہے کہ جسم کے تمام اعضاء کے عمل اسی قلب کے اوپر موقوف ہیں، ظاہری اعمال جتنے بھی ہیں، آنکھوں کا دیکھنا، زبان کا بولنا، ہاتھوں کا پکڑنا، پاؤں کا چلنا، کانوں کا سننا، اوردوسرے تمام اعضاء کے اعمال سب دل پر موقوف ہیں، دل جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو متعلقہ عضو کوحکم کرتا ہے اوراُس کے حکم کی بجا آوری کے طور پر وہ عضو اس کام کوانجام دیتا ہے، گویا اللہ تبارک وتعالیٰ نے قلب کو تمام اعضاء کا سردار بنایا ہے، ریاست اور سرداری کا مقام عطا فرمایا ہے، یہ ظاہری افعال کے وجود میں آنے کے لئے ہے۔

اسی طریقے سے باطنی کام کا حال ہے۔نیتوں کو دیکھا جائے۔نیت کہتے ہیں دل کے ارادے کو۔ ہر کام کا مدار شریعت میں نیت کے اوپر رکھا گیا ہے وہ اس لئے کہ جتنے بھی کام ہیں ظاہری اعتبار سے بھی ان کا مدار دل اور قلب پر تھا اور باطنی وروحانی اعتبار سے بھی اس کی بنیاد قلب کے عمل ہی پر موقوف رکھی گئی۔

نیت پر مدار کیوں؟

چنانچہ اس قلب کے اندر جو جذبات ہیں اور قلب جن جذبات کو مدِ نظر رکھ کر کام انجام دلواتا ہے اسی کے مطابق کسی کام کی قدر و قیمت طے ہوتی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کا معاملہ تو بہت اونچا ہے لیکن انسانوں کا حال بھی یہ ہے کہ اگر ایک آدمی آپ کو بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ اپنے گھر لے گیا، کھانا کھلایا، چائے پلائی اور بڑے آرام سے رکھا، آپ کا خوب اعزاز واکرام کیا۔ آپ دیکھئے! اس کے سارے اعضاء آپ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، ہاتھ جو مناسب خدمت ہے وہ انجام دے رہے ہیں، پاؤں مناسب خدمت انجام دے رہے ہیں، آنکھیں اور کان بھی آپ کی طرف متوجہ ہیں گویا آپ کا ہر حکم بجالانے کے لئے وہ تیار ہے اور آپ کو ہر طرح کی راحت پہنچانے کے لئے اس نے اپنے آپ کو مشغول کر دیا ہے، اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اس کا دل اس کو کہہ رہا ہے کہ اس طرح کرو۔

اب نیت تو ارادے اور عزم کو کہتے ہیں۔ لیکن حدیث میں جہاں نیت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہاں مراد ہوتا ہے وہ مقصد اور غرض و غایت جس کے پیشِ نظر آدمی کام انجام دیا کرتا ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا کہ ایک آدمی نے ہماری ساری خدمت کی، ہر طرح کی راحت پہنچائی، یہ دو حال سے خالی نہیں، اگر ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ اس آدمی کو ہمارے ساتھ دلی محبت ہے اور اس کے دل میں ہمارے واسطے مقام ہے اور اسی دلی محبت کا تقاضہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اکرام کا اور راحت پہنچانے کا معاملہ کر رہا ہے تو اس کے اس عمل کی قدر و قیمت ہماری نگاہوں میں بہت بڑھ جائے گی اور ہم یوں سوچیں گے کہ دنیا میں ایسے کتنے لوگ ہیں جو ہمارے ساتھ اس طرح محبت کا معاملہ کرنے والے ہیں، واقعتاً

یہ آدمی بڑا قابلِ قدر ہے کہ اس نے میرے ساتھ یہ معاملہ کیا، آپ اس کے اس جذبے کے معلوم ہونے پر اُس کے اِس سلوک کی قدر کریں گے۔

لیکن اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ اصل تو اس کی کوئی ضرورت اور کام ہے جو وہ ہم سے کروانا چاہتا ہے اس لئے اس نے یہ سارا کچھ کیا ہے، ہمیں لے آیا، دعوت کی، کھلایا پلایا؛ وہ محض اپنی ایک ضرورت کے واسطے تھا۔ تو بس! اس کی اتنی ساری محنت، ہمارے لئے اتنی مشقت برداشت کرنا اور تکلیف اٹھانا؛ اس کی قدر و قیمت ہمارے دل سے ختم ہو جائے گی کہ اپنی غرض کے واسطے میرے ساتھ یہ معاملہ ہے؟ میرے ساتھ محبت نہیں ہے یہ تو اپنا کام مجھ سے نکلوانا چاہتا ہے، چنانچہ آپ اگر اس کی شرما حضوری اور لحاظ میں اس کے سامنے کچھ نہ کہیں لیکن جب کوئی دوسرا آدمی کہے گا کہ حضرت! فلاں آپ سے تو بڑی محبت رکھتا ہے، دیکھئے! آپ کا کیسا اکرام کرتا ہے۔ تو آپ کہیں گے کہ بھئی! جانے بھی دو، دراصل اس کی ایک غرض ہے جس کے واسطے وہ یہ سب کر رہا ہے۔ یعنی آپ کی نگاہوں میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔

دیکھئے! اسی ایک عمل کی وہ غرض اور جذبہ جو اس کے پیچھے کارفرما تھا اور جو نیت کام کر رہی تھی وہ دوسری تھی تو آپ نے اس کے ساتھ معاملہ اس کے مطابق کیا، اور یہی عمل اور یہی کام اس کے پیچھے جو غرض کام کر رہی تھی اور جو جذبہ کارفرما تھا وہ دوسرا تھا تو آپ نے اس کے ساتھ دوسرا معاملہ کیا۔ عمل کی ظاہری شکل دونوں جگہ یکساں ہے لیکن آپ دونوں کے ساتھ معاملہ الگ الگ کرتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں بھی ہر عمل کے اندر اسی طرح ہے، ہر عمل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں بھی نیت اور جذبے کو دیکھا جاتا ہے۔

علامہ نوویؒ یہاں ایک آیت پیش فرما رہے ہیں ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللہ

﴿مُخلِصِینَ لَهُ الدِّینَ﴾ ان اہل کتاب کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک حکم تو یہ دیا گیا تھا ان کا حال بیان کر کے ہم کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت خالص اسی کے لئے کرو ﴿حُنَفَآءَ﴾ تمام چیزوں سے ہٹ کر، تمام اغراض سے الگ ہو کر، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر ﴿وَیُقِیمُوا الصَّلوٰۃَ وَیُؤتُوا الزَّکوٰۃَ وَذٰلِکَ دِینُ القَیِّمَةِ﴾ نماز پڑھو تو اس کی خاطر زکوۃ دو تو اس کی خاطر، اللہ تک پہنچانے والا سیدھا راستہ یہی ہے، گویا آپ اپنی دوسری اغراض کو چھوڑ کر جو کچھ کریں اللہ کے واسطے کریں، ظاہری عمل جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کے یہاں اصل نہیں ہے، اصل تو ان اعمال کو اُبھارنے والا جذبہ ہے، آپ کا دل جس غرض اور جذبے کے پیش نظر یہ اعمال وجود میں لا رہا ہے؛ وہ جذبہ اللہ کے یہاں دیکھا جاتا ہے۔

﴿عمل کی قدر و قیمت نیت کے مطابق طے کی جاتی ہے﴾

اسی لئے علامہ نوویؒ نے دوسری آیت پیش فرمائی ﴿لَن یَّنَالَ اللهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَآئُهَا وَلٰکِن یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنکُمْ﴾ کہ قربانی کے جانور جو قربانی کے دن یا حج کے موقع پر ذبح کئے جاتے ہیں ان جانوروں کا گوشت اور ان کا خون اللہ تک نہیں پہنچتا، خون یہیں رہ جاتا ہے اور گوشت تو تم کھا جاتے ہو لیکن تمہارے دل کے وہ جذبات جن کی بنیاد پر تم نے اللہ کے واسطے یہ قربانی دی ہے؛ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پہنچتے ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی قدر ہے، اصل چیز اللہ تعالیٰ کے یہاں یہی دیکھی جاتی ہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ﴿اِنَّمَا الأَعمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِیٍٔ مَانَوٰی﴾ کہ آدمی کے اعمال کا مدار نیتوں کے اوپر ہے، جیسی نیت ویسا ہی اس کا عمل، جس قسم کی نیت ہوگی عمل کی قدر و قیمت اسی کے مطابق طے کی جائے گی۔

﴿وَاِنَّمَالِکُلِّ امْرِئٍ مَانَوٰی کی تشریح﴾

اور پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں: کہ ہر ایک آدمی کو وہی ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی۔ بعض شراحِ حدیث نے تو دونوں کو ایک ہی مفہوم میں لیا ہے لیکن دوسرے حضرات فرماتے ہیں: ﴿وَاِنَّمَالِکُلِّ امْرِئٍ مَانَوٰی﴾ میں ایک بات اور بتلائی گئی ہے وہ یہ کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ عمل ایک ہوتا ہے، لیکن اس عمل کے پیچھے اگر بیسیوں نیتیں کام کر رہی ہیں تو چونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان نیتوں پر معاملہ کیا جاتا ہے اس لئے عمل کے ایک ہونے کے باوجود ان کئی نیتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ کو اُنہیں نیتوں کے مطابق بے شمار ثواب اور اجر دیا جائے گا۔

علامہ نواب قطب الدین دہلویؒ نے مظاہرِ حق میں اس کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ ایک آدمی مسجد آتا ہے، تو مسجد آنے کا مطلب ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے، اب وہ نیت کرے کہ مسجد میں جاؤں گا، اللہ کے گھر میں حاضری ہوگی اور وہاں اعتکاف کروں گا، یہ بھی نیت کرلے کہ وہاں کوئی دین کی بات سننے کو ملے گی۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ ملاقات ہوگی تو سلام کریں گے، خیریت پوچھیں گے، ان کو محبت کی نظر سے دیکھیں گے، یہ بھی نیت کرلے کہ کوئی بیمار مل گیا تو اس کی عیادت کا موقعہ مل جائے گا، تو جتنی نیتیں آپ کرسکیں؛ کرلیں۔ آپ گھر سے مسجد میں آئے یہ ایک عمل ہے، لیکن اس ایک عمل کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے دل میں جتنی نیتیں ہیں ان نیتوں کے مطابق اجر وثواب ملے گا۔

﴿نیت عمل کی روح ہے﴾

اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب کا مدار عمل پر نہیں ہے، عمل تو ظاہری ڈھانچہ ہے، عمل کی

روح تو وہ نیت، ارادہ اور اخلاص ہے جس کے پیشِ نظر عمل وجود میں لایا جارہا ہے۔ دنیا کی تمام چیزوں میں آپ دیکھتے ہیں کہ اس کا ایک ظاہری ڈھانچہ اور ظاہری شکل وصورت ہوتی ہے، اور ایک اس کی اندرونی روح ہوتی ہے، جیسے پنکھا چل رہا ہے، اس کے ہاتھے لگے ہوئے ہیں اور اندر مشین لگا ہوا ہے، سب کچھ ٹھیک ہے، لیکن اس کی روح بجلی ہے، بجلی نہ ہو تو وہ بیکار ہے، پنکھا نہیں چلے گا۔ اسی طرح ہر چیز کے اندر اس کی ایک ظاہری شکل وصورت ہوتی ہے، ایک اندرونی روح ہوتی ہے، جب تک یہ روح ہے تب تک اس کی قدر و قیمت ہے، روح نہیں ہے تو معاملہ ختم ہوجاتا ہے۔ انسان جیسا انسان؛ کائنات کے اندر اس سے بڑی اور کون سی چیز ہوسکتی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو ساری کائنات کے اندر سب سے اشرف اور سب سے افضل بنایا اس کا حال بھی یہ ہے کہ اگر اس کی روح قبض ہوجائے تو اس جسم کو لوگ دو دن کے لئے بھی گھر میں نہیں رکھیں گے، اولاد کو ابا کے ساتھ بہت محبت ہے، بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ بہت محبت ہے، بھائیوں کو اپنے بھائی کے ساتھ بہت محبت ہے، لیکن انتقال کے بعد اس جسم کو کوئی رکھنے کے لئے تیار نہیں، اور نہ جسم رکھنے کے قابل ہے، روح نکل گئی تو اب لوگ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ جلدی سے جلدی اس کو دفن کردو، اگر رہنے دوگے تو سڑ جائے گا، بدبو ہوگی اور نفرت پیدا ہوگی اور دلوں میں محبت کے جو جذبات ہیں اس میں بھی تبدیلی آجائے گی۔ تو روحِ حیوانی تھی تب تک اس کی قدر تھی، آؤ بھگت تھی اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا، وہ نہیں رہی تو اس ظاہری جسم کی کوئی قدر نہیں۔ ہر عمل کا یہی حال ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کی نیت، جذبہ اور وہ اخلاص جس کے پیشِ نظر عمل وجود میں لایا جاتا ہے وہ اس کی روح ہے۔ اسی لئے لکھا ہے کہ بڑے سے

بڑا عمل؛ اگر اس میں یہ روح نہیں ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

﴿بدنیتی کا وبال﴾

بلکہ ہوسکتا ہے کہ یہ عمل اپنی ظاہری شکل وصورت اور ظاہری اعتبار سے خوبی کے باوجود آپ کے لئے عذاب کا سبب بن جائے، احادیث میں قصے آتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز سب سے پہلے حساب وکتاب کے لئے تین آدمیوں کو بلایا جائے گا ان میں ایک تو شہید ہوگا، دوسرا قاری وعالم ہوگا اور تیسرا سخی ہوگا، اللہ تعالیٰ شہید سے پوچھیں گے کہ بھئی! کیوں؟ ہم نے آپ کو قوت عطا فرمائی تھی، جسمانی صحت عطا فرمائی تھی، ہماری اس نعمت کی کیا قدر کی؟ وہ جواب میں کہے گا: باری تعالیٰ! تیرے دین کے کلمے کو بلند کرنے کے واسطے میں نے بڑی محنتیں اور مشقتیں اٹھائیں یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا کہ اپنی جان تک دے ڈالی، اپنے آپ کو قربان کردیا۔ باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا: یہ سب جو کچھ تو نے کیا تھا ﴿لیقال انہٗ شجاع﴾ یہ تو اس لئے کیا تھا کہ لوگ باتیں کریں کہ بڑا بہادر ہے۔ آپ اندازہ لگایئے کہ دنیا میں جان دینے سے بڑھ کر اور کونسا عمل ہوسکتا ہے؟ لیکن وہ دی ہوئی جان بھی جبکہ نیت ٹھیک نہیں تھی تو کام نہیں آئی۔ باری تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیں گے: جاؤ! اس کو گھسیٹ کر جہنم میں لے جاؤ۔ یعنی اس نیت کے درست نہ ہونے پر اتنا ہی ہوتا کہ اُس عمل پر کوئی ثواب نہیں ملتا؛ تب بھی غنیمت تھا۔ یہاں تو اس عمل پر جہنم میں بھیجا جارہا ہے۔

یہی حال سخی کا ہے سخاوت کے دروازے کھلے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے مال کی

نعمت عطا فرمائی تھی باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا جائے گا: ہم نے تمہیں دولت عطا فرمائی تھی اس کا کیا کیا؟ جواب دے گا: باری تعالیٰ! تیری دی ہوئی اس دولت کو میں نے نیکی کے کاموں میں جہاں آپ نے خرچ کرنے کے لئے کہا تھا، مثلاً مسجد میں، مدرسہ میں، فلاں فلاں اور فلاں، کوئی ایسی جگہ نہیں چھوڑی جہاں خرچ کرنا نیکی کا کام بتلایا ہو، اور آپ کی طرف سے اس کی تاکید ہو اور میں نے خرچ نہ کیا ہو۔ باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا: یہ سب تو نے اس لئے کیا تھا تاکہ کہا جائے کہ بڑا سخی ہے، فرشتوں کو کہیں گے، لیجاؤ۔ مال خرچ کرنے سے بڑی چیز اور کونسی ہوگی لیکن وہاں بھی یہ حال ہے۔

ایک عالم اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم کو پھیلا رہا ہے باری تعالیٰ کی طرف سے اس سے پوچھا جائے گا: ہم نے علم دیا تھا؛ کیا کیا؟ وہ کہے گا: باری تعالیٰ! پڑھا پڑھایا اور اس کی خوب ترویج اور اشاعت کی اور لوگوں کو خوب سکھایا، دین کے قریب کیا، دعوتیں دیں۔ باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا: ﴿لیقال انک قارئ﴾ یہ اس لئے تھا کہ لوگ کہیں بڑا عالم اور بڑا قاری ہے۔ (مشکوٰۃ ۳۳ کتاب العلم فصل ثانی بحوالۂ مسلم)

تو دیکھئے! یہاں یہ کوئی دنیوی عمل نہیں ہیں بلکہ دینی عمل ہیں، اور اس وقت دنیا میں اونچے سے اونچے جو اعمال ہو سکتے ہیں؛ ان میں سے ہیں، لیکن نیت درست نہیں تھی اور جذبہ صحیح نہیں تھا اس لئے اس عمل کے اوپر بجائے اس کے کہ ثواب ملتا اور جنت کا فیصلہ ہوتا، جہنم کا فیصلہ کر دیا گیا۔ عمل ہے، ظاہری شکل وصورت ہے، سب کچھ ہے لیکن اندر کا معاملہ خراب تھا اس لئے اس کو بجائے ثواب ملنے کے سزا ہوئی۔

اچھی نیت بغیر عمل کے بھی باعثِ ثواب ہے

اس کے برعکس اگر عمل نہیں ہے اور نیت ہے، تو بہت سی مرتبہ عمل نہ ہونے کے باوجود نیت کے اوپر ثواب ملتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے گھر سے نکلا، اس کو معلوم ہے کہ یہاں مسجد ابرار میں عشاء کی جماعت ۸/۳۵ کو ہوتی ہے، حالانکہ گذشتہ کل سے وقت ۸/۲۰ ہو گیا ہے، اب وہ تو ۸/۳۵ کے حساب سے گھر سے نکلا، یہاں آکر کے دیکھا تو امام صاحب سلام پھیر چکے تھے۔ لیکن احادیث کے اندر ہے نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: کہ اس کو جماعت کا ثواب مل گیا، اس لئے کہ وہ تو یہی سمجھے ہوئے تھا کہ جماعت کا یہ وقت ہے اور اسی کے مطابق اس نے تیاری کی، اور اسی ارادے سے آیا اب وہ موقع نہ پاسکا تو کوئی حرج کی بات نہیں، نیت تھی اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اسی نیت کے اوپر اس کو ثواب مل جائے گا۔

یہ تو ایک عمل ہوا۔ بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ ایک آدمی دوسرے مالدار آدمی کو دیکھ رہا ہے کہ اللہ کے راستے میں خوب خرچ کر رہا ہے اور یہ اپنے دل میں یوں سوچ رہا ہے کہ اگر اللہ نے مجھے بھی دولت عطا فرمائی ہوتی، اور یہ نعمت اللہ نے مجھے بھی دی ہوتی تو میں بھی اسی طرح نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا جس طرح یہ خرچ کر رہا ہے تو حدیث میں ہے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کو بھی ویسا ہی ثواب ملے گا جیسا خرچ کرنے والے کو مل رہا ہے۔

اس کے برعکس ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مال دے رکھا ہے، اور وہ اس کو غلط کاموں میں خرچ کر رہا ہے، اب ایک آدمی یوں سوچ رہا ہے کہ اوہو! میرے پاس بھی اگر

مال ہوتا تو خوب گل چھرے اڑاتا اور خوب مزے لیتا اور خوب گناہ کے کام کرتا، یوں لاتا، ٹی-وی لاتا، اور فلاں فلاں کام کرتا، حالانکہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، گھر پر ٹی-وی نہیں ہے اور پیسہ بھی نہیں ہے، لیکن دل میں یہ ارادے ہیں تو اس کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا دیکھئے! عمل نہیں ہے، صرف نیت ہے۔ تو نیت کے مطابق یہاں معاملہ ہے۔

اور عمل کے بغیر صرف نیت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاملہ ہوتا ہے۔ اس مضمون کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو فضائلِ صدقات میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمائی ہے۔ حضرت کبشہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ تین چیزیں میں قسم کھا کر بیان کرتا ہوں اور اس کے بعد ایک بات خاص طور سے تمہیں بتاؤں گا اس کو اچھی طرح محفوظ رکھنا۔ وہ تین باتیں جن پر قسم کھاتا ہوں ان میں سے اول یہ ہے کہ کسی بندے کا مال صدقہ کرنے سے کم نہیں ہوتا۔ اور دوسری یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے اور وہ اس پر صبر کرے تو حق تعالیٰ شانہ اس صبر کی وجہ سے اس کی عزت بڑھاتے ہیں۔ اور تیسری یہ ہے کہ جو شخص لوگوں سے مانگنے کا دروازہ کھولے گا حق تعالیٰ شانہ اس پر فقر کا دروازہ کھولتے ہیں۔ ان تین کے بعد ایک بات تمہیں بتاتا ہوں اس کو محفوظ رکھو، وہ یہ ہے کہ دنیا میں چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہ نے علم بھی عطا فرمایا اور مال بھی عطا فرمایا، وہ اپنے علم کی وجہ سے اپنے مال میں اللہ سے ڈرتا ہے کہ اس کی خلافِ مرضی خرچ نہیں کرتا بلکہ صلہ رحمی کرتا ہے اور اللہ کے لئے اس مال میں نیک عمل کرتا ہے اس کے حقوق ادا کرتا ہے یہ شخص سب سے اونچے درجوں میں ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کو حق تعالیٰ شانہ نے علم عطا فرمایا اور مال نہیں دیا اس کی نیت سچی ہے، وہ تمنا کرتا ہے کہ اگر میرے

پاس مال ہوتا تو میں بھی فلاں کی طرح سے نیک کاموں میں خرچ کرتا تو حق تعالیٰ شانہ اس کی نیت کی وجہ سے اس کو بھی وہی ثواب دیتا ہے جو پہلے کا ہے اور دونوں ثواب میں برابر ہو جاتے ہیں۔ تیسرے وہ شخص ہے جس کو حق تعالیٰ شانہ نے مال عطا کیا مگر علم نہیں دیا وہ اپنے مال میں گڑبڑ کرتا ہے، بے محل لہو ولعب میں خرچ کرتا ہے، نہ اس مال میں اللہ کا خوف کرتا ہے، نہ صلہ رحمی کرتا ہے، نہ حق کے موافق خرچ کرتا ہے؛ یہ شخص قیامت میں خبیث ترین درجے میں ہوگا۔ چوتھا وہ شخص ہے جس کو حق تعالیٰ شانہ نے نہ مال عطا کیا، نہ علم دیا، وہ تمنا کرتا ہے کہ اگر میرے پاس مال موجود ہو تو میں بھی فلاں یعنی تیسرے کی طرح خرچ کروں تو اس کو اس کی نیت کا گناہ ہوگا اور وبال میں یہ اور تیسرا برابر ہو جائیں گے۔

(فضائل صدقات۔ص ۷۰۔مشکوۃ بروایت ترمذی۔ج ۲ص ۵۸)

عادات کو عبادات بنانے کا نسخہ

اور یہ باتیں تو تھیں ان چیزوں کی جو گناہ کے یا نیکی کے کام ہیں۔ بلکہ یہ نیت تو ایک ایسا عجیب وغریب نسخہ ہے کہ وہ کام جن کو ہم اپنی ضرورت کی وجہ سے انجام دیتے ہیں مثلاً ہماری طبعی ضرورتیں جو اللہ تعالیٰ نے ایک انسان اور جاندار ہونے کی حیثیت سے ہمیں عطا فرما رکھی ہیں کہ جب تک کھانا نہ کھائیں ہم زندہ نہیں رہ سکتے، بھوک کا تقاضہ ہوتا ہے؛ کھانا ہی پڑتا ہے۔ پیاس کا تقاضہ ہوتا ہے؛ پانی پینا ہی پڑتا ہے۔ آرام کا تقاضہ ہوتا ہے؛ نیند کچھ نہ کچھ تو لینی ہی پڑتی ہے۔ قضائے حاجت کا تقاضہ ہوتا ہے؛ استنجاء خانے اور بیت الخلاء میں، پیشاب خانے میں جانا ہی پڑتا ہے۔ یہ طبعی امور جو ہم انجام دیتے ہیں، کھانا، پینا، سونا، قضائے حاجت کے لئے جانا، حالاں کہ یہ تو ہمارے اپنے کام ہیں، اپنی

زندگی بسر کرنے کے واسطے اوراپنے آپ کوزندہ رکھنے کے لئے طبعی طور پران امور کوانجام دیناہے لیکن اگرکوئی اللہ کا بندہ اپنی نیتوں کودرست کرلے اوران کاموں کوبھی صرف اس لئے نہیں کہ اپنی زندگی برقرار رکھنی ہے بلکہ کچھ اورنیتِ خیراس کے اندر شامل کرلے،کوئی اچھاارادہ ساتھ میں ملالے؛ تویہی کام اس کے لئے عبادت بن جائیں گے۔

﴿ایک قصہ سے اس کی توضیح﴾

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے اپنے والد صاحب کے حوالہ سے فضائل صدقات میں ایک واقعہ لکھاہے جولوگ فضائل صدقات سنتے ہیں انہوں نے سناہوگا: ایک آدمی پانی پت کے اندر رہتا تھا اس کے خلاف کوئی قتل کا مقدمہ تھا،اس زمانے میں پانی پت کی تحصیل کرنال تھی اورسب کام انجام دینے کے لئے لوگوں کوکرنال جانا پڑتا تھا۔حضرت فرماتے ہیں کہ معلوم نہیں اب تو کیاہے اس وقت کرنال اور پانی پت کے درمیان دریائے جمنا بہتا تھا،اوردریائے جمنا کا حال یہ تھا کہ بارش کے زمانے میں توخوب پانی ہوتا تھا،گرمی کے زمانے میں معمولی ساپانی رہ جاتا تھا کہ آدمی ویسے بھی نکل جاوے،جہاں پانی زیادہ رہتا تھا وہاں کشتی ہوتی تھی،ایک آدھ پیسہ دے کروہ کنارہ کروس (cross) کرلیتا۔فرماتے ہیں کہ اس آدمی کے خلاف قتل کا مقدمہ تھا،تاریخ پڑی ہوئی تھی،جب تاریخ آئی توایساوقت تھا کہ دریامیں خوب پانی تھا،اورجب طغیانی ہوتی توپھرکشتیاں بھی بند ہوجاتی تھیں اس لئے کہ اس صورت میں وہ کشتیاں چونکہ بادبانی ہوتی تھیں،الٹ جانے کاڈررہتا تھا توکشتی والے بھی اپنی کشتیاں چلانے کاسلسلہ بندکردیتے تھے،اب اتفاق کی بات کہ اس کی مقدمہ کی جوتاریخ آئی اس روزوہ دریائے جمنا کے کنارے آیا،دیکھا کہ دریا طغیانی پرہے،وہاں

کوئی کشتی نہیں تھی، آسانی سے جانا ناممکن تھا، بڑا پریشان ہوا اور کشتی والوں کے پاس گیا اور منھ مانگے دام ادا کرنے کی پیش کش بھی کی کہ جتنے پیسے مانگو گے، میں دینے کے لئے تیار ہوں، مہربانی کرو اور چلو۔ اگر آج میں نہیں جاؤں گا تو میرے خلاف ڈگری ہو جائے گی اور پھانسی کا حکم ہو جائے گا، میرے خلاف قتل کا مقدمہ ہے۔ وہ کشتی والے کہتے تھے: بھائی! تیرے خلاف قتل کا مقدمہ ہے لیکن ہم کشتی لے کر گئے اور کشتی الٹ گئی تو تیری خاطر ہم سب جائیں گے، ہم اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ آدمی بہت پاؤں پڑا، بہت گڑگڑایا لیکن کوئی تیار نہیں ہوا، اس کی اس پریشانی کو ایک آدمی نے دیکھا تو اس سے کہا: دیکھ! تجھے ایک علاج بتلاتا ہوں، میرا نام مت لینا، اسی دریا کے کنارے کے اوپر ذرا دور فلانی جگہ پر ایک جھونپڑا ہے، وہاں ایک بزرگ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں، ان کے پاس جاکر اپنی یہ بات اور پریشانی رکھ، ہوسکتا ہے کوئی راستہ نکل آوے۔ اور دیکھنا وہ ڈانٹیں گے اور بھگانے کی کوشش کریں گے لیکن وہاں سے ہٹنا مت، ماریں تو مار کھالینا لیکن جب تک اپنا کام نہ ہو وہاں سے نہ ہٹنا۔ خیر! وہ گیا۔ عربی میں کہاوت ہے: ﴿صَاحِبُ الْغَرْضِ مَجْنُوْنٌ﴾ غرض مند آدمی پاگل ہوتا ہے، وہ کسی کی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا خواہ کوئی کتنا ہی سمجھائے۔ یہ وہاں پہنچ گیا اور بزرگ سے کہا: حضرت! یہ صورت حال ہے، کوئی راستہ نکالیے، انھوں نے کہا: بھئی! میرے پاس کیوں آیا؟ میں ایک دنیادار آدمی ہوں، اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہاں رہتا ہوں۔ وہ کہنے لگا: نہیں حضرت! دعا کیجیے، کوئی راہ نکالیے۔ انھوں نے کہا: میں کوئی خدا ہوں کہ میرے پاس آیا ہے؟ بہت ڈانٹا ڈپٹا، لیکن اس نے تو وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لیا۔ کہنے لگا: جاؤں گا ہی نہیں، یہیں رہوں گا۔ انھوں نے

بھی دیکھا کہ اب تو یہ پیچھا چھوڑے؛ ایسا ہے نہیں۔ مجبوراً انھوں نے یوں کہا: اچھا! ایک کام کر۔ جا! دریا کو جا کر یوں کہنا کہ اس آدمی نے بھیجا ہے جس نے کبھی کھانا نہیں کھایا اور جو کبھی اپنی بیوی کے پاس نہیں گیا؛ مجھے راستہ دے۔ چنانچہ اس نے جا کر دریا کو یہ بات کہی اور اس کو راستہ مل گیا اور آسانی کے ساتھ پار ہو گیا۔

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ اس موقع پر تحریر فرماتے ہیں کہ بھئی! یہ اللہ والے جو ہوتے ہیں ان کی بیویاں بھی ''ڈیڑھ خصم'' ہوتی ہیں، کیونکہ وہ پٹائی وٹائی تو کرتے نہیں اور حقوق کا خیال رکھتے ہیں۔ اور عورتوں کا معاملہ ایسا ہے کہ جو آدمی حقوق کا خیال رکھنے والا ہو تو پھر وہ اس کے سر چڑھ جاتی ہیں۔ ویسے بھی ایک حدیث کے الفاظ ہیں ﴿یغلبھن اللئام ویغلبن الکرام﴾ جو شریف لوگ ہوتے ہیں ان پر یہ غالب آجاتی ہیں اور جو غیر شریف لوگ ہوتے ہیں؛ وہ ان پر غالب آتے ہیں۔ اور آج کل تو مَیں سمجھتا ہوں کہ سب ہی شریف ہیں۔

بہر حال! اس کے جانے کے بعد بیوی نے جھگڑا شروع کیا کہ آپ نے تو مجھے بدنام کر دیا اور ساری دنیا کے اندر رسوا کر دیا، لوگ مجھے زانیہ کہیں گے، اور یوں اور توں۔ اس نے شور مچا دیا۔ انھوں نے کہا: کیا بات ہے، کیوں شور مچا رہی ہو؟ تو اس نے کہا: ابھی آپ نے اس کو کہا تھا نا کہ جس نے کبھی کھانا نہیں کھایا اور جو کبھی اپنی بیوی کے پاس نہیں گیا تو کھانے کا معاملہ تو آپ کا ہے لیکن یہ جو کہا کہ کبھی اپنی بیوی کے پاس نہیں گیا تو یہ جو ستّے کی دھاڑ ہے؛ یہ مَیں کہاں سے لائی؟ اور وہ تو یوں ہی کہے گا کہ دیکھو! بزرگ نے مجھے ایسا کہا تھا۔ پھر لوگ کیا کہیں گے؟ انھوں نے جواب میں یوں کہا: اللہ کی بندی! مَیں نے کب یہ کہا کہ یہ میرے بچے نہیں ہیں، یہ میرے بچے ہیں اور تو میری بیوی ہے۔ اس نے کہا: نہیں نہیں! اب چھوڑو۔ جب اس نے بہت شور مچایا، بہت روئی دھوئی تو بزرگ نے کہا: دیکھ!

ایک بات سن، مَیں نے بچپن میں ایک بزرگ عالم سے یہ بات سنی تھی کہ جو کام اللہ کے لئے کیا جاتا ہے وہ اپنے لئے نہیں ہوتا؛ وہ ثواب اور اجر والا ہوتا ہے اس میں نیکی لکھی جاتی ہے وہ دنیا نہیں ہوتا بلکہ آخرت بن جاتا ہے۔ یہ بات میں نے بچپن سے سن رکھی تھی اس کے بعد سے مَیں نے جب بھی کھانا کھایا؛ اپنا پیٹ بھرنے کی اور لذت حاصل کرنے کی نیت سے نہیں کھایا بلکہ اس لئے کھایا کہ یہ کھانا جو کھاؤں گا اس کے نتیجے میں جو قوت حاصل ہوگی اس سے اللہ کی عبادت کروں گا اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کروں گا۔ اور تیرے ساتھ شادی ہونے کے بعد تیرے ساتھ صحبتیں کیں اور خوب کیں، تجھے بھی معلوم ہے، لیکن مَیں نے اپنی شہوت پوری کرنے کی نیت سے نہیں؛ بلکہ تیرا حق ادا کرنے کی اور اللہ کا حکم بجالانے کی نیت سے کی تھیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بیویوں کے حق ادا کرنے کا جو حکم دے رکھا ہے اس میں یہ بھی ہے، لہٰذا یہ جو کچھ بھی تھا وہ دنیا نہیں تھا آخرت تھا، اپنے لئے نہیں تھا اللہ واسطے تھا، نیکی اور اجر کا کام تھا۔ اس لئے ایسا ہی ہوا۔

ایک اور واقعہ

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے اس موقع پر (حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہم (رحمۃ اللہ تعالیٰ) نے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالیؒ کے جو ملفوظات نقل کئے ہیں اس کے حوالے سے) ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ دو بزرگ تھے، ایک دریا کے اِس کنارے آباد تھے، دوسرے دریا کے دوسرے کنارے آباد تھے، جو اِدھر رہتے تھے وہ بیوی بچوں والے تھے اور جو اُدھر رہتے تھے وہ تنہا (مجرد) تھے، ان بیوی بچوں والے بزرگ نے ایک مرتبہ خوان کے اندر کھانا تیار کرا کر اُن بزرگ کے پاس بھجوایا، اور اپنی بیوی سے کہا: جاؤ! ان

کے پاس پہونچا آؤ۔اب راستہ میں دریا تھا اور وہ پورا بھرا ہوا تھا۔ بیوی نے کہا: جانے کا راستہ تو ہے نہیں، کس طرح جاؤں؟ تو کہا: جاؤ! دریا سے یوں کہنا کہ اگر میرے اور میرے شوہر کے درمیان وہ تعلق رہا ہو جو میاں بیوی کے درمیان ہوا کرتا ہے تو تو مجھے ڈبودے؛ ورنہ راستہ دیدے۔اس نے جب یہ کہا تو اس کو راستہ مل گیا۔ ذرا ذرا سا پانی ٹخنوں تک آئے اتنا رہ گیا۔وہ گئی اوران بزرگ کی خدمت میں وہ خوان پیش کیا۔انھوں نے کھایا اور جتنا کھانا تھا سب چٹ کر گئے۔اب واپس آنے کا وقت آیا تو برتن لے کر اس کو خیال آیا کہ آنے کا وظیفہ تو معلوم ہو گیا تھا لیکن اب جانے کے لئے کیا کروں؟ اس کے چہرے پر کچھ پریشانی کے آثار دیکھ کر ان بزرگ نے پوچھا: کیا بات ہے؟ کہا: ایسا ایسا ہوا تھا، آنے کے لئے تو انھوں نے یہ بتلایا تھا اور مَیں نے یہ جملے کہے تھے تو راستہ مل گیا تھا، اب میں پریشان ہوں کہ کس طرح جاؤں؟ ان بزرگ نے کہا: جا! دریا سے میرا نام لے کر کہنا کہ اس نے ایک لقمہ بھی اس میں سے کھایا ہو تو تو مجھے ڈبودے؛ ورنہ راستہ دے دے۔اس کو راستہ مل گیا، وہ آگئی اوراپنے شوہر سے کہنے لگی کہ میری تو سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔آپ نے جو جملہ کہا، وہ بھی؛ اس لئے کہ آپ کے ساتھ جو میرا تعلق ہے وہ مجھے خوب معلوم ہے۔ اورانھوں نے جو جملہ کہا، وہ بھی؛ اس لئے کہ میرے سامنے تو پورا بھرا ہوا خوانچہ کھا گئے اور پھر کہتے ہیں ایک لقمہ بھی نہیں کھایا۔انھوں نے بھی وہی بات کہی کہ جو کام اللہ کے واسطے کیا جاتا ہے؛ وہ دنیا نہیں آخرت ہوتا ہے۔

﴿حدیث کی گواہی﴾

اس موقع پر حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی میں لکھا ہے اور مجلس میں بھی حضرت

سے بار بار سنا کہ مشکوۃ شریف میں ایک روایت موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر سبحان اللہ پڑھنے پر صدقہ کا ثواب ہے۔ ہر اللہ اکبر پر، ہر الحمدللہ، ہر لا الٰہ الا اللہ پر صدقہ ہے، کسی کو بھلی بات بتلادی وہ بھی صدقہ ہے، اگر کسی کو بری بات سے روک دیا وہ بھی صدقہ ہے، اور اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کی وہ بھی صدقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کہ انھوں نے فوراً نبی کریم ﷺ سے سوال کیا: یارسول اللہ! اگر آدمی اپنی بیوی کے ساتھ اپنی خواہش پوری کرتا ہے؛ تو کیا اس میں بھی اس کو صدقے کا ثواب ملے گا؟ جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا: بتلاؤ! اگر وہ آدمی اپنی خواہش غلط اور حرام جگہ پوری کرتا تو کیا اس کو گناہ نہیں ہوتا؟ کہا: ضرور ہوتا۔ فرمایا: اگر وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس لئے صحبت کر رہا ہے کہ مَیں اپنے آپ کو گناہ سے بچاؤں؛ تو کیا یہ ثواب نہیں ہے؟ (مشکوۃ ص ۱۶۸ باب فضل الصدقۃ فصل اول بحوالۂ مسلم)

نیت ایک پارس ہے

بہر حال! میں یہ بتلانا چاہتا تھا کہ نیت تو ایک پارس ہے۔ پارس کسے کہتے ہیں؟ ایک پتھر ہوتا ہے جسے تانبے پر بھی پھیر دیتے ہیں تو وہ سونا بن جاتا ہے۔ تو نیت ایک ایسا پارس ہے کہ ہمارے لئے جو اعمال طبعی ہیں، کھانا پینا، اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، استنجے کے لئے جانا آنا؛ جو ہم اپنی ضرورت کی وجہ سے کرتے ہیں، یہ سارے اعمال اگر ہم اللہ کے واسطے کریں تو اس حسنِ نیت کی بناء پر وہ عبادت بن جاتے ہیں۔ سوئیں تو اس نیت سے سوئیں کہ ابھی سونے کی وجہ سے طبیعت کے اندر نشاط ہو جائے گا تو میں اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کو مزید چستی اور مزید تندہی کے ساتھ کروں گا۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے سونا بھی عبادت سمجھنا چاہیے۔

﴿حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے عمل سے استدلال﴾

بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا اور ایک ایک علاقے کے کچھ حصے کا کام سپرد کیا، آدھے علاقے کا امیر ایک کو بنایا، دوسرے آدھے علاقہ کا امیر دوسرے کو بنایا، اور دونوں کو تاکید کی کہ اپنے اپنے علاقے کی جانچ کے لئے اور اس کی دیکھ ریکھ کے لئے جب دورہ کرو تو ایک دوسرے سے ملاقات کرلینا۔ چنانچہ دونوں نے ایسا ہی معمول بنالیا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جب دورے پر نکلے اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے علاقے کے قریب سے گزر ہوا تو سوچا کہ چلو! مل لیں۔ وہاں جاکر ان سے ملاقات کی، خیر خیریت لی، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: تم کس طرح قرآن پڑھتے ہو؟ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تو تھوڑا تھوڑا کر کے چوبیس گھنٹے کے مختلف اوقات میں اپنا قرآن کا مقررہ وظیفہ پورا کرلیتا ہوں۔

عام طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک منزل پڑھ لیا کرتے تھے، سات دن میں قرآن پاک پورا کیا کرتے تھے، عموم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ معمول تھا۔

پھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ کا کیا معمول ہے؟ انھوں نے کہا: میں تو ایسا کرتا ہوں کہ رات کے ایک حصے میں سوتا ہوں اور ایک حصہ سونے کے بعد اٹھ جاتا ہوں اور تہجد کی نماز میں میرا جتنا قرآن پڑھنے کا معمول ہے وہ پورا کرلیتا ہوں، اس موقع پر بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿اِنِّیْ أَحْتَسِبُ نَوْمَتِیْ کَمَا أَحْتَسِبُ قَوْمَتِیْ﴾ میں اپنی نیند میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ سے اسی طرح ثواب

کی امید رکھتا ہوں جس طرح نماز کے لئے کھڑے ہونے میں ثواب کی امید رکھتا ہوں۔ آدمی جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تب تو ہر ایک کو توقع ہوتی ہے کہ میرے اس کام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے اجر وثواب ملے گا، لیکن کسی سونے والے کو سونے پر کیا یہ توقع ہوتی ہے کہ اس سونے پر بھی اللہ تعالیٰ مجھے ثواب دیں گے؟ لیکن حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں سونے پر بھی ثواب کی اسی طرح امید رکھتا ہوں جس طرح نماز میں رکھتا ہوں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کا سونا بھی اسی نیت سے ہوا کرتا تھا۔

بھئی! آدمی اگر مسلسل بیدار رہے تو اس کے اعضاء جواب دینے لگتے ہیں، قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں، پھر آگے وہ کسی کام کے قابل نہیں رہتا، اور آدمی جب سولیتا ہے تو پھر اس کے قویٰ دوبارہ چست ہوجاتے ہیں، اس کی طاقت رینیو(**Renew**) ہوجاتی ہے اور وہ پھر دوبارہ کام میں لگ جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام

کہنے کا مطلب یہ تھا کہ نیت کی درستگی اتنی اہم ہے کہ اسی کے اوپر سارے دین کا مدار ہے، جو کام عبادت کے ہیں ان میں تو نیت ہونی ہی چاہیے، اس کے بغیر وہ عبادت بنیں گے ہی نہیں اور ثواب بھی نہیں ملے گا، بلکہ اگر نیت گڑبڑ والی ہوئی تو سزا ملے گی۔ لیکن جو کام عبادت کے علاوہ ہم عادت کے طور پر کرتے ہیں، کھانا، پینا وغیرہ اس میں بھی اگر ہم نیت درست کرلیں گے تو پھر ہمارے اس اخلاص کی وجہ سے اور نیت کی درستگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہم کو ان کاموں پر بھی وہی ثواب عطا فرمائیں گے جو عبادتوں پر عطا فرمایا کرتے ہیں۔ ورنہ جہاں نیت کا اہتمام نہ ہو تو پھر ہماری عبادتیں بھی عادتیں بن جاتی ہیں۔

دیکھئے! نماز جیسی عبادت میں بھی کیا ہوتا ہے؟ مَیں نے اگلی مجلس میں عرض کیا تھا کہ ہماری نمازیں آٹو میٹک (Auto metic) ہوتی ہیں، نیت باندھی، اللہ اکبر کہا وہاں سے لے کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے تک کیا ہوا اس کو پوچھو؟ کہے گا: بس! چار رکعت تو پڑھ لی، سب کچھ پڑھا، ایسا نہیں کہ کچھ نہیں پڑھا۔ لیکن کیا ہوا؛ وہ پتہ نہیں۔ یہاں دیکھئے! نیت حاضر نہ ہونے کی وجہ سے ہماری نماز جیسی عبادت بھی ایک قدرتی عمل بن گیا، ایک عادت اور ایک آٹو میٹک (Auto metic) چیز بن گئی، عبادت کے لئے نیت کو ہر وقت حاضر رکھنا چاہیے۔

علامہ نووی ؒ نے جو باب قائم کیا ہے (بَـابُ اِسْتِـحْضَـارِ النِّيَّةِ) ''نیت کا استحضار'' ہونا چاہیے کہ آدمی جب بھی کوئی کام کرے تو نیت کو پیشِ نظر رکھ کر کرے، تب ہی عبادت کے اندر بھی بات بنے گی، کیونکہ عبادت؛ اسی وقت عبادت کہلائے گی۔ اور عادت کے اندر بھی اگر نیت کا استحضار رہے گا تو پھر اس صورت میں اللہ کے واسطے کرنے کا جذبہ کارفرما ہوگا

﴿نیت کے معاملہ میں ہماری کوتاہیاں﴾

اس درس میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آج کل ہمارے جو کام ہیں ان میں ہمارے اندر کیا کوتاہیاں ہو رہی ہیں؟ کوتاہیوں میں ایک تو یہ ہے کہ ہم میں جو لوگ دین دار کہلاتے ہیں اور عبادتوں کو انجام دیتے ہیں، اپنے اپنے وقت پر پنج وقتہ نمازیں ادا کرتے ہیں روزے رکھتے ہیں، زکوۃ ادا کرتے ہیں، ان کی عبادتیں بھی عادت جیسی بن گئی ہیں یعنی عبادتوں میں نیتوں کا جو استحضار ہونا چاہیے؛ وہ کما حقہ نہیں ہو پاتا، اگرچہ وہاں ریاکاری تو نہیں ہے۔ عام طور پر آدمی جب پنج وقتہ نمازیں ادا کرنے آتا ہے تو کوئی ایسی نیت نہیں

ہوتی، دل میں کوئی ریاکاری کا سوال پیدا نہیں ہوتا، وہ اپنے کو کوئی بزرگ نہیں سمجھتا الاّ شاذ و نادر۔ باقی یہ خرابی ہے کہ نیت کا استحضار نہیں ہوتا۔ ہاں! نوافل کا جہاں معاملہ آتا ہے تو کچھ دوسرے جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم نے اوابین پڑھ لی، اشراق پڑھ لی چاشت پڑھ لی، تہجد پڑھ لی، تلاوتوں کا اہتمام کرلیا تو پھر شیطان دوسری راہ سے آتا ہے۔ ویسے بھی ان کی ادائیگی میں جو جی لگنا چاہیے اور جو استحضار ہونا چاہیے؛ وہ تو ہے نہیں، ساتھ میں پھر ریاکاری، نام و نمود، شہرت کا جذبہ ہوتا ہے کہ لوگ ہم کو بڑا کہیں گے، نیک سمجھیں گے، بزرگ سمجھیں گے، اللہ والا مانیں گے، یہ جذبات بھی آنے لگتے ہیں۔ اسی طرح خرچ کرنا، اللہ کے راستے میں دینا اور دوسرے بڑے بڑے کاموں میں بھی یہ چیزیں آنے لگتی ہیں۔ اور ہماری جو عادتیں ہیں یعنی طبعی امور؛ اس میں تو ان چیزوں کا استحضار ہوتا ہی نہیں۔

﴿استحضارِ نیت حاصل کرنے کا ماثور طریقہ﴾

اب سوال یہ ہے کہ یہ چیز کیسے حاصل ہو؟ تو حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور ﷺ سے ایک موقع پر جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سوال کیا تھا: ﴿مَا الْاِحْسَانُ؟﴾ اللہ کے رسول! احسان کیا چیز ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا: ﴿أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ﴾ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو (مشکوٰۃ ص ۱۱ کتاب الایمان، فصل اول بحوالۂ بخاری و مسلم) کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہو تو کیسی عبادت کرے گا؟ کیسا خلوص، کیسی خوبی اس عمل کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ جیسے کوئی نوکر دیکھ لے کہ اس کا سیٹھ کام کرتے ہوئے اس کو دیکھ رہا ہے تو پھر دیکھو! وہ نوکر کام میں کمی کرتا ہے؟ نہیں! بلکہ بہت عمدہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے، ذرا بھی کمی نہیں کرتا کیونکہ سیٹھ

صاحب دیکھ رہے ہیں۔ اور ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہے ہیں، جان رہے ہیں، اتنا خیال تو حاضر رہنا ہی چاہیے، تو جب نماز پڑھتے وقت بھی ہم نے اس نیت کا استحضار کر لیا کہ میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں یا اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، تو دھیرے دھیرے یہ کیفیت اعمال اور عبادات کے اندر بھی پیدا ہوگی اور جب عبادات کے اندر پیدا ہو جائے گی تو پھر اس کے بعد عادات کے اندر بھی پیدا ہوگی۔

﴿اہل اللہ کے پاس آنا جانا کیوں؟﴾

اسی کے لئے اہل اللہ کے پاس آنا جانا ہوتا ہے، ان کی صحبت میں بیٹھنا ہو، اور ان کی تصانیف کا مطالعہ ہو۔ ان چیزوں کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔ یہ چیزیں سیکھنے کی اور کرنے کی ہیں۔ اگلی مجلس میں بھی میں نے بتلایا تھا کہ ہم ان چیزوں کی طرف سے غافل ہیں۔ آج کل کے اس ماحول میں ہم نے ایسی غفلتیں اختیار کر لی ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ ان چیزوں کی طرف کبھی بھولے سے خیال بھی نہیں جاتا، ہمارے دل میں کبھی بھی یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ یہ چیز بھی ہے، اس کے لئے بھی کچھ محنت کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ کبھی بھی یہ خیال پیدا نہیں ہوتا۔

﴿دعاؤں کا اہتمام بھی ضروری﴾

اس کی بھی کوشش ہونی چاہیے کہ یہ چیز ہمیں حاصل ہو، اگر نہیں ہوتی ہے تو اس کے لئے دعاؤں کا اہتمام ہو۔ بھئی! اگر ہماری دکان نہیں چلتی، فیکٹری کے اوپر کوئی بلا، آفت آ گئی، کوئی رکاوٹ پیدا ہو گئی؛ تو اس کے لئے خود بھی دعائیں کرتے ہیں دوسروں سے بھی کرواتے ہیں اور درخواستیں کرتے ہیں اور جتنی کوشش ہو سکتی ہے؛ وہ کرتے ہیں۔

اسی طرح اس راستے کے لئے بھی خود بھی دعاؤں کا اہتمام ہو، دوسروں سے بھی درخواست ہو اور جتنی کوشش ہم کر سکتے ہوں؛ اس میں ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

بہر حال! یہ جو اخلاصِ عمل ہے یہ بہت اہم ہے، سارے دین کا مدار اس کے اوپر ہے۔

دل کی مثال ٹنکی کی سی ہے

اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے، گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ ٹھیک اور درست ہوتا ہے تو سارا جسم ٹھیک اور درست رہتا ہے، سارے اعمال ٹھیک اور درست ہوتے ہیں، اگر ہمارے قلب کے اندر صلاح آ گئی، ہمارا قلب ٹھیک ہو گیا، ہماری نیتوں کے اندر درستگی آ گئی تو سارے اعمال ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور اگر وہ بگڑ گیا تو اعضاءِ جسم سے جتنے بھی اعمال وجود میں آتے ہیں وہ سارے خراب اور بگڑے ہوئے وجود میں آئیں گے۔ اس لئے کہ جہاں سے عمل نکل رہا ہے، عمل کا سر چشمہ ہی بگڑا ہوا ہے تو پھر وہاں سے جو کچھ بھی آئے گا؛ وہ بگڑا ہوا ہی آئے گا۔ جیسے پانی ٹنکی سے سپلائی ہو رہا ہے اگر وہیں گڑبڑ ہے، وہاں سے پانی زہریلا نکل رہا ہے تو سب جگہ ایسا ہی زہریلا پہنچے گا، اور وہاں اگر اچھا ہے تو دوسری جگہ اچھا ہی پہنچے گا۔

بہر حال! اس کا اہتمام ہونا چاہیے، اس کے لئے کوشش بھی کریں، اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کریں، محنتیں بھی کریں، اور دوسروں سے دعاؤں کی درخواستیں بھی کریں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے

اخلاص
و
استحضارِ نیت

مجلس ۲

﴿اخلاص النیۃ واستحضارھا ٢﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. امابعد.

عن أم المؤمنين أُمّ عبدالله عائشة رضی اللہ عنہا قالت قال رسول الله ﷺ: یَغْزُوْ جَیْشُ الْکَعْبَۃَ. فَاِذَا کَانُوْا بِبَیْدَآءَ مِنَ الْأَرْضِ، یُخْسَفُ بِأَوَّلِھِمْ وَآخِرِھِمْ. قَالَتْ: قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! کَیْفَ یُخْسَفُ بِأَوَّلِھِمْ وَآخِرِھِمْ وَفِیْھِمْ أَسْوَاقُھُمْ وَمَن لَّیْسَ مِنْھُمْ؟ قال: یُخْسَفُ بِأَوَّلِھِمْ وَآخِرِھِمْ، ثُمَّ یُبْعَثُوْنَ عَلٰی نِیَّاتِھِمْ.

یہ باب نیت کے استحضار کا ہے۔ اس کی چند اور روایتیں ہیں۔

﴿حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کنیت﴾

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت مروی ہے۔ ان کی کنیت امِ عبداللہ تھی۔ ابوداؤد شریف کے اندر روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کی ازواج میں سے میری اور جتنی بھی ہم عصر اور برابر کی ہیں ان کی کوئی نہ کوئی کنیت ہے، میری کوئی کنیت نہیں ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اچھا! عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جو تمہارے بھانجہ ہوتے ہیں (حضرت اسماءؓ جو حضرت عائشہؓ کی بہن تھی ان کے صاحبزادے تھے) انہیں کی نسبت سے اپنی کنیت ام عبداللہ رکھ لو۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے

اس روایت میں اسی کی طرف ﴿عن أُم المؤمنين أم عبدالله عائشة رضی اللہ عنہا﴾ کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

﴿لوگ اپنی نیتوں کے مطابق اٹھائے جائیں گے﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک لشکر کعبہ پر حملہ کرنے کے ارادہ سے چلے گا، جب وہ ایک چٹیل اور ہموار میدان کے اندر پہنچے گا جو مکہ مکرمہ کے قریب آس پاس میں واقع ہے، تو وہ سب کے سب زمین کے اندر دھنسا دیئے جائیں گے۔

اس سے کون سا لشکر مراد ہے؟ تو تمام شرّاح نے اس سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی یہ پیشین گوئی ابھی تک عملی طور پر وجود میں نہیں آئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قربِ قیامت میں اس کی نوبت آئے گی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ فرماتے ہیں کہ اس مجمع میں جتنے بھی ہوں گے وہ سب ہی زمین میں دھنسا دیئے جائیں گے تو سب کو کیسے دھنسا دیا جائے گا؟ حالانکہ اس لشکر میں بازار والے بھی ہیں۔

یعنی عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب اس قسم کا لشکر کسی جگہ حملہ کے ارادے سے آگے بڑھتا ہے تو بہت سے لوگ تجارت کی غرض سے ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں، ان لوگوں کی نیت وہ نہیں ہوتی جو لشکر کا مقصد ہوتا ہے، ان کا مقصد تو اپنے کاروبار کو فروغ دینا اور کمانا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ تو کعبۃ اللہ پر چڑھائی کے ارادے سے نہیں نکلے تھے پھر ان کو بھی کیسے دھنسا دیا جائے گا؟ اسی طرح بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جو

راستے میں ساتھ ہو گئے۔ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مجمع جارہا ہوتا ہے یا جلوس نکلتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سڑک کے اوپر جہاں سے وہ جلوس گذرتا ہے تو بہت سے لوگ جو اپنے کام سے جارہے ہوتے ہیں وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے ان کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ان کے ساتھ بھی بہت سے لوگ ایسے ہوں گے، آپ فرماتے ہیں کہ سب ہی دھنسا دیئے جائیں گے۔ جو کعبۃ اللہ پر چڑھائی کے ارادے سے جارہے تھے ان کا دھنسا دیا جانا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن ساتھ ہی ان گذرنے والوں کو کیوں دھنسا دیا جائے گا؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: دنیا میں تو سب کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا، جو لوگ بازار والے تھے، کمانے والے اور بہت سے وہ لوگ جو ایسے ہی ساتھ ہو گئے تھے؛ وہ سب ہی دھنسا دیئے جائیں گے۔ یعنی دنیوی اعتبار سے جو عذاب ان پر بھیجا گیا تھا اس میں تو سب ہی شریک ہوں گے، البتہ قیامت کے روز وہ لوگ اپنی نیتوں کے مطابق اُٹھائے جائیں گے۔

بروں کے ساتھ رہنے کی نحوست

بہر حال! یہاں تو یہ بتلایا جارہا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں معاملہ نیتوں کے مطابق ہوگا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیوی اعتبار سے جب کوئی آدمی ایسے غلط لوگوں کے ساتھ پھنس جاتا ہے تو چاہے اس کا ارادہ اس برائی اور غلط کام کا نہیں ہوتا، لیکن ان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے جو معاملہ قدرت کی طرف سے ان کے ساتھ کیا جاتا ہے؛ وہی معاملہ اس کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے۔ قیامت کے روز چاہے اس کے ساتھ وہ معاملہ نہ ہو۔ اس لئے غلط لوگوں سے اپنے آپ کو بچانے کا بھی آدمی کو اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿جہاد اور نیت باقی ہے﴾

وعن عائشة رضی اللہ عنہا **قالت قال رسول الله**ﷺ: **لَاهِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ. وَإِذَااسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا.**

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: فتحِ مکہ کے بعد مکہ سے مدینہ کی طرف جو ہجرت کی جاتی تھی؛ وہ سلسلہ نہیں رہا۔ نبی کریم ﷺ کے مبارک زمانے میں مکہ مکرمہ کے رہنے والوں میں سے کوئی شخص اگر ایمان لاتا تو نبی کریم ﷺ کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد اس کو بھی اس بات کا مکلّف کیا گیا تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ جائے تب ہی اس کا ایمان کامل سمجھا جائے گا، اس کے لئے ہجرت شرط تھی۔ لیکن یہ حکم اس وقت تک تھا جب کہ مکہ مکرمہ دارالاسلام نہیں بنا تھا جب مکہ فتح ہو گیا اور دارالاسلام بن گیا اب مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے بھی اسلام کے سارے احکام پر عمل کرنا ممکن ہو گیا تو وہ ہجرت والا حکم باقی نہیں رہا۔ پہلے تو اس لئے ہجرت کا حکم دیا گیا تھا کہ مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے اسلام کے احکام پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا اس لئے ان کو پابند بنایا گیا تھا، اب وہ بات نہیں رہی، چونکہ مکہ فتح ہو گیا اور اس پر بھی اسلام ہی کا جھنڈا لہرانے لگا اور اسلامی احکام پر عمل کرنا ممکن ہو گیا تو وہ ہجرت والا حکم جو ضروری تھا، باقی نہیں رہا۔ البتہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: جہاد کا سلسلہ اور عملِ خیر کی نیت باقی ہے۔ یعنی خدا نہ کرے اگر کہیں ایسا موقع آ گیا کہ جہاں پر رہتے ہوئے اسلامی احکام پر عمل کرنا ممکن نہ ہو تو آج بھی یہی حکم ہے کہ وہ اس علاقے کو چھوڑ کر ایسی جگہ پر جائے جہاں پر اسلامی احکام کو بجا لا سکتا ہو۔ تو وہ نیت اور جہاد باقی ہے اور جب تم کو جہاد کے لئے نکالا جائے تو نکلو۔

﴿وہ بھی چاہتے تھے﴾

وعن أبی عبداللہ جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ قال: كُنَّامَعَ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فِیْ غَزَاةٍ فَقَالَ: اِنَّ بِالْمَدِيْنَةِ لَرِجَالاًمَاسِرْتُمْ مَسِيْراً، وَلَاقَطَعْتُمْ وَادِياًاِلَّا كَانُوْامَعَكُمْ، حَبَسَهُمُ الْمَرَضُ. وفی روایة اِلَّاشَرِكُوْكُمْ فِیْ الْأَجْرِ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک غزوہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک تھے تو آپ نے ارشاد فرمایا: کہ مدینہ منورہ میں بعض لوگ ہیں کہ جب تم کوئی مسافت طے کرتے ہو اور جب کسی وادی میں سے گذرتے ہو تو وہ لوگ بھی حکماً تمہارے ساتھ ہی ہوتے ہیں، اجروثواب کے اعتبار سے جتنا تم کو مل رہا ہے، اتنا ہی اجروثواب ان کو بھی مل رہا ہے۔ یعنی یہاں وہ تمہارے ساتھ شریک ہوتے تو جتنا ثواب ملتا، وہاں بیٹھے بیٹھے بھی ان کو مل رہا ہے۔ بیماری نے ان کو وہاں روک دیا ہے یعنی ان کی نیت تھی، وہ بھی چاہتے تھے؛ لیکن بیماری کی وجہ سے نہیں آسکے۔

﴿معذوری کی وجہ سے سابقہ معمولات ادانہ کرسکے تو؟﴾

اس لئے یہ بھی ہے کہ ایک آدمی تندرستی کے زمانے میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا برابر اہتمام کرتا رہا، اب بیماری کی وجہ سے ایسی معذوری آ گئی کہ جماعت میں شرکت نہیں کر پاتا تو اللہ تعالیٰ اس بیماری میں بھی اس کو جماعت کا ثواب عطا فرمائیں گے اسی طرح اور نیکیاں بھی ہیں کہ جن جن اعمالِ خیر کا وہ اہتمام کرتا تھا لیکن کسی عذر کی وجہ سے اب نہیں کر پاتا تو زمانۂ عذر میں اللہ تعالیٰ ان تمام اعمالِ خیر کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

﴿عذر نے ان کو روک رکھا﴾

بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت منقول ہے جس میں تفصیل یہ ہے کہ ہم لوگ غزوۂ تبوک سے واپس لوٹ رہے تھے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے پیچھے مدینہ منورہ میں ایسے لوگ ہیں کہ ہم جب بھی کسی درّے میں سے یا کسی وادی میں گذرے تو وہ ہمارے ساتھ تھے، ان کو عذر نے مدینہ منورہ میں روک رکھا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ ثواب میں تمہارے ساتھ شریک رہے۔

﴿باپ کا صدقہ بیٹے کے پاس آیا﴾

وعن أبی یزید معن بن یزید الأخنس رضی اللہ عنہ وھو وابوہٗ وجدّہٗ صحابیون قال: کَانَ أَبِی یَزِیْدُ أَخْرَجَ دَنَانِیْرَ یَتَصَدَّقُ بِھَا. فَوَضَعَھَا عِنْدَ رَجُلٍ فِی الْمَسْجِدِ، فِجِئْتُ فَأَخَذْتُھَا، فَأَتَیْتُہٗ بِھَا، فَقَالَ: وَاللہِ مَا أِیَّاکَ أَرَدْتُ، فَخَاصَمْتُہٗ اِلیٰ رَسُوْلِ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم۔ فَقَالَ: لَکَ مَا نَوَیْتَ یَا یَزِیْدُ، وَلَکَ مَا أَخَذْتَ یَا مَعَنُ.

حضرت ابو یزید معن بن یزید بن اخنس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت منقول ہے۔ علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ معن بن یزید خود بھی صحابی ہیں، ان کے والد یزید بھی صحابی ہیں اوران کے دادا اخنس بھی صحابی ہیں، گویا تین نسل صحابی ہے۔ خیر! حضرت معن بن یزید فرماتے ہیں: میرے ابا نے کچھ پیسے صدقہ کرنے کے لئے الگ نکالے اور مسجد میں ایک آدمی کے حوالے کئے کہ کسی غریب کو صدقے کی یہ رقم دے دینا، اتفاق یہ ہوا کہ مَیں ہی مسجد پہنچا اور وہ رقم میں نے ہی لے لی اور گھر آیا، اب ابا نے پوچھا: یہ پیسے کہاں سے لائے؟ میں نے کہا: مسجد میں ایک صاحب نے دیئے۔ میرے والد نے کہا: میں نے ان کو

کسی اورغریب کودینے کی نیت سے دیئے تھے،تم ہی لے آئے۔حضرت معنؓ فرماتے ہیں کہ ہمارا باپ بیٹے کا یہ جھگڑا فیصلے کے لئے حضورﷺ کے پاس گیا تو حضورﷺ نے فرمایا: ﴿لَکَ مَانَوَیْتَ یَایَزِیْدُوَلَکَ مَاأَخَذْتَ یَامَعَنُ﴾ میرے ابا سے کہا: اے یزید! تم نے جو نیت کی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کا ثواب تم کو دے دیا اور بیٹے سے کہا: اے معن! تم نے جو لے لیا؛ وہ درست ہے۔

﴿وصیت کے متعلق سوال﴾

وعن أبی اسحاق سعدبن أبی وقاص مالک بن أهیب بن عبدمناف بن زهرة بن کلاب بن مرةبن کعب بن لؤی القرشی الزهریؓأحدالعشرة المشهود لهم بالجنة. قال: جَآءَ نِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَعُوْدُنِیْ عَامَ حَجَّةِالْوِدَا عِ مِنْ وَجَعٍ اِشتَدَّبِیْ. فَقُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ قَدْبَلَغَ بِیْ مِنَ الْوَجعِ مَاتَرٰی. وَأَنَاذُوْمَالٍ وَلَایَرِثُنِیْ اِلَّاابْنَةٌ لِیْ. أَفَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثَیْ مَالِی؟ قَالَ: لَا. قُلْتُ: فَالشَّطْرُیَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟فَقَالَ: لَا. قُلْتُ: فَالثُّلُثُ یَارَسُولَ اللّٰهِ؟قَالَ: اَلثُّلُثُ،وَالثُّلُثُ کَثِیْرٌ. أَوْ کَبِیْرٌ. ،اِنَّکَ اَنْ تَذَرَوَرَثَتَکَ أَغْنِیَآءَ خَیْرٌمِنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً یَتَکَفَّفُوْنَ النَّاسَ وَاِنَّکَ لَنْ تُنفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِی بِهَاوَجْهَ اللّٰهِاِلَّااُجِرْتَ عَلَیْهَاحَتّی مَاتَجْعَلُ فِیْ فِی امْرَأَتِکَ. قَالَ: فَقُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ!أُخَلِّفُ بَعْدَأَصْحَابِی؟ قَالَ: اِنَّکَ لَنْ تُخَلَّفَ فَتَعْمَلَ عَمَلاً تَبْتَغِیْ بِه وَجْهَ اللّٰهِاِلَّاازْدَدْتَ بِه دَرَجَةً وَرِفْعَةً، وَلَعَلَّکَ اَنْ تُخَلَّفَ حَتّٰی یَنْتَفِعَ بِکَ أَقْوَامٌ وَیُضَرَّبِکَ اٰخَرُوْنَ. أَللّٰهُمَّ اَمْضِ لِأَصْحَابِی هِجْرَتَهُمْ وَلَاتَرُدَّهُمْ عَلیٰ أَعْقَابِهِمْ،لٰکِنَّ الْبَائِسُ سَعْدُبْنُ خَوْلَةَ''. یَرْثِی لَهٗ رَسُول اللّٰه ﷺ أَنْ مَاتَ بِمَکَّةَ.

یہ روایت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جو ان دس حضرات میں سے ہیں جن کو دنیا ہی میں ایک ہی مجلس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت سنائی تھی۔ انہیں کو عشرہ مبشرہ کہتے ہیں۔ قبیلۂ بنوزہرہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ حضرت آمنہ کا قبیلہ ہے اس سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ کے ماموں تھے، وہ فرماتے ہیں: حجۃ الوداع کے موقع پر مَیں بیمار ہوا۔ حجۃ الوداع یعنی ۱۰ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرات صحابہ کے ساتھ حج کے لئے تشریف لے گئے تو مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد یہ بہت بیمار ہو گئے اور بیماری نے شدت اختیار کر لی، ان کو اپنے بچنے کی بھی امید نہیں رہی۔ میری اس بیماری کی شدت ہی کے دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لئے تشریف لائے۔ تو میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میری بیماری جس حد تک پہنچ چکی ہے، وہ آپ دیکھ رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس بیماری سے مَیں بچ نہ سکوں گا اور مَیں مالدار آدمی ہوں اور میری ایک ہی بیٹی ہے جو وارث ہے، یعنی اولاد میں ایک ہی بیٹی تھی، ورنہ عصبات میں دوسرے ورثاء تھے (اپنے یہاں گجراتی میں جس کو سیدھی لیٹی کے وارث دار کہتے ہیں؛ اس میں ایک ہی بیٹی تھی) اس لئے انہوں نے حضور سے عرض کیا کہ میں اپنے دو تہائی مال کا صدقہ کر دوں؟ مطلب یہ ہے کہ ایک تہائی بیٹی کے لئے رہے گا جو بہت کافی ہے، اس لئے دو تہائی مال کے صدقہ کرنے کی وصیت کر جاؤں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ اس پر انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آدھے مال کے متعلق صدقہ کی وصیت کر جاؤں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ اس پر پھر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایک تہائی کی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! ایک تہائی صحیح ہے اور وہ بھی بہت زیادہ ہے۔ ویسے ایک تہائی کی اجازت ہے۔

﴿وصیت کتنی نافذ ہوگی؟﴾

اسی لئے مسئلہ ہے کہ کوئی آدمی اگر وصیت کر جائے تو وصیت ایک تہائی میں سے ہی پوری کی جائے گی۔ اگر کسی نے یہ وصیت بھی کی ہو کہ میرا پورا مال فلاں جگہ مسجد، مدرسہ وغیرہ میں دے دیا جائے اور اس کے ورثاء موجود ہیں تو اس کی وصیت کے مطابق پورا مال صدقہ نہیں کیا جائے گا بلکہ صرف ایک تہائی دیا جاوے گا اور ایک تہائی کو بھی حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ﴿والثُّلُثُ کَثِیر﴾ کہ تہائی بھی بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے حنفیہ کے یہاں یہ حکم ہے کہ اگر وصیت کرے تو مستحب یہ ہے کہ پورے تہائی کی وصیت نہ کرے بلکہ تہائی سے کم کی کرے، تاکہ اس کی طرف سے ورثاء کے اوپر ایک احسان ہو۔ اس لئے کہ تہائی سے زیادہ کی وصیت کرتا تو جتنی زیادتی ہے وہ تو معتبر ہونے والی تھی ہی نہیں، اب اس کے اختیار میں ایک تہائی ہی رہ گیا ہے۔ اب اس کے اختیار میں تھا کہ ایک تہائی کی وصیت کر کے ورثاء کے ہاتھ سے اتنی مقدار کو نکال لیتا اور دوسری جگہ خرچ کرنے کے لئے کہتا، لیکن بجائے پورا ایک تہائی نکالنے کے کم نکالتا ہے۔ مثلاً ایک چھٹا حصہ وصیت میں نکالا تو گویا یوں سمجھا جائے گا کہ ایک تہائی کا آدھا بطورِ احسان کے ورثاء کے لئے چھوڑ دیا۔ ویسے اس کو پورے تہائی کو خرچ کرنے کا اختیار تھا، اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک تہائی بھی زیادہ ہے اور حنفیہ کے یہاں یہی مستحب ہے کہ وصیت تہائی سے کم کی کرنا چاہیے۔

﴿وارثوں کو مالدار چھوڑ کر جاؤ﴾

آگے حضور ﷺ نے ایک بات ارشاد فرمائی کہ آپ یوں سمجھتے ہیں کہ ایک بیٹی کے علاوہ اور کوئی میرا وارث نہیں ہے حالانکہ خاندان کے دوسرے لوگ جو عصبات کی فہرست

میں آتے تھے وہ وارث تھے۔ان کی طرف انہوں نے توجہ نہیں کی،اس پر حضور ﷺ فرماتے ہیں:تم اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ کر جاؤ، یہ تمہارے لئے بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تم ان کو غریب چھوڑ کر جاؤ اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔مطلب یہ ہے کہ تمہارے انتقال کے بعد تمہارا یہ مال بطورِ وراثت کے ان کے ہاتھوں میں پہنچے گا اور اس کی وجہ سے وہ مالدار بنیں گے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچ جائیں گے، یہ تمہارے لئے اچھا ہے۔اور جو بھی چیز تم اللہ کو راضی کرنے کے لئے خرچ کروگے اس پر تم کو ثواب ملے گا۔یہاں تو یہ روایت لاکر یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ آدمی اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے جائز جگہوں پر جو بھی خرچ کرے گا اس پر اجر وثواب ملے گا، یہاں تک کہ تم اپنی بیوی کے منہ میں جو لقمہ رکھوگے اس پر بھی اگر تمہاری نیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم پورا ہو، بیوی کا حق ادا ہو اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک ہو؛ تو اس پر بھی اجر وثواب ملے گا۔

طبعی امور کو بھی عبادت بنایا جاسکتا ہے

اسی سے علماء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ جو طبعی امور ہیں یعنی جو کام انسان اپنی طبیعت کے تقاضے کی بناء پر انجام دیتا ہے، جیسے بھوک لگنے پر کھانا کھانا یہ ایک طبعی تقاضہ ہے، پیاس کی وجہ سے پانی پینا ایک طبعی امر ہے، تھکاوٹ کی وجہ سے آرام کے لئے لیٹ جانا اور سو جانا یہ طبعی امر ہے، اسی طریقہ سے بیوی سے اپنی حاجت وشہوت کو پورا کرنا یہ طبعی امر ہے۔ان تمام طبعی امور میں بھی اگر آدمی یہ نیت کرلے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان حقوق کی ادائیگی کا حکم دیا ہے تو وہ اجر وثواب کا مستحق ہے۔یہ ایک عجیب نسخہ ہے جو ہمیں بتلایا گیا کہ اس کے ذریعہ سے ہم اپنے طبعی امور اور طبعی ضروریات کو انجام دے کر ان کو اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ

بنا سکتے ہیں اور ان کو بھی عبادت بنایا جا سکتا ہے، لیکن اس کے لئے احتساب یعنی نیت کا استحضار اور دل میں یہ ارادہ لانا ضروری ہے۔ اور جب تک کہ آدمی اس کی مشق اور پریکٹس نہ کرے وہاں تک یہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔ ورنہ استحضار اگر عبادتوں میں بھی نہیں ہوگا تو جو خالص عبادتیں ہیں وہ بھی بغیر نیت کے عبادت نہیں کہلاتی تو پھر یہ طبعی امور بغیر نیت کے عبادت کیسے بنیں گے؟

﴿جس شہر کو اللہ کی نسبت پر چھوڑا؛ وہیں موت آئے؟﴾

﴿فقلتُ یارسول اللہ! أُخلّفُ بعد أصحابی﴾ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے ساتھیوں کے مکہ مکرمہ سے واپس چلے جانے کے بعد میں تو پیچھے رہ جاؤں گا؟ مطلب یہ ہے کہ اس وقت میری بیماری کی جو کیفیت ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ان کے ساتھ نہیں جا سکوں گا بلکہ شاید یہیں میری موت آئے گی۔ گویا ان کو اس پر افسوس تھا کہ واپس مدینہ نہیں پہنچ پاؤں گا۔

حضرات مہاجرین جنہوں نے مکہ مکرمہ کو اللہ کی خاطر چھوڑا تھا ان کو مکہ میں موت آنا ناگوار ہوتا تھا، ان کے حق میں یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا کہ جس شہر کو اللہ کی نسبت پر چھوڑا تھا اُسی شہر میں انتقال ہو اور وہیں دفن ہونے کی نوبت آئے۔ اسی لئے انہوں نے حضور ﷺ سے پوچھا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: تم اس طرح اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ کر مکہ مکرمہ میں موت نہیں پاؤ گے بلکہ تم جب کوئی عمل اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے کرو گے تو اس کے ذریعہ تمہارے درجہ میں اضافہ ہوگا اور امید تو یہ ہے کہ تم اور زندگی پاؤ گے یہاں تک کہ تمہارے ذریعہ سے کچھ لوگوں کو فائدہ پہنچے گا اور کچھ لوگوں کو نقصان پہنچے گا۔

﴿فاتحِ قادسیہ﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جو اسلامی فتوحات ہوئیں تو اہلِ فارس کے ساتھ مقامِ قادسیہ میں جو فیصلہ کن جنگ ہوئی تھی اور جس میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی، اس جنگ میں سپہ سالار سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تھے۔ گویا ان کے ذریعہ اہلِ اسلام کو بہت بڑا فائدہ پہنچا اور اہلِ کفر فارس والوں کو بہت ہی بڑا نقصان پہنچا اسی کی طرف اشارہ ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی تھی، جو صادق آئی۔

اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: اے اللہ! میرے صحابہ اور رفقاء کی ہجرت کو مکمل کر لے یعنی ہجرت کی نسبت پر جس شہر کو چھوڑ کر گئے ہیں وہاں ان کی موت کی نوبت نہ آئے، اور ان کو پیچھے نہ لوٹا۔

﴿بے چارہ سعد بن خولہ﴾

﴿لکن البائس سعدبن خولة﴾ البتہ سعد بن خولہ قابلِ رحم ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے دل سوزی کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں، اس لئے کہ ان کی موت مکہ مکرمہ میں اسی زمانۂ حجۃ الوداع میں واقع ہوئی تھی، ان کے متعلق مختلف باتیں کہی گئی ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ مکہ مکرمہ میں اسلام لائے تھے اور ہجرت کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور مکہ ہی میں وفات ہوئی۔ بعضوں نے کہا کہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ گئے تھے اور غزوۂ بدر میں شریک ہوئے ہیں۔ چنانچہ شرکاءِ بدر میں ان کا نام ہے اور اس کے بعد کسی کام سے مکہ مکرمہ آئے تھے اور وہاں موت واقع ہوئی تھی۔ لیکن صحیح اور راجح قول یہی ہے کہ حجۃ الوداع ہی کے موقع پر مکہ مکرمہ میں ان کی موت واقع ہوئی تھی، اس لئے

حضور اکرم ﷺ ان کے لئے دل سوزی کے الفاظ استعمال فرمارہے ہیں کہ قابلِ رحم ہیں، جس کو ہم اپنی عام بول چال میں بے چارہ کہتے ہیں۔ بائس بمعنی بے چارہ۔

﴿ایک اشکال اوراس کا جواب﴾

اب ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ان کی جو موت ہوئی وہ تو غیر اختیاری چیز تھی، ان کی موت کے اندر ان کے ذاتی ارادے کو دخل نہیں تھا بلکہ بیمار ہوئے اور انتقال کر گئے، تو اب یہ جملہ کیا معنی رکھتا ہے؟

اس کے متعلق حضرت مولانا تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے تکملۂ فتح الملہم میں لکھا ہے کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک تمنا کرتا ہے اور جب وہ تمنا پوری نہیں ہوتی تو اس کو وہ خود بھی غم اور فکر کی چیز سمجھتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کے لئے دل سوزی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی حج کے ارادے سے چلا اور جاتے وقت لوگوں سے یہ کہتے ہوئے گیا کہ میں تو یہ امید لے کر جارہا ہوں کہ مدینہ منورہ میں دفن ہوؤں گا، لیکن بمبئی پہنچا اور اس کا انتقال ہوگیا تو اب لوگ کہتے ہیں کہ بے چارہ! ایک تمنا لے کر گیا تھا لیکن پوری نہیں ہوئی، وہ قابلِ رحم ہے۔ تو دیکھئے! اس کی موت میں اس کے ارادے کو دخل نہیں ہے پھر بھی لوگ اس کے لئے دل سوزی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، اسی طریقہ سے وہ حضراتِ صحابہ جو اللہ کی خاطر مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ ہجرت کر کے گئے تھے، ان میں سے کوئی بھی اپنے ارادے اور اختیار سے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ نہیں آئے لیکن کسی ضرورت سے آنا ہوا اور بیمار ہو کر موت واقع ہوئی تو چونکہ یہ ایک ایسی چیز واقع ہوئی جو ان کی تمنا کے خلاف تھی، وہ یہ چاہا کرتے تھے کہ ہماری موت مکہ مکرمہ میں نہ آوے، جس

شہر کو ہم اللہ کی خاطر چھوڑ چکے ہیں وہاں موت نہ آوے اور وہاں موت آ گئی، اس لئے حضورِ اکرم ﷺ نے اس کو لفظ (البائس) سے تعبیر فرمایا کہ قابلِ رحم ہیں۔ اس سے ان کا گنہ گار ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

﴿اللہ تعالیٰ جسموں اور صورتوں کو نہیں دیکھتے﴾

عن أبی هریرة عبدالرحمن بن صخر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: اِنَّ اللهَ لَا یَنْظُرُ اِلیٰ أَجْسَامِکُمْ وَلَا اِلیٰ صُوَرِکُمْ وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلیٰ قُلُوْبِکُمْ وَأَعْمَالِکُمْ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتے کہ تمہارے جسم کیسے تندرست ہیں، تمہاری صورتیں اور چہرے کیسے خوبصورت ہیں؛ اس کو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ تمہارے دلوں کی نیتوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے جس کا عمل اچھا ہے چاہے اس کی تندرستی کیسی ہی کمزور کیوں نہ ہو اور چاہے اس کا چہرہ کیسا ہی بدصورت کیوں نہ ہو؛ وہ اللہ تعالیٰ کا مقرب ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہے اور جس کے اعمال بُرے ہیں؛ چاہے اس کا چہرہ کیسا ہی حسین کیوں نہ ہو اور تندرستی کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو؛ وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہے۔ لہٰذا اصل تو یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا والے اعمال اختیار کرے

﴿اللہ کے راستہ میں لڑنے والا کون ہوا؟﴾

وعن أبی موسیٰ عبداللہ بن قیس الأشعری رضی اللہ عنہ قال: سُئِلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنِ الرَّجُلِ یُقَاتِلُ شُجَاعَةً وَیُقَاتِلُ حَمِیَّةً وَیُقَاتِلُ رِیَاءً. أَیُّ ذٰلِکَ فِی سَبِیْلِ اللهِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَةُ اللهِ هِیَ الْعُلْیَا فَهُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ.

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی اپنی بہادری اور شجاعت دکھلانے کے لئے جنگ میں لڑتا ہے اور مقابلہ کرتا ہے اور ایک آدمی اپنے قبیلے اور قوم کی حمایت اور طرف داری میں لڑتا ہے اور ایک آدمی ریا اور دکھلاوے کے لئے لڑتا ہے (شجاعت دکھلانے میں شہرت کے لئے تھا اور یہاں دکھلاوے کے لئے ہے، شہرت الگ چیز ہے اور ریا کاری الگ چیز ہے) تو ان میں سے کون سا آدمی اللہ کے راستے میں اللہ کے واسطے لڑنے والا ہوا؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: جو آدمی اس لئے لڑتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ سر بلند ہو، وہ ہے اللہ کے راستے میں لڑنے والا۔ اس نیت سے لڑنے والا اللہ کے راستے میں ہے، باقی دوسری نیتوں سے لڑنے والوں میں کوئی بھی اللہ کے راستے میں نہیں۔

قاتل ومقتول دونوں جہنم میں

وعن أبی بکرۃ نفیع بن حارث الثقفی رضی اللہ عنہ ان النبی ﷺ قال: اِذَا الْتَقَی الْمُسْلِمَانِ بِسَیْفَیْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِی النَّارِ. فقلت: یارسول اللہ! ھٰذَا الْقَاتِلُ فَمَابَالُ الْمَقْتُوْلِ قَالَ: اِنَّهٗ کَانَ حَرِیصًا عَلٰی قَتْلِ صَاحِبِهٖ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب دو مسلمان اپنی تلوار لے کر ایک دوسرے کو مارنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں تو مارنے والا اور جس کو مارا جا رہا ہے؛ دونوں جہنم میں جائیں گے۔ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مارنے والے (قاتل) کا جہنم میں جانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن جو مارا گیا (مقتول) وہ کیوں جہنم میں جائے گا؟ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ بھی

تو اپنے ساتھی کو مارنے کے لئے پورے طور پر تُلا ہوا تھا، وہ تو وار چوک گیا؛ ورنہ اس نے بھی اپنی طرف سے ساتھی کو مارنے میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ معلوم ہوا کہ ایک آدمی کسی برے کام کے لئے اسباب اختیار کرتا ہے، اس کام کا پورا عزم وارادہ ہے اور عزم کے ساتھ ساتھ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آگے بڑھتا ہے لیکن ناکام ہوتا ہے، تو اس صورت میں اس کا گناہ تو اس کو ہوگا ہی۔ یہاں پر بھی ایسا ہی ہوا کہ مرنے والا اسی لئے آگے بڑھا تھا کہ میں اس کو ختم کروں، یہ بات اور رہی کہ مارنے والا کامیاب ہوگیا اور یہ ناکام رہا، ورنہ دل کے ارادے اور نیت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: وہ بھی جہنم میں اور یہ بھی جہنم میں جائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔

اخلاص
و
استحضارِ نیت

﴿ مجلس ۳ ﴾

﴿اخلاص النیۃ واستحضارھا ۳﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْ لَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. امابعد.

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: صَلاۃُ الرَّجُلِ فِیْ جَمَاعَۃٍ تَزِیْدُعَلیٰ صَلَاتِہٖ فِیْ سُوْقِہٖ وَبَیْتِہٖ بِضْعًاوَّعِشْرِیْنَ دَرَجَۃً.

﴿نماز باجماعت کی فضیلت﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: آدمی کا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا؛ اس کا اپنے بازار، دکان میں اور مکان میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں بیس سے اوپر درجات کا ثواب رکھتا ہے۔ لفظ ''بضع'' عربی زبان میں تین (۳) سے لے کر نو (۹) تک کے لئے بولا جاتا ہے۔ دوسری روایتوں سے مختلف تعداد معلوم ہوتی ہے ایک روایت میں پچیس (۲۵) گنا لکھا ہے، اور دوسری روایت میں ستائیس (۲۷) گنا ثواب لکھا ہے ایک آدمی جو گھر پر نماز پڑھے اس میں جو ثواب ملے گا اس کے مقابلے میں مسجد میں جاکر نماز پڑھے گا اس میں اس کو ستائیس (۲۷) گنا ثواب زیادہ ملتا ہے۔

﴿فرشتوں کی آمین کا کیا ہوگا؟﴾

ایک بزرگ امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں

ان کے شاگرد محمد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ نامی ہیں، ان کے متعلق لکھا ہے کہ جماعت کا بہت ہی زیادہ اہتمام کرتے تھے، ایک مرتبہ کسی وجہ سے جماعت چھوٹ گئی تو انھوں نے اس نماز کو ستائیس (۲۷) مرتبہ پڑھا۔ دیکھئے! ان کی نگاہوں میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی کتنی قدر و قیمت تھی۔ جن کا اللہ کے ساتھ جیسا تعلق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی ان کے ساتھ اسی مناسبت سے ہوتا ہے۔ خواب میں دیکھا کہ ایک کہنے والا کہہ رہا ہے ﴿یا ابن سلمة! کیف بتأمین الملآئکة﴾ اے ابن سلمہ! فرشتوں کی آمین کا کیا ہوگا؟

﴿جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے ساتھ مل گئی﴾

اس میں دراصل نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد کی طرف اشارہ ہے، حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جب آدمی جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اور امام سورۂ فاتحہ پوری کرتا ہے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿اِذَاقَالَ الْاِمَامُ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَاالضَّآلِّیْن فَقُوْلُوْا آمین. فَاِنَّ الْاِمَام یَقُوْلُهَا. فَمَنْ وَافَقَ تَأمِینُهُ تَأمِیْنَ الْمَلآئِکَةِغُفِرَلَهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ﴾ کہ جب امام ''غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَاالضَّآلِّیْن'' کہے تو تم بھی آمین کہو، اس لئے کہ امام بھی آمین کہتا ہے اور جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق پڑ گئی اس کے اگلے سارے گناہ معاف کردئے جاتے ہیں۔ یعنی جس وقت امام ''وَلَاالضَّآلِّیْن'' کہے گا اس وقت فرشتے بھی آمین کہیں گے اور آپ بھی آمین کہیں گے تو آپ کی آمین بھی فرشتوں کی آمین کے موافق پڑ جائے گی اور یہ فضیلت حاصل ہوجائے گی۔

بہرحال! ان کو خواب میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا کہ آپ نے ستائیس (۲۷) مرتبہ نماز تو پڑھ لی، لیکن یہ فضیلت کہاں سے حاصل کروگے؟ اس لئے جماعت اپنی جگہ

پر جو اہمیت رکھتی ہے وہ تو ہے ہی، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خیر! جماعت کے ساتھ نماز کا ثواب اپنے گھر یا دکان میں پڑھنے کے مقابلے میں بیس سے زیادہ گنا کا ثواب رکھتا ہے۔

﴿ گھر سے وضو کر کے مسجد جانے کی فضیلت ﴾

اور اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ جب تم میں سے کوئی آدمی وضو کرتا ہے ﴿فأحسن الوضوء﴾ اور اچھی طرح سے وضو کرتا ہے یعنی وضو کے فرائض سنتیں، آداب وغیرہ کی پوری رعایت کرتے ہوئے وضو کرتا ہے، اس کے بعد مسجد میں آتا ہے اور اس کی نیت سوائے نماز کے اور کچھ نہیں ہے۔

بس! یہاں تو اس روایت کے ذریعہ یہی بتلانا ہے کہ خالص نماز کی ادائیگی کیلئے مسجد میں آیا۔ ایسا نہیں تھا کہ آج تو فلاں صاحب سے ملنا ہے اور وہ مسجد ہی میں ملیں گے اس لئے چلو آج ہم بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھ لیں تاکہ ان سے ملاقات ہو جائے، یا مثلاً فلاں کے یہاں جماعت کے بعد نکاح رکھا گیا ہے تو چلیں مسجد میں جا کر نماز پڑھ لیں، اس کے یہاں نکاح نہ ہوتا؛ تو نہ آتا۔

﴿ اخلاصِ عمل پر یہ مقام عطا کیا گیا ﴾

﴿لا یرید الا الصلوٰۃ﴾ نماز ہی کے ارادے سے مسجد میں آیا۔ اور مزید تاکید فرماتے ہیں ﴿لا ینھزہ الا الصلوۃ﴾ کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ہی اس کو آمادہ کر رہا ہے کہ گھر سے نکلے اور مسجد میں جائے۔ نماز کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں، تو حضور ﷺ فرماتے ہیں: وہ جب بھی ایک قدم اٹھاتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے اور اس کا ایک گناہ معاف کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ مسجد میں داخل ہو جائے یعنی گھر سے

مسجد تک آنے میں جتنے قدم ہیں، ہر ہر قدم پر ایک درجہ بلند ہوتا ہے اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے۔ اور جب وہ مسجد میں آ گیا اور ابھی جماعت کھڑی ہونے میں دیر ہے لیکن چونکہ اسی نماز کے انتظار میں بیٹھا ہے اور یہی نماز اس کو مسجد میں روکے ہوئے ہے؛ تو وہ انتظار نماز ہی میں شمار ہوگا۔ یعنی اس نے باقاعدہ نماز کی نیت نہیں باندھی ہے پھر بھی اس کو نماز کا ثواب ملے گا اور فرشتے اس کے لئے مغفرت اور رحمت کی دعا کرتے ہیں جب تک کہ وہ اس طرح بیٹھا رہے جس طرح اس نے نماز پڑھی ہے۔ یعنی نماز کے بعد جب تک وہاں بیٹھا رہے گا فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہیں گے۔ وہ فرشتے کیا دعا کرتے ہیں ﴿اللّٰھم ارحمه اللّٰھم اغفر له﴾ اے اللہ! اس پر رحمت بھیج، اے اللہ! اس کے گناہوں کو معاف فرما ﴿اللّٰھم تب علیه﴾ اے اللہ! تو اس کی توبہ کو قبول فرما، اس کی طرف توجہ فرما۔ فرشتوں کی دعا کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ کسی کو تکلیف نہ پہنچائے اور جب تک کہ اس کا وضو ٹوٹ نہ جائے۔

بہر حال! اس آدمی کا خاص وضو کرکے اور نماز کا اہتمام کرکے اپنے گھر سے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے نکلنا، اس کے اس ارادے اور نیت پر اور اس کے اخلاصِ عمل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو یہ مقام عطا کیا گیا۔

﴿نیکیاں اور برائیاں لکھنے کا الٰہی نظام﴾

وعن أبی العباس عبداللہ عباس رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ ﷺ فیما یروی عن رَبِّهٖ تبَارَکَ وَتعَالیٰ قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّیِّئَاتِ ثُمَّ بَیَّنَ ذٰلِکَ. فَمَنْ ھَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ یَعْمَلْھَا، کَتَبَھَا اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتعَالیٰ عِنْدَهٗ حَسَنَةً کَامِلَةً. وَاِنْ ھَمَّ بِھَا فَعَمِلَھَا کَتَبَھَا اللّٰہُ

عَشْرَ حَسَنَاتٍ اِلیٰ سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ اِلیٰ أَضْعَافٍ کَثِیْرَةٍ. وَاِنْ هَمَّ بِسَیِّئَةٍ فَلَمْ یَعْمَلْهَا کَتَبَهَا اللّٰهُ تَعَالیٰ عِنْدَهٗ حَسَنَةً کَامِلَةً. وَاِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا کَتَبَهَا اللّٰهُ سَیِّئَةً وَاحِدَةً.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ سے نقل فرماتے ہیں یعنی حدیث قدسی ہے۔ اس میں فرمایا: اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھنے کا ایک نظام بنایا ہے، ایک طریقۂ کار اور پالیسی طے کی ہے یعنی نیکیاں اور برائیاں کیسے لکھی جائے گی۔ پھر نبی کریم ﷺ نے وہ طے شدہ پالیسی اور طریقۂ کار بتلایا۔ نیکیوں کے سلسلے میں یہ ہے کہ کسی نے نیک کام کرنے کا ارادہ کیا اور سوچا، لیکن کسی وجہ سے نہیں کیا؛ تب بھی اللہ تعالیٰ اپنے یہاں اس کے لئے پوری ایک نیکی لکھیں گے۔

یہاں ''عِنْدَهٗ'' کا لفظ ہے یعنی اپنے یہاں اس کے لئے نیکی لکھیں گے۔ شارحین نے لکھا ہے کہ لفظ ''عِنْدَهٗ'' اور ''کَامِلَةً'' تاکید کے لئے آیا ہے یعنی پوری نیکی لکھی جائے گی تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ صرف ارادہ تھا اس لئے شاید ثواب میں کمی ہوگی، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ پوری نیکی لکھی جائے گی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نیک کام کا ارادہ کرنا بھی نیکی ہے تو اس پر نیکی لکھی ہی جائے گی۔

اور اگر کسی نے نیک کام کا ارادہ کیا اور پھر اس کو کر بھی لیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے دس نیکیوں سے لے کر سات سو نیکیوں تک اور اس سے بھی کئی گنا زیادہ نیکیاں لکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب کوئی نیکی کا کام کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کم سے کم دس گنا ثواب تو دیا ہی جاتا ہے اور پھر جس کا جیسا اخلاص اور اس کے دل کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جیسا تعلق اور اس عمل کے لئے اس نے جیسی محنت و مشقت برداشت کی ہے، ان سب کے

پیشِ نظر اس کی نیکیوں میں دس سے زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ سات سو اور اس سے بھی زیادہ نیکی ملے۔

﴿ارادہ کیا؛ لیکن گناہ نہیں کیا تو؟﴾

اور اگر کسی نے کوئی گناہ کے کام کا ارادہ کیا لیکن اس گناہ کو نہیں کیا۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ کرنا چاہ رہا تھا لیکن اسباب کے میسر نہ ہونے کی وجہ سے نہیں کیا۔ اور ایک شکل یہ ہے کہ وہ گناہ کا کام اللہ کے ڈر کی وجہ سے نہیں کیا، اس کو خیال آ گیا کہ یہ تو گناہ کا کام ہے، مجھے نہیں کرنا چاہیے، ارادہ تو ہوا تھا، تیاری بھی کر لی تھی لیکن جہاں یہ خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے تو اس سے باز رہا؛ تو اللہ تعالیٰ پوری ایک نیکی لکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا کتنا کرم ہے۔

اور اگر برائی کے کام کا ارادہ کیا اور وہ کر بھی لیا تو اللہ تعالیٰ ایک ہی برائی لکھیں گے دیکھئے! نیکی کے سلسلے میں قاعدہ یہ ہے کہ کم سے کم دس گنا ثواب ملتا ہے اور اس سے زیادہ کی کوئی حد نہیں، جیسا موقع، حالات اور اخلاص ہوگا اس کے مطابق بڑھ جائے گا، جبکہ گناہ کے اندر صرف ایک ہی گناہ لکھا جاتا ہے۔ یہاں تو بتلانا یہی ہے کہ اس کے نیکی کے ارادے پر بھی اللہ تعالیٰ نے نیکی لکھی ہے، معلوم ہوا کہ نیکی کا ارادہ بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔

اب یہاں ایک قصہ بیان فرماتے ہیں کہ تین حضرات کا عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لئے تھا، کوئی دوسری نیت نہیں تھی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی دعا قبول ہوئی۔

﴿تین شخصوں کا غار میں پھنسنا اور کراماتی انداز سے بچ نکلنا﴾

وعن أبی عبدالرحمٰن عبداللہ بن عمر الخطاب رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول:

حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب ﷛ سے منقول ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اگلی امتوں کے تین آدمی سفر کے لئے چلے یہاں تک کہ شب باشی کیلئے ایک غار کے اندر پناہ لی۔بعض روایتوں میں آتا ہے کہ بارش آئی تو پناہ حاصل کرنے کے لئے غار میں داخل ہوئے۔دونوں صورتیں ہوسکتی ہیں، بارش بھی آئی اور رات بھی قریب ہوگی تو رات بھی وہیں گزارنا طے کرلیا، چنانچہ اس غار میں گئے تو پہاڑ کے اوپر سے کوئی پتھر لڑھک کر آیا اوراس نے غار کا جو دہانہ اور دروازہ تھا اس کو پورا بند کردیا، مکمل فٹ ہوگیا، ذرہ برابر بھی جگہ نہیں چھوڑی، اب انہوں نے سوچا کہ باہر آواز بھی نہیں جاسکتی اور یہاں کون بچانے کیلئے آئے گا، اب کیا تدبیر اختیار کی جائے،تو انہوں نے آپس میں کہا: اس چٹان کی وجہ سے آنے والی مصیبت سے کوئی بچا نہیں سکتا؛ سوائے اس کے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے نیک اعمال کے وسیلے سے دعا کریں۔

اللہ کے نیک بندوں کا یا نبی کریم ﷺ کا جو وسیلہ پیش کیا جاتا ہے اس میں بھی دراصل اعمالِ صالحہ ہی کا وسیلہ ہوتا ہے، ان کی شخصیتوں کا نہیں ہوتا۔اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ تعلق رکھنا بھی نیکی ہے یعنی اے اللہ! ہمیں تیرے ان نیک بندوں کے ساتھ جو تعلق ہے تو تیری اس رحمت کے وسیلے سے میں یہ سوال کرتا ہوں۔ نبی کریم ﷺ کا جو وسیلہ اختیار کیا جاتا ہے تو اس میں بھی یہ ہے کہ نبی آخر الزماں اور اللہ کے محبوب کے ساتھ جو محبت اور تعلق ہے، وہ بھی ایک نیکی کا کام ہے تو گویا ایک نیک عمل کا وسیلہ اختیار کیا گیا کہ اے اللہ! تیری اس رحمت کے واسطے سے میں یہ سوال کرتا ہوں۔

﴿بوڑھے ماں باپ کا سعادت مند بیٹا﴾

خیر! ان تینوں نے کہا کہ اپنے اپنے نیک عمل یاد کرو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، چنانچہ ایک آدمی نے دعا شروع کی ﴿اللّٰھم کان لی ابوان شیخان کبیران﴾ اے اللہ! میرے ماں باپ بہت زیادہ بوڑھے تھے اور مَیں صبح یا شام کو ان سے پہلے دودھ نہیں پیتا تھا اور نہ اپنے گھر والوں کو پلاتا تھا اور نہ اپنے مویشیوں کو کچھ کھلاتا تھا، ایک روز بکریاں چرانے کے واسطے گیا تو بکریوں کیلئے چارے کی تلاشی میں دور پہنچ گیا اور شام کو جب لوٹا تو دونوں سو چکے تھے، مَیں نے ان کے لئے دودھ دوہا اور جب لے کر حاضر ہوا تو وہ سوئے ہوئے تھے، مَیں نے ان کو اٹھانا اور ان کی نیند خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا، ایک طرف تو یہ صورتِ حال تھی اور دوسری طرف مَیں نے یہ بھی ناپسند کیا کہ مَیں یا میرے گھر والے ان سے پہلے دودھ پی لیں، یہ بھی مجھے گوارہ نہیں ہوا، اس لئے مَیں اسی حالت میں ان کے پاس دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لے کر انتظار کرتے ہوئے کھڑا رہا کہ وہ جاگیں گے تو مَیں ان کو پلاؤں گا اور میرے بچے میرے پاؤں کے پاس بھوک کی وجہ سے بلبلا رہے تھے لیکن مَیں نے ان کو بھی نہیں پلایا کہ جب تک ماں باپ نہیں پئیں گے وہاں تک ان کو بھی نہیں دوں گا، پوری رات گزر گئی یہاں تک کہ صبح طلوع ہوئی تو وہ بیدار ہوئے اور انہوں نے دودھ پیا، اے اللہ! اگر مَیں نے یہ عمل تیری خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کیا تھا اور تو جانتا ہے تو ہمارے اوپر سے اس چٹان کو کھول دے۔ چنانچہ اس دعا کی وجہ سے وہ چٹان کچھ کھسک گئی، لیکن اتنی نہیں کہ اس میں سے یہ حضرات باہر نکل سکیں۔ پھر بھی باہر کی کچھ ہَوا اور روشنی آنے لگی۔

یہاں تو یہی بتلانا ہے کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کے واسطے جو عمل کیا تھا تو کوئی بہت

بڑا عمل نہیں تھا لیکن اللہ کے لئے کیا گیا تھا تو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے دعا قبول کی اور ان کی جان بچائی۔

﴿پرہیزگار عاشق﴾

﴿وقال الآخر﴾ دوسرے نے دعا شروع کی: اے اللہ! میری ایک چچازاد بہن تھی اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب تھی اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اپنی اس چچازاد بہن سے بہت جم کر محبت کرتا تھا جیسا کہ مرد عورتوں سے کرتے ہیں۔ میں نے اس سے مطالبہ کیا کہ تو مجھے خواہش پوری کرنے دے تو اس نے انکار کیا، یہاں تک کہ ایک سال قحط آیا جس میں وہ محتاج اور ضرورت مند ہوئی، تو وہ میرے پاس آئی اور مجھ سے ضرورت طلب کی کہ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے، میں نے اس کو ایک سو بیس دینار اس شرط پر دئے کہ تو اپنی ذات میرے حوالے کردے، مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع دے، اس نے منظور کرلیا، یہاں تک کہ جب میں اس پر پورے طور پر قابو یافتہ ہوا اور مَیں اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے اس کے سامنے بیٹھا تو اس نے کہا: اللہ سے ڈر اور اس مُہر کو اس کے حق کے بغیر مت توڑ یعنی بغیر نکاح کے یہ حرکت مت کر۔ اس کا یہ جملہ سن کر مَیں اپنی حرکت سے باز آ گیا حالانکہ وہ مجھے بہت زیادہ محبوب تھی اور جو دینار دئے تھے وہ بھی چھوڑ دیئے اور معاف کردیئے۔ اے اللہ! اگر یہ کام میں نے تیری خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کیا تھا؛ تو ہم اس وقت جس مصیبت میں گرفتار ہیں اس کو تو ہم سے دور کردے۔ چنانچہ چٹان کچھ اور کھسکی، لیکن ابھی بھی اتنی نہیں ہٹی تھی کہ جس میں سے ہم نکل سکیں۔

﴿اگر صدیقین کا مقام چاہیے تو؟﴾

اس موقع پر شراح بخاری نے لکھا ہے کہ آدمی کی خواہشات میں سب سے زیادہ غالب خواہش اپنی شرم گاہ کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کو پورا کرنے کے واسطے آدمی بڑے سے بڑا جوکھم اٹھانے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ جو آدمی اللہ کے خاطر اپنی اس خواہش کو قابو میں رکھے گا؛ اللہ تعالیٰ اس کو صدیقین میں لکھتے ہیں۔ [اللہ اکبر]

﴿امانت دار سیٹھ﴾

تیسرے نے کہا: اے اللہ! میں نے کچھ کام کے لئے مزدور طے کئے تھے اور جب کام ہو چکا تو میں نے سب کی مزدوری چکا دی، سوائے ایک آدمی کے کہ وہ اپنی مزدوری لئے بغیر چلا گیا، مزدوری کے طور پر کچھ چاول طے کئے تھے وہ تو بغیر لئے چلا گیا تھا، تو مَیں نے اس کے مزدوری کے چاول کو بویا اور اس کی پیداوار ہوئی، اس کو پھر بویا، اس سے جو آمدنی ہوئی اس سے گائے اور بکریاں خریدیں۔ مطلب یہ ہے کہ جانور خریدے، اور ان کو چرانے کے لئے غلام چرواہا بھی خریدا، یہاں تک کہ اس سے بہت سارے اموال حاصل ہوئے، جس کو آج کی زبان میں کہتے ہیں [Invest] کیا۔ ایک مدت کے بعد وہ میرے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے بندے! میری اجرت اور مزدوری لا۔ مَیں نے اس سے کہا: یہ اونٹ، گائے، بکریاں اور غلام؛ سب تیری مزدوری ہے، یہ سب لے جا۔ اس نے کہا: میرا مذاق مت اڑاؤ، میری مزدوری تو تھوڑے سے چاول تھے اور تم یہ سب بتلا رہے ہو؟ مَیں نے کہا: مَیں مذاق نہیں کرتا بلکہ تیری مزدوری کے جو چاول تھے ان کو بویا اس سے جو پیداوار ہوئی اس کو اسی طرح بڑھاتا رہا، بڑھتے بڑھتے یہ کیفیت ہوئی ہے۔

جب اس نے میری یہ بات سنی تو وہ سب لے گیا ایک چیز بھی نہیں چھوڑی۔ اے اللہ! اگر یہ کام مَیں نے تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا تھا اور تجھے راضی رکھنے کے خاطر ہی کیا تھا؛ تو ہم جس مصیبت میں گرفتار ہیں اس کو دور کردے۔ چنانچہ اس چٹان کا باقی حصہ بھی کھل گیا اور وہ تینوں حضرات باہر نکلے اور ان کی جان بچ گئی۔

دعا قبول کروانے کا ایک عمل

بہرحال! یہاں تو یہ بتلانا مقصود ہے کہ جو عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کیا جاتا ہے چاہے وہ کیسا ہی معمولی سا کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس عمل کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے اور اس عمل کی برکت سے اللہ تعالیٰ دعائیں بھی قبول کرتے ہیں۔

چنانچہ دعا کے آداب میں ایک چیز یہ بھی لکھی گئی ہے کہ آدمی دعا کرتے ہوئے اپنے اعمال میں سے کوئی ایسا عمل جو خالص اللہ کے لئے کیا ہو؛ اس کا بھی واسطہ اور وسیلہ دے سکتا ہے، اس کے صدقہ وطفیل میں اللہ تعالیٰ دعا قبول کرتے ہیں، اگر کوئی ایسا عمل نہ ہو تو دعا سے پہلے کوئی ایسا عمل کرلے اور پھر دعا کرے؛ تب بھی دعا قبول ہوتی ہے۔

۔۔۔۔۔۔دعا۔۔۔۔۔۔۔

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَااِلٰهَ غَیْرُکَ لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰہُ اْلاَحَدُالصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدًا. لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰہُ اْلحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ. اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کُلُّهٗ وَلَکَ الشُّکْرُ کُلُّهٗ وَلَکَ الْمُلْکُ کُلُّهٗ وَاِلَیْکَ یَرْجِعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ اَللّٰھُمَّ لَآاُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلیٰ نَفْسِکَ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ سَیِّدِنَا

وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلیٰٓ اٰلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ صَلٰوۃً تُنَجِّیْنَا بِھَا مِنْ جَمِیْعِ الْاَھْوَالِ وَالْاٰفَاتِ وَتَقْضِیْ لَنَا بِھَا جَمِیْعَ الْحَاجَاتِ وَتُطَھِّرُنَا بِھَا مِنْ جَمِیْعِ السَّیِّئَآتِ وَتَرْفَعُنَا بِھَا عِنْدَکَ اَعْلیٰ الدَّرَجَاتِ وَتُبَلِّغُنَا بِھَآ اَقْصیٰ الْغَایَاتِ مِنْ جَمِیْعِ الْخَیْرَاتِ فِی الْحَیٰوۃِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ اِنَّکَ عَلیٰ کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر.

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، نفس و شیطان کی شرارتوں سے ہماری پورے پوری حفاظت فرما، اے اللہ! ہماری تمام عبادتوں میں اور تمام اعمالِ خیر میں ہم کو اخلاص عطا فرما، نیتوں کی درستگی عطا فرما، اے اللہ! اس کے لئے محنتیں کرنے کی اور اس کی طرف متوجہ ہونے کی ہمیں توفیق عطا فرما، اے اللہ! ان غفلتوں کے نتیجے میں ان چیزوں سے ہم بے پرواہ ہیں، عافیت کے ساتھ ان غفلتوں کو دور فرما کر اس کا احساس عطا فرما کر اس کے لئے کوشش کی توفیق عطا فرما، اور ہمارے لئے اس کو آسان فرما، اے اللہ! ہم تو کمزور ہیں، مجاہدے کی طاقت ہم میں نہیں، اے اللہ! ہم تو مجاہدوں کو برداشت بھی نہیں کر سکتے، اے اللہ! تو تو کریموں کا کریم ہے، تیرے خزانے بھرے ہوئے ہیں اے اللہ! بغیر مجاہدے کے بھی تو عطا فرما سکتا ہے، اے اللہ! ہمیں یہ نعمت محض اپنے فضل وکرم سے عطا فرما، اے اللہ! مجاہدوں والوں کو بھی جب تو دیتا ہے تو اپنے فضل ہی سے عطا فرماتا ہے ورنہ کوئی بھی اپنے مجاہدے سے کسی بھی چیز کا حقدار نہیں بنتا، اے اللہ! ہم تو بلا استحقاق محض تیرے فضل وکرم کے صدقے اس چیز کا تجھ سے سوال کرتے ہیں ہمیں اپنے تمام اعمال میں خلوص اور لِلّٰہیت عطا فرما، نیتوں کی درستگی عطا فرما، اے اللہ! ہمیں حبِ مال اور حبِ جاہ سے حبِ دنیا سے نجات عطا فرما اور ہر عمل تیری ذاتِ عالی کے

واسطے خالص طور پرانجام دینے کی توفیق عطا فرما اے اللہ! نفس وشیطان کی شرارتوں سے ہماری پورے پوری حفاظت فرما، ہر عمل کو صحیح طریقے سے انجام دینے کی توفیق عطا فرما، اے اللہ! تو ہماری، ہمارے والدین کی، ہمارے اہل وعیال کی، ہمارے بھائی بہنوں کی، ہمارے اعزاء واقارب کی، اساتذہ ومشائخ کی، دوست واحباب کی، محسنین ومتعلقین کی، جنہوں نے ہم کو دعاؤں کے لئے کہا یا لکھا، یا جو ہم سے دعاؤں کی توقع اور امید رکھتے ہیں ان کی، اور تمام مؤمنین ومؤمنات، مسلمین ومسلمات پوری امتِ محمدیہ کی مغفرت فرما، اے اللہ! تو ہمارے چھوٹے اور بڑے ظاہر وپوشیدہ اگلے اور پچھلے سارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری سیئات کو حسنات سے مبدّل فرما، اے اللہ! نبی کریم ا کے طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما، اے اللہ! مجلس میں جتنے بھی موجود ہیں سب کی پورے پوری مغفرت فرما کر بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما، اور بھی جن لوگوں نے اپنے بیماروں کی صحت کے لئے دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں اے اللہ! ان تمام کے بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما، اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما، جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما، جن کی اولاد شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہے ان کو صالح جوڑ عطا فرما جن کے لئے شادی کے اسباب نہیں ہیں عافیت کے ساتھ ان کو نکاح کے اسباب مہیا فرما اے اللہ! جو بے اولاد ہیں ان کو اولادِ صالح عطا فرما، جن کی اولاد نافرمان ہے ان کو مطیع وفرمانبردار بنادے جو لوگ نرینہ اولاد کے خواہش مند ہیں ان کو نرینہ اولاد عطا فرما، اے اللہ! جو لوگ جیلوں میں بند ہیں، ایک مدت سے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ٹاڈا کے نام سے گرفتار ہے، اے اللہ! ان

تمام کو عافیت کے ساتھ رہائی نصیب فرما، اے اللہ! محض اپنے فضل سے سب کے لئے رہائی مقدر فرما، اپنا خصوصی فضل فرما، اس امت کے حال پر رحم فرما، اے اللہ! جن لوگوں پر مقدمات ہیں عافیت کے ساتھ ان کو بری فرما دے، اے اللہ! جن کی جو جو حاجتیں ہیں محض اپنے فضل وکرم سے پورا فرما اس مجلس میں جتنے بھی موجود ہیں سب کے دلوں کے بھید سے اور دلوں کے حال سے تو واقف ہے اور تیرے خزانے بھرے ہوئے ہیں اے اللہ! سب کی جائز مرادیں محض اپنے فضل سے پوری فرما، اے اللہ! حضور اکرم ﷺ نے جتنی خیر و بھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہم کو عطا فرما اور حضور اکرم ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہیں اے اللہ! ان سے ہماری حفاظت فرما اے اللہ! ہماری دعاؤں کو محض اپنے فضل وکرم سے قبول فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَصَلیٰ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلیٰ خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ

توبہ
و
تکمیل توبہ
مجلس ۱

اقتباس

توبہ ہی اصل ہے۔ دیکھئے! آدمی جب راہِ سلوک میں قدم رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اہل اللہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرتا ہے؛ تو سب سے پہلے وہ توبہ ہی کراتے ہیں۔ اَوَّلُ اَقْدَامِ المریدین، اہلِ ارادت کا اولین قدم توبہ ہے، بزرگوں کے پاس جب آپ بیعت ہونے کے لئے جاتے ہیں تاکہ ان کی نگرانی میں، ماتحتی میں اور سرپرستی میں اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کریں، چونکہ وہ اس راہ کو طے کئے ہوئے ہیں، اس راہ کے نشیب وفراز سے واقف ہیں۔ ایک آدمی جو راہ چل چکا ہو، اس کے ساتھ نئے لوگ چلنے کی کوشش کرتے ہیں؛ تاکہ ہمارے لئے آسانی رہے۔ لہٰذا ان کی نگرانی اور سرپرستی میں جب سلسلہ شروع کیا جاتا ہے تو سلوک کی سب سے پہلی منزل توبہ ہے۔ جب بیعت کرتے ہیں تو کیا کراتے ہیں؟ توبہ ہی کراتے ہیں کہ اب تک جو گناہ ہوئے ہیں، اس سے توبہ کرو اور آئندہ کے لئے پکا عہد کرو کہ اب میں ان گناہوں کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ یہی تکمیلِ توبہ ہے۔ یہ اولین منزل ہے۔ تو اصل توبہ ہے۔ ہم لوگ ابھی توبہ ہی کو مکمل کئے ہوئے نہیں ہوتے ہیں اور معلوم نہیں کون سے بڑے بڑے مقامات کو حاصل کرنے کی حرص رکھتے ہیں۔ ایں خیال است ومحال است وجنوں والا معاملہ ہے۔

یہ مجلس تاریخ ١٥/ جمادیٰ الاولیٰ ١٤١٧ھ مطابق ٢٨/ ستمبر ١٩٩٦ء کو بمقام مسجدِ ابرار، شالیمار سوسائٹی، سورت میں ہوئی

﴿باب التوبۃ﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. امابعد.

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

وَتُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعاً. وقال تعالیٰ: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحاً.

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا باب توبہ کے سلسلہ میں قائم کیا ہے اس میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ توبہ کے متعلق بیان فرماتے ہیں کہ انسان پر گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے ''گناہ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے؛ ان کو بجا نہ لانا، اور جن چیزوں سے منع فرما رکھا ہے؛ ان کو کر لینا، یہ دونوں چیزیں گناہ کے اندر شمار ہوتی ہیں۔

﴿پورے عالم میں فساد کی وجہ ''گناہ''﴾

ان گناہوں ہی کی وجہ سے پورے عالم کے اندر فساد اور ابتری پھیلی ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر نبی کریم ﷺ تک انبیاء کرام کا جو سلسلہ جاری فرمایا اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ لوگوں کو ان چیزوں سے واقف کیا جائے جن میں

اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہوتی ہے اور ان کو اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے آمادہ کیا جائے، اکسایا جائے۔ اور ان چیزوں سے بھی واقف کیا جائے جس میں اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی ہوتی ہے اور ان سے ان کو روکا جائے۔قرآن پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے اگلی امتوں کے واقعات اور ان کی نافرمانی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جو سزائیں دی گئیں؛ ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

﴿معلم الملائکہ سے شیطان لعین تک﴾

ابلیس لعین کا ایک وقت وہ تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کثرتِ عبادت کے نتیجے میں اس کو اللہ کا اتنا زیادہ قرب اور نزدیکی حاصل تھی کہ فرشتوں کا استاذ اور ان کا سردار بنایا گیا تھا لیکن جب اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے مردود کرکے راندۂ درگاہ بنا کر آسمان سے زمین کی طرف پھینک دیا گیا۔آخر ابلیس کو اس طرح مردود بنانے والی کون سی چیز ہے؟ گناہ ہی تو ہے۔

﴿مختلف قوموں کے مختلف عذاب﴾

قومِ عاد پر اللہ تعالیٰ نے تیز اور تند ہَوا بھیجی جس کے نتیجے میں وہ سب ختم ہوگئے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے ﴿كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ﴾ (سورۂ حاقہ پ۲۹) جیسے تیز ہوا اور آندھی آتی ہے تو درخت تنے سمیت اُکھڑ اُکھڑ کر زمین پر گر جاتے ہیں اس طرح قومِ عاد کے لوگ ہلاک اور برباد ہوئے، پٹخ پٹخ کر ان کو ختم کیا گیا حالانکہ وہ بڑے تنومند قوی اور توانا تھے، ان کو اپنی قوت اور توانائی پر ناز تھا اور قرآن میں بھی ان کی توانائی کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانی اور معصیت کی وجہ سے ہَوا کا عذاب بھیج کر ان کو ختم کر دیا۔

قومِ ثمود کے اوپر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک چیخ اور چنگھاڑ بھیجی ایسی ہیبت ناک آواز جس کی وجہ سے ان کے کلیجے پھٹ گئے اور وہ سب کے سب ہلاک و برباد ہوئے، یہ بھی ان کی نافرمانی اور گناہوں کی وجہ سے ہوا۔ (تفسیر ابن کثیر ۲/۲۲۹ طبع بیروت)

قومِ نوح کی نافرمانی کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر پانی کا عذاب بھیجا، ایک طرف آسمان سے بارش کا سلسلہ اور دوسری طرف زمین کو حکم دیا گیا کہ اپنا پانی باہر نکالو یہاں تک کہ اتنا کثیر پانی ہوا کہ روئے زمین پر اہلِ ایمان کے علاوہ جتنے بھی تھے وہ سب ختم و برباد ہوگئے، خود حضرت نوح علیہ السلام کا صاحبزادہ ایمان نہیں لایا تھا؛ وہ بھی غرقاب ہوگیا۔

(سورۂ ھود۔ پ۱۲)

قومِ شعیب جنھوں نے ناپ تول میں کمی کی تھی اور اللہ کی نافرمانی اور معصیت میں مبتلا ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر آگ کا عذاب بھیجا، سات روز تک اتنی سخت گرمی پڑی کہ تالاب اور ندیوں کا پانی بھاپ بن کر اڑ گیا اور لوگ گرمی کی وجہ سے بے حد بے چین ہوگئے اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک کالا بادل بھیجا جس کو دیکھ کر لوگ یوں سمجھ کر کہ اس میں بارش ہوگی اس کے نیچے جمع ہوئے کہ بارش گرے تو ہم پر گرے اور سکون حاصل ہو، جب سب اس کے نیچے آگئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی بادل میں سے ان پر آگ برسائی گئی جس کے ذریعہ سے ان کو ختم کردیا گیا قرآنِ پاک میں اس کو ﴿عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ کہا گیا ہے ”سائبان والا عذاب“۔ (روح المعانی ۱۹/۱۲۰)

﴿رسول ﷺ کے خوفِ خدا کی کیفیت﴾

اسی لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب بادل دیکھتے تھے تو

بے چین ہو جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے تھے، حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ جب ہَوا چلتی ہے اور بادل آتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں کہ بارش آئے گی اور میں آپ کو دیکھتی ہوں کہ بادل دیکھ کر آپ پر بے چینی کی کیفیات طاری ہو جاتی ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا معلوم؛ بادل کیا لے کر آرہا ہے اسی بادل کے ذریعہ سے ایک قوم پر اللہ تعالیٰ نے آگ کا عذاب برسایا تھا (ترمذی ۲/۱۶۱۔ ابواب التفسیر)

اس لئے اہل اللہ اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام جن کو اللہ تعالیٰ کی خوب معرفت حاصل ہوتی ہے؛ وہ کسی ایک چیز پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھتے بلکہ ڈرتے ہیں۔

قومِ لوط کا عذاب

قومِ لوط پر ان کی نافرمانی اور گناہوں کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا عذاب بھیجا کہ ان کی بستیوں کو آسمان پر اٹھا کر اُلٹا کر پھینک دیا گیا اور اوپر سے ان پر پتھروں کی بارش برسائی گئی، آج بھی جو لوگ اس علاقے میں جاتے ہیں وہاں وہ زمین آج بھی ہے جس میں عبرت کا سامان موجود ہے، کہتے ہیں کہ وہاں مخصوص قسم کے اور خاص انداز کے پتھر آج بھی ہیں۔

عذاب کس چیز کی نحوست تھی؟

تو یہ کاہے کی وجہ سے ہوا؟ ان کی نافرمانی کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو برباد کیا۔ تو یہ جتنی قومیں برباد ہوئیں قرآن پاک میں ان کے واقعات بیان کئے گئے ہیں، قرآن پاک کوئی قصہ کہانی کی کتاب نہیں اور ان کے واقعات بیان کرنے والی ذات کس کی ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ واقعات بیان کئے اور یہ کوئی معمولی

قومیں نہیں تھیں، اپنے اپنے زمانے میں بڑی ترقی یافتہ، بڑی زبردست، بڑی تہذیب یافتہ قومیں تھیں، اورانہوں نے اپنی تہذیب وتمدن میں بڑی بڑی ترقیاں کی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانی اورمعاصی کی وجہ سے عین اس حالت میں کہ وہ اپنے تہذیب وتمدن کی ترقی کے اوجِ کمال پر پہنچے ہوئے تھے؛ان کو ہلاک وبرباد کیا۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ کہ اللہ تعالیٰ ان کے اوپر ظلم نہیں کرتا؛ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ (سورۂ روم پ۲۱) ظاہر ہے کہ گنہگار آدمی گناہ کرکے کسی اور کے اوپر ظلم نہیں کرتا؛ اپنے ہی اوپر ظلم کرتا ہے۔

﴿حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کیوں غمگین تھے؟﴾

[۱] جب قبرص فتح ہواتو جبیر بن نفیرؒ جوایک تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کودیکھا جوجلیل القدر صحابی ہیں کہ وہ ایک کونے میں بیٹھ کررورہے ہیں، میں نے جا کر کہا: حضرت! آج تو خوشی کا دن ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کواور اسلام کوعزت عطافرمائی، فتح مندی اورکامیابی سے نوازا، اور یہ ملک فتح ہوا، یہ خوش ہونے کا وقت ہے۔انہوں نے کہا: ہائے افسوس !اے جبیر! یہ قوم اللہ تعالیٰ کے حکم کوتوڑنے کی وجہ سے اللہ کی نگاہوں میں ذلیل وخوار ہوئی ہے، کل تک یہ لوگ برسرِ اقتدار تھے اوران کے ہاتھ میں حکومت تھی اورآج اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے ذلیل ورسوا ہوگئے۔ یہ تورونے کا وقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی حالت میں مبتلا ہونے سے بچائے۔

[۱] جزیرۂ قبرص ۲۸ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورخلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں فتح ہوا یہ ملک شام کے سمندر میں منفرد مغربی جزیرہ ہے ،دمشق سے ملی ہوئی ایک لمبی پٹی پرواقع ہے، پھلوں اورکانوں کی بہتات والا علاقہ ہے،بہترین شہر ہے۔(البدایہ والنہایہ۷/۱۱۰)۔۱۲۔

﴿گناہ کی نحوست، روزی سے محرومی﴾

حدیث پاک میں ہے مسند احمد میں روایت موجود ہے: ﴿اِنَّ الرَّجُلَ لَیُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ یُصِیْبُهٗ﴾ (۲۸۰/۵، حدیث نمبر ۲۲۴۶۶، راوی حضرت ثوبانؓ، ابن ماجہ ص ۳۳۰ باب العقوبات) آدمی اس گناہ کی وجہ سے جس کا وہ ارتکاب کرتا ہے؛ اپنی روزی سے محروم ہوتا ہے۔

﴿زلزلہ کیوں آتا ہے؟﴾

مسند احمد ہی کی روایت ہے کسی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے سوال کیا: زلزلہ کیوں آتا ہے؟ دھرتی کمپ (ધરતીકંપ) کاہے کو آتا ہے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا: جب لوگ گناہ کو جائز کام سمجھ کر کرنے لگتے ہیں، شرابیں پیتے ہیں اور گانے بجانے کے آلات میں مشغول ہوتے ہیں؛ تو آسمان کے اوپر اللہ تبارک وتعالیٰ کو غیرت آتی ہے اور اللہ تعالیٰ زمین کو حکم دیتے ہیں کہ ان کو ہلا ڈال۔ اس کے نتیجے میں زمین حرکت میں آتی ہے اور ذرا سی دیر میں لوگ اِدھر سے اُدھر ہو جاتے ہیں اور چند سیکنڈوں کے اندر بڑی سے بڑی ہلاکت دنیا میں پھیلتی ہے۔

﴿جب میری نافرمانی کی جاتی ہے﴾

مسند احمد میں ہے کہ حضرت وہب فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے فرمایا: بیشک بندہ جب میری فرمانبرداری کرتا ہے تو میں اس سے خوش ہو جاتا ہوں اور جب میں اس سے خوش ہو جاتا ہوں تو اس کی چیزوں اور اس کے پیچھے رہنے والوں میں برکت ڈال دیتا ہوں اور میری برکت کی کوئی انتہا نہیں ہے، بے حساب دیتا ہوں۔ اور جب میری نافرمانی اور معصیت کی جاتی ہے تو میں غضب ناک ہوتا ہوں اور جب میں غضب ناک

ہوتا ہوں تو لعنت بھیجتا ہوں اور میری لعنت کا اثر سات پشتوں تک رہتا ہے

(الزواجر۔۱/۲۱)

﴿''جزاء الاعمال'' کا مطالعہ ضرور کیجئے﴾

حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے ''جزاء الاعمال''۔ جس میں گناہوں کے نقصان اور نیکیوں کے فوائد بیان کئے ہیں۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ باقاعدہ اس کے مطالعہ کی بڑی تاکید فرماتے تھے اور دوسرے اکابر بھی بڑی تاکید سے اس رسالے کے مطالعہ کی ترغیب دیا کرتے تھے کہ اس کا مطالعہ ضرور کرو، اس میں حضرت نے سرسری طور پر گناہوں کے ستائیس (۲۷) یا اٹھائیس (۲۸) بڑے بڑے نقصانات بتلائے ہیں۔

﴿گناہوں کے نقصانات﴾

ایک تو یہ بتلایا ہے کہ آدمی گناہوں کی وجہ سے علم سے محروم ہو جاتا ہے اور استدلال میں پیش کیا کہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ طلب علم کے لئے حاضر ہوئے، چند دن ان کی خدمت میں رہ کر واپس جانے لگے تو امام مالکؒ نے ان کو تاکید فرمائی کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہارے دل میں علم کا نور ڈالا ہے ﴿فَلَا تُطْفِئْهُ بِالْمَعْصِيَةِ﴾ گناہوں کے ذریعہ سے اس نور کو بجھامت دینا، مٹامت دینا۔ گویا گناہوں کی وجہ سے آدمی علم سے محروم رہتا ہے۔ روزی سے بھی محروم ہوتا ہے، ابھی میں حضور ﷺ کا ارشاد نقل کر چکا کہ معصیت کے ارتکاب کی وجہ سے آدمی روزی سے محروم ہو جاتا ہے اور گناہ کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات

سے اس کو وحشت اور گھبراہٹ ہونے لگتی ہے اور لوگوں سے بھی وحشت ہونے لگتی ہے، خاص کر جو لوگ نیک اور اہل اللہ ہوتے ہیں ان کے پاس جانے سے اس کے دل میں ایک خاص قسم کی وحشت سی پیدا ہوتی ہے، ان کی خدمت میں حاضری سے آدمی جو برکتیں حاصل کرتا ہے وہ اپنے گناہوں کی نحوست کی وجہ سے اس سے بھی محروم رہتا ہے اور اس گناہ کی وجہ سے اس کے دل میں ظلمت چھا جاتی ہے اور اس ظلمت کا اثر اس کے چہرے اور آنکھوں پر آتا ہے۔ چنانچہ گنہگار آدمی کتنا ہی حسین وجمیل کیوں نہ ہو، اس کے چہرے پر ایک سیاہی سی معلوم ہوتی ہے ۔اور نیک آدمی کیسا ہی سانولا ہو؛ لیکن ایک نور اس کے چہرے پر معلوم ہوتا ہے۔

ایک روایت

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے ''الابواب والتراجم'' میں ایک روایت نقل کی ہے کہ آدمی سات پردوں کے اندر ایک نیکی کا کام کرے تو بھی اللہ تعالیٰ اس کے واسطے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا فرما کر اس نیکی کو ظاہر کر دیں گے۔ آخر یہ جتنے اہل اللہ اور نیک لوگ ہیں؛ ہم اور آپ ان کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں۔ کیا ہم کبھی ان کو عبادت کرتے ہوئے دیکھنے کے لئے گئے؟ ہمیں تو معلوم بھی نہیں کہ وہ تنہائی میں کیا عبادت کرتے ہیں، کس قسم کے روزے رکھتے ہیں ان کے روزوں کی کیفیات کیا ہیں؟ ان کی تلاوت کی کیفیات کیا ہیں؟ ان کی تسبیحات وذکر کی کیفیات کیا ہیں؟ ان کی راتوں کی عبادت کی کیفیات کیا ہیں؟ ہم تو جانتے بھی نہیں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی طرف دلوں کا ایسا میلان رکھا ہے کہ لوگ ٹوٹے پڑتے ہیں۔ حضرت مولانا قاری صدیق صاحب باندوی دامت برکاتہم (رحمہٗ اللہ) تشریف لائے

تھے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ اہل اللہ کا ہر جگہ یہی حال ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ قدرتی طور پر لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈالتے ہیں۔

مقبولیت کا راز

بخاری شریف کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی سے محبت فرماتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام آسمان والوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سے محبت کرتے ہیں اور میں ان سے محبت کرتا ہوں؛ تم ان سے محبت کرو، چنانچہ آسمان والے ان سے محبت کرتے ہیں، اس کے بعد ﴿ یُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِیْ الْاَرْضِ ﴾ زمین میں ان کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔ (مشکوٰۃ از مسلم ص ۴۲۵ باب الحب فی اللہ فصل اول)

مقبولیت اللہ کی طرف سے ہونے کی علامت

اسی لئے کتابوں میں لکھا ہے کہ کس کی مقبولیت اللہ کی طرف سے ہے اور کس کی مقبولیت اور شہرت بطورِ استدراج اور ڈھیل کے ہے؟ اس کی علامت کیا ہے؟ بعض ایسے جو متبعِ شریعت نہیں ہوتے، بناوٹی باپوا ور اٹھاؤنی قسم کے لوگوں کو بھی مقبولیت حاصل ہوتی ہے تو کیا فرق ہے؟ یعنی یہ مقبولیت اللہ کی طرف سے ہے یا استدراج ہے؟ تو علماء نے لکھا ہے کہ جن لوگوں کی مقبولیت خواص سے چل کر عوام تک پہنچے، یعنی پہلے ان کی محبت اور مقبولیت خاص خاص اہلِ تقویٰ اور اہلِ صلاح لوگوں کے اندر ہو، اور ان کے ذریعہ سے پھر عوام تک پہنچے؛ تو یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہونے کی علامت ہے۔ اور جن کو ابتداء سے

عوام میں مقبولیت ہو، خواص یعنی اہل اللہ تو ان کو جانتے بھی نہیں؛ تو پھر یہ استدراج سمجھا جائے گا یعنی عنداللہ مقبولیت کی علامت نہیں۔تو بہر حال یہ جو گناہ کی وجہ سے دل کے اندر سیاہی آتی ہے،اس کے اثرات چہرے پر بھی آتے ہیں۔

﴿نیکیوں کے فوائد گناہوں کے نقصانات حِبرُ الامۃ رضی اللہ عنہ کی زبانی﴾

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نیکی کی وجہ سے چہرے پر رونق، دل میں نور، روزی میں کشادگی، بدن میں قوت اور لوگوں کے دلوں میں محبت ڈالی جاتی ہے اور گناہ کی وجہ سے چہرے پر بے رونقی، دل اور قبر میں ظلمت و اندھیری، روزی میں تنگی، بدن میں کمزوری اور لوگوں کے دلوں میں نفرت و عداوت ڈال دی جاتی ہے۔بہت سے فساق و فجار ہیں جنھوں نے ہمارا کچھ بگاڑا نہیں، ہم نے تو کبھی ان کو دیکھا بھی نہیں ہے پھر بھی ان کے متعلق ہمارے دل میں ایک نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔کس نے ڈالا؟ یہ گناہوں کے اثرات ہیں اور اسی گناہ کے نتیجے میں آدمی کا دل بھی کمزور ہوتا ہے،جسم بھی کمزور ہوتا ہے۔

﴿صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جسمانی قوت ان کے تقویٰ کا اثر تھی﴾

آپ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات پڑھے ہوں گے کہ قیصر و کسریٰ کی فوجوں کے سامنے جب یہ حضرات پہنچے تو کیا قیصر و کسریٰ کی فوج کے پاس کھانے پینے کی کمی تھی؟ ان کو تو خوب خوراکیں ملتی تھیں،خوب کھاتے پیتے تھے،اور قوت کے سامان خوب تھے،جبکہ صحابۂ کرام کا حال یہ تھا کہ ان کو فاقے ہوتے تھے،اور کھانے کے لئے ان کے پاس روٹی موجود نہیں تھی،غذا موجود نہیں تھی، پھر بھی صحابہ کے پاس جو قوت تھی وہ ان کے پاس نہیں تھی اہل اللہ کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی غذا بہت قلیل ہوتی ہے پھر بھی وہ ایسے اعمال میں مشغول

رہتے ہیں اور ایسے کام کر لیتے ہیں کہ دوسرے لوگ جو اُن کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے اور چلنے پھرنے والے ہیں خود حیرت کرتے ہیں کہ اتنی ساری قوت ان میں آئی کہاں سے؟ لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ نہ ان کو آرام کا وقت ملا، نہ کچھ کھا پی رہے ہیں؛ پھر یہ قوت کہاں سے آئی؟ دراصل یہ نیکی کا اثر ہوتا ہے۔اور گناہ کے نتیجے میں قدرۃً جسمانی طور پر بھی کمزوری آتی ہے اور روحانی و قلبی طور پر بھی کمزوری آتی ہے۔

﴿بعض گناہ جو لعنت کا سبب بنتے ہیں﴾

اسی طریقے سے گناہ کی وجہ سے آدمی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک ﷺ کی لعنت کا حقدار بنتا ہے بے شمار گناہ ایسے ہیں جن پر احادیث میں لعنت آئی ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے اور درمیان میں واسطہ بننے والے پر۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے سود کھانے والے پر، سود کھلانے والے پر اور اس کا حساب و کتاب لکھنے والے پر، اس میں جو دونوں گواہ بنتے ہیں ان کے اوپر۔ شراب کے متعلق آیا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی لعنت شراب کے سلسلے میں دس آدمیوں پر ہوتی ہے (۱) پینے والے پر (۲) پلانے والے پر (۳) نچوڑنے والے پر (۴) نچڑوانے والے پر (۵) خریدنے والے پر (۶) بیچنے والے پر (۷) جس کے لئے خریدا جارہا ہے (۸) لانے والے پر (۹) جس کے لئے لایا جارہا ہے (۱۰) اُس کی قیمت کو استعمال کرنے والے پر۔ ایسے کئی گناہ ہیں۔ (ابن ماجہ ص ۲۵۰۔ باب الخمر علیٰ عشرۃ اوجہ)

ہمارے حضرت مفتی محمود حسن صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا ایک رسالہ ہے ''اسبابِ لعنت'' جس میں ایسے گناہوں کو جمع کیا گیا ہے کہ جن گناہوں کے ارتکاب کے نتیجے میں آدمی پر اللہ

کی لعنت پڑتی ہے، آدمی اللہ کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے اور لعنت کا حقدار بنتا ہے آدمی کے ان گناہوں کی وجہ سے زمین میں سے برکتیں ختم ہو جاتی ہیں، پانی میں سے برکت ختم ہو جاتی ہے، غذا اور خوراک میں سے برکت ختم ہو جاتی ہے، ہر چیز سے برکت ختم ہو جاتی ہے۔

گیہوں کا ایک دانہ کھجور کی گٹھلی کے برابر

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے مسند کے اندر لکھا ہے کہ بنو امیہ کے زمانے میں خزانے کے اندر گیہوں کا ایک دانہ تھا، جو اس لئے رکھا گیا تھا کہ یہ زمانۂ خیر کا ہے، نیکی کے زمانے کا ہے، وہ دانہ کھجور کی ایک گٹھلی کے برابر تھا۔ ویسے نبی کریم ﷺ کے ارشادات بخاری و مسلم اور دوسری کتبِ حدیث میں موجود ہیں کہ آخری زمانے میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے اور ساری دنیا میں لوگ ایمان لے آئیں گے اور سب جگہ نیکی کا دور دورہ ہوگا، کوئی کافر باقی نہیں رہے گا، ہر جگہ ایمان اور اہلِ ایمان کی برکتیں پھیلیں گی تو صرف ایک انار ایک بڑی جماعت کے لئے کافی ہو جائے گا اور اس ایک انار کے چھلکے میں ایک بڑی جماعت سایہ حاصل کرے گی، اتنا بڑا انار ہوگا، یہ نیکیوں کی برکت ہوگی، نیکیوں کی برکت کے نتیجے میں ہر چیز میں برکت ہوگی۔ (صحیح مسلم ۲/۴۰۲۔ باب ذکر الدجال)

پوری روئے زمین میں بے برکتی صرف ایک گناہ کا اثر ہے

قرآن پاک میں ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ. (الروم آیت ۴۱ پارہ ۲۱) خشکی اور سمندروں میں لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے فساد پھیل گیا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے، شاید کہ یہ لوگ تائب ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیں۔ اس آیت کی تفسیر

میں روح المعانی میں صاحبِ روح المعانی نے ضحاک کا قول نقل کیا ہے: اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ السلام کو جب دنیا کے اندر بھیجا تو روئے زمین پر کوئی خطہ (ٹکڑا) بنجر نہیں تھا، پوری زمین سرسبز وشاداب تھی اور کوئی درخت بغیر پھل کا نہیں تھا، تمام درخت پھل والے تھے اور سمندروں کا پانی میٹھا تھا اور کبھی شیر نے گائے کو پھاڑا نہیں تھا اور بھیڑیے نے بکری پر کبھی حملہ نہیں کیا تھا، جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا، تو زمین میں ایک بھونچال سا آیا اور اس کے نتیجے میں سمندروں کا پانی کھارا اور کڑوا ہوگیا اور درختوں پر کانٹے آگئے اور جو برکتیں تھیں وہ اٹھالی گئیں، اس کے بعد ہی شیر نے گائے پر اور بھیڑیے نے بکری پر حملہ کرنا شروع کیا۔ یہ جتنی بھی بے برکتیاں ہیں؛ وہ سب اسی لئے ہوئیں۔

(روح المعانی ۲۱/۴۷)

﴿مُسْتَرِيحٌ أَوْ مُسْتَرَاحٌ مِنْهُ﴾

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک جنازے کو جاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ﴿مُسْتَرِيحٌ أَوْ مُسْتَرَاحٌ مِنْهُ﴾ یا تو خود راحت پانے والا ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ ہے تو دنیا کے جھنجھال سے اور دنیا کی تکالیف ومصائب سے نجات پاکر دنیا سے جارہا ہے، یا دوسرے لوگ، اللہ کی بستیاں، اللہ کی مخلوق، چوپائے، انسان، درخت اور سب چیزیں اس کے جانے سے راحت پارہی ہیں اگر وہ گنہگار تھا، کیوں کہ اس کے گناہوں کی نحوست کی وجہ سے دنیا میں مصائب آرہے تھے، گویا اس کے گناہ کی نحوست کی وجہ سے سب لوگ مصیبت میں گرفتار تھے۔ اسی لئے آتا ہے کہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو تمام مخلوقات اس کے لئے بددعا کرتی ہیں کہ اس کے گناہوں کی وجہ سے سارے مصائب آرہے ہیں اور گناہ

کے نتیجہ میں آدمی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر گناہ کی وجہ سے ایک قسم کی مایوسی سی چھا جاتی ہے۔

﴿گناہ کی وجہ سے مایوسی کا ''ایک واقعہ''﴾

چنانچہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک آدمی کا انتقال ہورہا تھا اور اس وقت لوگ اس کو کلمہ بھی تلقین کررہے تھے، مگر وہ گانا گارہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ساری زندگی تو گناہوں میں گذری؛ اب آخری وقت میں کلمہ پڑھ کر کیا ہوگا؟ جو گناہ کئے تھے اس کی وجہ سے اس پر ایسی مایوسی چھائی کہ اب کلمہ بھی اس کو بے کار معلوم ہوتا ہے حالانکہ آخری وقت میں بھی آدمی سچے دل سے کلمہ پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوتا ہے، لیکن گناہ مایوسی لانے والی چیز ہے۔

﴿گناہ کی وجہ سے برے خاتمہ کا اندیشہ ''چند قصے''﴾

اور جب آدمی کثرت سے گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ اس کے اوپر ایسا چھا جاتا ہے کہ آخری حالت تک یہ کیفیت باقی رہتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد عمر صاحب دامت برکاتہم (رحمہٗ اللہ) کی تقریر میں سنا کہ ایک آدمی تالے بیچا کرتا تھا اس زمانے میں کئی طرح کے تالے آتے تھے، وہ آدمی ''جرمن جاپان، جرمن جاپان'' بولتا رہتا تھا، اخیر میں موت کا وقت آیا تو لوگ اس کو کلمہ تلقین کررہے ہیں اور وہ کہہ رہا ہے ''جرمن جاپان، جرمن جاپان''

﴿دوسرا قصہ﴾

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے لکھا ہے کہ ایک آدمی کی موت کا وقت تھا، لوگ اس کو کلمہ تلقین کررہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا: ایک پیالہ شراب کا تو بھی پی، مجھے بھی پلا، تو بھی پی مجھے

بھی پلا۔ زندگی بھر شراب پیتا رہا تو یہی کیفیت آخری وقت میں بھی باقی رہی۔

﴿تیسرا قصہ﴾

حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے قصہ لکھا ہے کہ ایک آدمی کپڑوں کی تجارت کرتا تھا اوراس میں ایسا مشغول رہتا تھا (تجارت کوئی بری چیز نہیں ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اس کو ذریعہ سمجھے، آدمی اس میں مشغول ہو کر اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو جائے) کہ تمام فرائض و واجبات سے بے خبر تھا۔ اب وہ موت کے وقت کہہ رہا ہے ''وہ فلاں آدمی معاملہ کے اعتبار سے بڑا اچھا ہے، یہ کپڑا بڑا اچھا ہے'' لوگ اس کو کلمہ تلقین کر رہے ہیں اور وہ یہ بولے جا رہا ہے۔

﴿چوتھا قصہ﴾

ایک آدمی ناپ تول میں کمی کرتا تھا، لوگ کلمہ پڑھا رہے ہیں لیکن وہ کہتا ہے: ترازو کا کانٹا زبان پر آتا ہے؛ بولنے نہیں دیتا۔ اوراس کی وجہ سے کلمہ پڑھنا چاہتا ہے تب بھی پڑھا نہیں جاتا۔ گناہ کی وجہ سے آدمی کلمہ نہیں پڑھ پاتا۔

﴿دورِ نبوت کا عبرتناک واقعہ﴾

احادیث میں دورِ نبوت کا قصہ موجود ہے۔ ایک صحابی کی والدہ ان سے ناراض تھیں، جب انتقال کا وقت آیا لوگ کلمہ پڑھا رہے ہیں لیکن زبان پر کلمہ نہیں چڑھ رہا ہے، چاہتے ہوئے بھی زبان سے نکل نہیں رہا تھا۔ لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں گئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ صورتِ حال ہے۔ حضور ﷺ نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ان کی والدہ ناراض ہیں، آپ نے ان کی والدہ کو بلوایا اور فرمایا: ان سے راضی ہو جاؤ، ان کو معاف

کردو۔اس نے کہا: میں تو معاف نہیں کرتی۔حضور ﷺ نے فرمایا: آگ جلاؤ، جب آگ تیار ہوگئی تو اس نے پوچھا: آگ کیوں جلائی جارہی ہے؟ کہا: ان کواس میں ڈالنا ہے۔ کیوں کہ جہنم کی آگ کے مقابلے میں تو یہ ہلکی ہے۔ان کی والدہ نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو کہا: مَیں نے معاف کردیا۔بس! اس کا یہ کہنا تھا اور اُدھر زبان پر ایک دم کلمہ جاری ہوگیا۔تو گناہ کی نحوستیں بے شمار ہیں، اندازے سے باہر ہیں یعنی آدمی اگر اس کو شمار کرنا چاہے تو ناممکن ہے۔

﴿صغیرہ کبیرہ کی تقسیم﴾

اب گناہوں کے اندر بھی علماء نے تقسیم کی ہے۔ویسے آپ نے سنا ہوگا صغیرہ گناہ اور کبیرہ گناہ، چھوٹا گناہ اور بڑا گناہ۔کبیرہ گناہ کتنے ہیں ان کی تعداد کے سلسلے میں بھی کتابوں میں تفصیلات موجود ہیں۔کسی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نافرمانی کبیرہ گناہ ہے، کوئی گناہ چھوٹا نہیں۔ (معارف القرآن ۲/۳۸۴)

﴿کوئی گناہ چھوٹا نہیں﴾

اسی لئے گناہوں کی جو صغیرہ اور کبیرہ تقسیم ہے؛ تو واقعۃً ہے بھی یا نہیں؟ یہ مسئلہ بھی ائمہ وعلماء کے درمیان اختلاف کا ہے۔بعض حضرات تو اس طرف گئے ہیں کہ جتنے بھی گناہ ہیں وہ سب کبیرہ ہی کبیرہ ہیں؛ کوئی صغیرہ نہیں۔

﴿ان حضرات کی دلیل﴾

مشائخِ شافعیہ میں سے ایک بہت بڑے عالم اور جلیل القدر بزرگ ابواسحٰق اسفرائنی ہیں ان کا مسلک اس سلسلہ میں یہی ہے کہ سب گناہ کبیرہ ہیں؛ کوئی صغیرہ نہیں۔

اور قاضی عیاض مالکی نے بعض محققین کا بھی یہ قول نقل کیا ہے۔ان حضرات نے دلیل یہ پیش کی ہے اور دلیل اپنی جگہ پر واقعۃً بڑی وزنی اور معقول ہے کہ جو بھی معصیت اور گناہ ہوتا ہے؛ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی شانِ عظمت و کبریائی کے مقابلے میں گستاخی اور اس کی نافرمانی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ذات کو دیکھو۔ ہے کوئی اس کے مقابلے میں؟ اگر آج کوئی بہت بڑا بادشاہ آجائے ، ملک کا صدر جمہوریہ یہاں آجائے اور کوئی آدمی اس کے سامنے آنکھ نکال دے، تو ساری دنیا کیا کہے گی؟ بہت بڑی گستاخی کردی۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت اور اللہ تعالیٰ کا جلال اور اس کی کبریائی اور اس کی بڑائی کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی شان میں کوئی ذرا سی بات بھی نافرمانی کی کرے گا تو وہ بہت بڑی کہلائے گی۔ اس لئے کوئی گناہ چھوٹا نہیں ہے، جتنے بھی گناہ ہیں؛ وہ کبیرہ ہیں۔

﴿ایک شیخ کا حکیمانہ جواب﴾

ایک مرید نے اپنے شیخ سے پوچھا: یہ بدنگاہی یعنی نامحرم کو دیکھنا؛ یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟ ان بزرگ نے جواب دیا: بھائی دیکھو! کوئی آدمی آگ کی چنگاری کو چھوٹی سمجھ کر اپنے کپڑوں کے بکس میں نہیں رکھتا، چنگاری چنگاری ہے، بڑی ہو تو بھی، چھوٹی ہو تو بھی، بڑی چنگاری جس طرح گھر جلانے کا کام کرتی ہے، چھوٹی بھی وہی کرسکتی ہے، آپ کپڑوں کے بکس میں بڑی چنگاری رکھو گے؛ تو وہ بھی اس کو جلا دے گی، اور چھوٹی سی رکھو گے؛ تو وہ بھی آگ لگانے کے لئے کافی ہے۔ اسی طرح گناہ بھی آدمی کے خرمنِ ایمان میں یعنی ایمان کے کھلیان میں اور ایمان کے مکان میں آگ لگانے والا ہے، لہٰذا اب چھوٹی چنگاری اور بڑی چنگاری دیکھنا؛ یہ کوئی دانشمندی کی بات نہیں ہے۔

﴿امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ﴾

لیکن اس کے باوجود جو حضرات محققین ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں صغیرہ اور کبیرہ۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''احیاء العلوم'' میں لکھا ہے کہ احادیث اور قرآن کے پیشِ نظر جمہور علماء کا مسلک یہی ہے کہ گناہ میں تقسیم ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی عظمت اور اس کی کبریائی کے سامنے ہر گناہ کبیرہ ہے لیکن یہاں فی نفسہٖ اپنی ذات کے اعتبار سے گناہوں میں جو تقسیم دیکھی جائے تو بعضے گناہ بعض کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے ہیں اور بعض گناہ بڑے ہوتے ہیں اس لئے تقسیم کی گئی ہے، چھوٹے گناہ اور بڑے گناہ، جن کو صغائر اور کبائر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ پاک میں بھی ہے ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَاتُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (النساء۔آیت ۳۱۔پارہ ۵)﴾ کہ بڑے بڑے گناہ جن سے تم کو منع کیا گیا ہے اگر تم ان سے بچنے کا اہتمام کرو گے تو تمہارے دوسرے گناہ جو چھوٹے ہوں گے؛ ان کو ہم معاف کر دیں گے۔ احادیث میں بھی آتا ہے ﴿مَالَمْ يَغْشَ الْكَبَائِرَ (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم ۳۸ بمعناہ)﴾ کہ جب تک بڑے گناہوں کا ارتکاب نہ کرے تو چھوٹے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے وضو کی وجہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، نماز کی وجہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، رمضان کے روزوں کی وجہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اور اسی طریقے سے چل کر مسجد میں نماز کیلئے جانے کی وجہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، عرفہ کا روزہ رکھا تو گناہ معاف ہو جاتے ہیں، عاشوراء کا روزہ رکھا تو گناہ معاف ہو جاتے ہیں، حج کی وجہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں عمرہ کی وجہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، آپ نے پڑھا ہو گا کہ بہت ساری عبادتیں ایسی ہیں کہ ان میں ہر قدم پر ایک گناہ معاف ہوتا ہے اور ایک نیکی

ملتی ہے اور ایک درجہ بلند ہوتا ہے۔تو یہ جتنے بھی معافی والے گناہ ہیں یہ سب صغائراور چھوٹے چھوٹے گناہ ہیں، بڑے نہیں۔

﴿ایک ظاہری مثال سے مضمون کی وضاحت﴾

مثال سے یوں سمجھئے کہ آپ کا کوئی خادم،نوکراور ملازم ہے،اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں غلطی کی ہوجاتی ہیں،لیکن بڑی غلطیاں کبھی نہیں کرتااس صورت میں ان چھوٹی غلطیوں پرآپ اس کی پکڑ دھکڑ نہیں کریں گے، یوں سوچیں گے کہ ایک انسان ہے ذرا تولہ ماشہ ہو جاتا ہے،تھوڑی کمی بیشی ہوجاتی ہے، یوں کہہ کر چھوڑ دیں گے،لیکن اگر وہ چھوٹی نہیں بلکہ بڑی بڑی غلطیاں بھی کرتا ہےتو پھرآپ بڑی پر بھی پکڑ کریں گےاور چھوٹی پر بھی پکڑ کریں گے،آپ کہیں گے کہ یہ جان بوجھ کرایسی حرکتیں کرتا ہے۔

﴿امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام مع تشریح ''توبہ کی حقیقت''﴾

بہرحال! گناہوں کے سلسلہ میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:﴿قال العلماء التوبۃواجبۃمن کل ذنب﴾ ہر گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے۔توبہ کسے کہتے ہیں؟ توبہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔تاب- یتوب- توبۃً۔اس کا معنٰی ہے رجوع کرنااورلوٹنا،توبہ کا مطلب ہے کہ یہ بندہ اب تک اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا تھااس نافرمانی کو چھوڑ کروہ فرمانبرداری کی طرف لوٹ رہاہے، اس لئے توبہ کوتوبہ کہتے ہیں اور جوعربی جاننے والے ہیں ان کومعلوم ہے کہ توبہ کے ساتھ جب لفظ''الیٰ'' آتا ہے،''تاب الیہ'' تواس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوا،اس نے توبہ کی۔اورتوبہ کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بھی بولا جاتا ہےمگراس کا استعمال لفظِ''علیٰ'' کے ساتھ ہوتا ہے''تاب اللہ علیہ''تواس کا

مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر مہربان ہوا۔ اس لئے کہ بندہ جب توبہ کرتا ہے اور اپنے گناہوں پر پچھتاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے گناہوں کی وجہ سے اب تک اس کو اپنی رحمت سے محروم کردیا تھا، اب دوبارہ رحمت کا سلسلہ شروع کردیتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی رحمت لے کر اس کی طرف لوٹتا ہے، اسی لئے وہاں بھی لفظِ توبہ استعمال کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ مہربان ہوا یا اللہ تعالیٰ نے اس کو توبہ کی توفیق دی اور اس کی توبہ کو قبول فرمایا ﴿ان اللہ ھو التوّابُ الرّحیمُ ﴾ تو لفظِ توبہ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کیا گیا یعنی اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔ تو بہر حال توبہ کا مطلب ہے رجوع کرنا لہٰذا ہر گناہ سے توبہ واجب ہے۔

﴿ گناہ کی دو قسمیں ﴾

اب علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس گناہ سے توبہ کی جارہی ہے وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی میں ہم نے کوتاہی کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے، لیکن اس میں کسی بندے کا حق نہیں مارا۔ مثلاً کسی نے شراب پی، تو شراب پینا؛ یہ کبیرہ اور بڑا گناہ ہے، لیکن اس کے شراب پینے کی وجہ سے کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوا ہاں! اس نے اللہ تعالیٰ کا ایک حکم توڑا اور بڑا گناہ کیا۔ اب اگر اس گناہ سے توبہ کرتا ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حق سے ہے تو اس کو تین چیزوں کا اہتمام کرنا پڑے گا؛ تب اس کی توبہ "توبہ" کہلائے گی اور ان تینوں میں سے ایک بات بھی اگر نہیں ہوئی تو وہ توبہ نہیں

﴿ توبہ کی شرطِ اول ﴾

اول نمبر پر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ﴿أن یقلع عن المعصیة ﴾ وہ سب سے پہلا کام تو یہ کرے کہ جس گناہ سے توبہ کررہا ہے اس سے باز آجائے اور اس کو چھوڑ دے۔

گناہ میں مشغول ہے اور کہے کہ میں نے توبہ کی، تو اس کی مثال حضرت مولانا حکیم اختر صاحب دامت برکاتہم دیتے ہیں کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ عورتوں کو دیکھتے جاتے ہیں اور کہتے ہیں ''توبہ توبہ توبہ'' دیکھو! بے پردہ جارہی ہے۔ایک تو خود دیکھتے جارہے ہیں، اس کا نام توبہ نہیں، یہ تو زبانی توبہ ہوئی۔توبہ تو یہ ہے کہ جس گناہ میں آدمی مبتلا ہے پہلے اس گناہ سے باہر نکلے۔مثلاً ایک آدمی کسی نجاست کے گڑھے میں پڑا ہوا ہے، اب اگر وہ اس نجاست سے اپنے آپ کو پاک کرنا چاہتا ہے؛ تو یہ گڑھے میں رہ کر پاک نہیں ہوگا، ساری دنیا کے سمندر آپ اس پر بہا ڈالو؛ تب بھی پاک نہیں ہوگا، اس لئے کہ وہ تو نجاست کے اندر پڑا ہوا ہے، اس کو کہیں گے کہ پہلا کام تو یہ کر؛ کہ باہر نکل، تیرے کپڑے وغیرہ بعد میں دھوئیں گے، پہلے تو باہر نکل۔اسی طریقے سے گناہ کے گڑھے میں پڑا ہوا ہے تو جب تک کہ اس گناہ سے باہر نہیں نکلے گا؛ تب تک توبہ قبول نہیں ہوگی۔ویسے توبہ کہتے بھی ہیں لوٹنے کو، تو گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی چھوڑ کر فرمانبرداری کی طرف لوٹے؛ تب ہی تو توبہ ''توبہ'' کہلائے گی۔اسی لئے توبہ میں سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کررہا ہے اس گناہ سے باہر آوے۔معلوم ہوا کہ اس گناہ پر باقی رہتے ہوئے؛ توبہ ''توبہ'' نہیں ہوگی اس صورت میں استغفار کرے گا تب بھی بے فائدہ ہوگا۔

﴿ہماری توبہ بھی توبہ کی محتاج﴾

ایک بزرگ کا مقولہ ہے ﴿اِسْتِغْفَارُنَا يَحْتَاجُ اِلىٰ اِسْتِغْفَارٍ كَثِيْرٍ﴾ ہمارا استغفار بھی بہت زیادہ استغفار کا محتاج ہے یعنی ہمارے استغفار میں بھی استغفار کی حقیقت پائی نہیں جاتی، اس کے لئے بھی استغفار کی ضرورت ہے، ایسے ہی ہماری توبہ بھی توبہ کی محتاج ہے۔

تو گناہ میں باقی رہتے ہوئے توبہ ''توبہ'' نہیں کہلائے گی۔لہٰذا توبہ میں تین چیزیں ضروری ہیں اگر وہ حقوق اللہ کے قبیل سے ہے۔ایک تو یہ کہ گناہ سے باہر آوے یعنی اگر شراب سے وہ توبہ کررہا ہے تو پہلے شراب پینا چھوڑ دے۔

دوسرے ﴿أَن یَندَمَ عَلیٰ فِعْلِهَا﴾ اب تک جو کیا اس پر اس کو ندامت اور پچھتاوا ہو ندامت کیا ہے؟ ﴿تَأَلُّمُ الْقَلْبِ﴾ دل میں درد اور تکلیف ہونا کہ ہائے! میں نے کیا کر ڈالا کس کی نافرمانی کی؟ کس کو ناراض کیا؟ ظاہر ہے کہ اہلِ ایمان کو تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ محبت ہے۔دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی یہ محسوس کرے کہ میرا محبوب مجھ سے ناراض ہے؛ تو اس کو چین نہیں آتا، وہ بے چین ہو جاتا ہے اور محبوب کی ناراضگی کے تصور سے اس کی نیند حرام ہو جاتی ہے، اس کو کھانا اچھا نہیں لگتا، دسترخوان بچھایا ہے، بریانی اور زردہ اس کے سامنے ہے، لیکن اس کے ہاتھ نہیں چل رہے ہیں، محبوب کی ناراضگی کے تصور سے بھوک مر چکی ہے، نہ بیوی بچے اچھے لگتے ہیں، نہ اور کچھ۔کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔واقعہ یہی ہے، کیوں کہ محبت چیز ہی ایسی ہے۔

﴿جب مزاجِ یار......﴾

حضرت مولانا حکیم اختر صاحب دامت برکاتہم جب ڈابھیل تشریف لائے تھے تو خود انہیں سے سنا، مدرسہ کے دفتر میں ایک مرتبہ مجلس تھی تو چند اساتذہ سے فرمایا کہ فانیؔ بدایونی ایک شاعر تھا، اپنی بیوی سے اس کو بڑی محبت تھی، اب بیوی ناراض ہوگئی، تو وہ کہتا ہے:

جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا مجھے ہم نے فانیؔ ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات

کہ دوست کے مزاج میں ذرا برہمی دیکھی، تو صرف اپنی ہی نہیں بلکہ ساری کائنات کی نبض

ڈوبتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ایک اپنی نبض کی بات کہتا تو بات بھی تھی، وہ تو پوری کائنات کو اپنی نگاہوں کے سامنے ڈوبتی دیکھ رہا ہے۔ تو محبوب کی ناراضگی کا جب کسی کو خیال آتا ہے؛ تو اس کو چین نہیں آتا۔

محبوب العالمین ﷺ کی خفگی اور صحابی کی شانِ فدائیت

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ جو محبت تھی اس کی وجہ سے جہاں ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ حضور ناراض ہیں تو ان کی بے کلی کا عجیب عالم ہوتا۔ آپ فضائلِ اعمال میں حکایاتِ صحابہ پڑھتے اور سنتے ہیں، ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کہیں تشریف لے جارہے تھے، گذرتے ہوئے دیکھا کہ ایک قبہ نما مکان ہے تو آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کس کا ہے؟ بتایا گیا کہ فلاں صحابی کا ہے، آپ آگے بڑھ گئے (وہ صحابی اس وقت ساتھ نہیں تھے) دوسرے کسی موقع پر وہ حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوئے، آکر انہوں نے سلام کیا تو حضور ﷺ نے رخ پھیرلیا، سلام کا جواب نہیں دیا۔ اب وہ سوچ رہے ہیں کہ معلوم نہیں کیا بات ہوئی؟ پریشان ہیں کہ حضور آخر مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟ لوگوں سے پوچھا: آج میں حضور اکرم ﷺ کے چہرۂ انور کو مجھ سے خفا محسوس کرر ہا ہوں؛ کیا بات ہے؟ کوئی بات میرے متعلق ہوئی ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں! ایک بات ہے، فلاں روز حضور تشریف لے جارہے تھے اور آپ کا گذر ہوا تو وہاں ایک قبہ نما مکان دیکھا، اس وقت حضور ﷺ نے پوچھا تھا کہ یہ کس کا ہے؟ ہم لوگوں نے بتلایا تھا کہ آپ کا ہے۔ بس! یہ سننا تھا کہ سیدھے گئے اور وہ مکان ڈھادیا۔ دیکھو! محبت کیسی تھی کہ آنے کے بعد بتایا بھی نہیں کہ میں ڈھا کر آیا ہوں۔ ہم جیسے ہوتے تو احسان جتلا دیتے کہ حضرت! آپ کی ناراضگی کا پتہ چلا تو ابھی وہ مکان ختم

کر کے آیا ہوں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اعلیٰ درجہ کے حسنِ ادب کا یہ ایک نمونہ ہے۔

محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی

غزوۂ بدر کے موقع پر جب قیدیوں کو پکڑ کر لایا گیا تو ان قیدیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک چچا حضرت سیدنا عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے، جن صحابی کے پاس ان کو رکھا گیا تھا انہوں نے ان کی رسی ذرا سخت باندھی تھی جس کی وجہ سے ان کو جب تکلیف ہوتی تو درد کی وجہ سے ٹیسیں اٹھتی تھی اور آہ آہ کی آواز نکلتی تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کو فرمایا: عباس کی آہوں کی وجہ سے مجھے رات کو نیند نہیں آئی۔ خیر! اب قیدیوں کے متعلق مشورہ ہوا اور مشورہ کے آخر میں یہ طے ہوا کہ ان سے فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے۔ جب یہ بات آئی تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمارے بھانجے کو آپ مفت چھوڑ دیجئے۔ ہمارے بھانجے بول کر اشارہ حضرت عباس کی طرف تھا۔ حضرت عباس ان کے بھانجے نہیں تھے اصل تو ان کے بھانجے ہوتے تھے حضرت عباس کے والد عبدالمطلب؛ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا ہوتے ہیں۔ جس کی تفصیل یوں ہے کہ عبدالمطلب ہاشم کے صاحبزادے تھے اور ہاشم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پرداداتھے، چونکہ مکہ والوں کا دستور تھا کہ وہ تجارتی غرض سے آتے جاتے رہتے تھے، شام کا سفر کرتے تھے، تو مکہ سے شام جاتے ہوئے درمیان میں مدینہ منورہ آتا تھا، ان لوگوں کا قیام مدینہ منورہ رہتا تھا، اس زمانے میں مدینہ کے ایک خاندان کی سلمیٰ نام کی لڑکی اپنے اوصاف، خوب سیرتی اور خوبصورتی کی وجہ سے بڑی مشہور تھی۔ حضرت ہاشم نے ان کو پیغام بھیجا اس کے والد نے جب پیغام دیکھا تو قبول کر لیا اور یوں کہا کہ ہم اپنی لڑکی کو مکہ نہیں بھیجیں گے، شادی کے بعد ساری زندگی آپ چاہیں تو یہاں رہیں، وہ آپ کے ساتھ مکہ

نہیں آئے گی، اس شرط کے ساتھ انہوں نے نکاح کرلیا،لہٰذا شام آتے جاتے ہوئے حضرت ہاشم مدینہ ٹھہرتے تھے،انہیں سے عبدالمطلب پیدا ہوئے۔عبدالمطلب کا اصل نام شیبہ تھا،شیبہ بھی اس لئے کہ جب وہ پیدا ہوئے ہیں توان کے سر کے کچھ بال سفید تھے،سفید بالوں کوعربی میں شیبہ کہتے ہیں توان کا نام شیبہ تھا،جب ہاشم کا انتقال ہونے لگا توانہوں نے اپنے بھائی مطلب (مطلب کے علاوہ ان کے دو بھائی اور تھے نوفل بن عبدمناف،عبدشمس بن عبدمناف) سے یوں کہا کہ میرا بچہ وہاں ہے، کچھ بڑا ہوتو تمہارے گھر پر لے آنا، چنانچہ ہاشم کے صاحبزادے شیبہ جب تھوڑے بڑے اور سیانے ہوئے،۵/ ۶ سال کی عمر ہوئی تو مطلب اپنے بھائی کی وصیت کے مطابق گئے اوران کواپنے ساتھ اونٹنی پر بٹھا کر مکہ لے آئے۔اس زمانے میں کوئی آدمی جب سفر پر گیا ہوا ہو،اوراپنے ساتھ کوئی چھوٹا بچہ لے آوے،تو لوگ یوں سمجھتے تھے کہ غلام خرید کرلایا ہے،لہٰذا مطلب جب وہاں سے آئے تو اپنے پیچھے ۵/ ۶ سال کے بچے کو بٹھا کر لائے تھے،لوگ یوں سمجھے کہ غلام لے کرآئے ہیں اس لئے عبدالمطلب،عبدالمطلب (مطلب کا غلام) پکارا۔لہٰذاان کا نام عبدالمطلب پڑ گیا

خیر!اصل میں حضور ﷺ کے دادا عبدالمطلب کی والدہ مدینہ منورہ کی تھیں اس لئے انصار نے یوں کہا کہ یہ ان کے بھانجے ہیں،حالانکہ حضرت عباس تو عبدالمطلب کے بیٹے تھے،حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی والدہ مدینہ کی نہیں تھیں اس کے باوجود انصار نے حضور ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یوں عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے بھانجے کوآپ مفت چھوڑ دیجئے۔اس موقع پر حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ نے لکھا ہے کہ اصل تو انصار یہ چاہتے تھے کہ آپ کے چچا کو مفت چھوڑ دیا جائے،لیکن یوں نہیں کہا کہ آپ اپنے

چچا کو مفت چھوڑ دیجئے، یہ تو احسان ہوتا۔ یہ ان کا اعلیٰ درجہ کا حسنِ ادب تھا کہ انہوں نے یہ نہیں کہا بلکہ یوں کہا: یارسول اللہ! ہمارے بھانجے کو مفت چھوڑ دیجئے۔ گویا اس درخواست کے جواب میں حضور ﷺ اگر فدیہ وصول نہ بھی کریں؛ تو احسان حضور ﷺ پر نہیں ہوگا، بلکہ ہم پر ہوگا۔ خیر! حضور ﷺ نے ان کی درخواست کو قبول نہیں کیا اور فرمایا: نہیں بلکہ ان سے ان کا فدیہ لیا جائے گا، اور دوسرے رشتہ داروں کا بھی فدیہ وصول کیا جائے گا۔

یہاں میں یہ عرض کر رہا تھا کہ صحابۂ کرام ﷺ میں ادب اعلیٰ درجہ کا تھا۔ تو وہ صحابی جنہوں نے اپنا قبہ گرادیا تھا آ کر عرض بھی نہیں کیا کہ یارسول اللہ! میں نے قبہ گرادیا ہے، کچھ دنوں کے بعد خود نبی کریم ﷺ وہاں سے گذرے تو پوچھا: یہاں ایک قبہ دیکھا تھا؛ وہ کیا ہوا؟ اب صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! بعد میں وہ قبہ والے جب آپ کی مجلس میں حاضر ہوئے اور آپ نے ان کے سلام کا جواب نہیں دیا تو فوراً جا کر اس کو ڈھادیا۔ میں یہ بتلانا چاہتا تھا کہ دیکھو! صحابۂ کرام ﷺ کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص محبت تھی، اس لئے ذراسی بے رخی ان کے دل پر سانپ بن جاتی تھی اور وہ بے چین ہو جاتے تھے۔

﴿عشق است و ہزار بدگمانی﴾

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے حبشہ کی بھی ہجرت کی اور مدینہ کی بھی۔ جب حبشہ سے مدینہ آرہے تھے یعنی مکہ سے حبشہ گئے تھے پھر حبشہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ جب مدینہ پہونچے اس وقت نبی کریم ﷺ نماز میں تھے۔ بات یہ ہوئی تھی کہ جس زمانے میں وہ ہجرت کر کے گئے تھے اس زمانے میں نماز میں اگر کوئی کسی کو سلام کرتا تو سلام کا جواب دینے کی اجازت تھی، نماز میں ضروری بات چیت

کرنے کی بھی اجازت تھی، سلام کا جواب دینا بھی جائز تھا۔ اب وہ تو اسی خیال میں تھے کہ وہ حکم باقی ہے، جب حبشہ سے آئے تو عین اس وقت پہونچے کہ نبی کریم ﷺ کی نماز کی نیت بندھی ہوئی تھی اور آپ نماز میں مشغول تھے، انہوں نے آکر سلام کیا تو حضور نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ روایتوں میں ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرے سامنے تو میری زندگی کے اگلے پچھلے سارے دن آ گئے کہ حضور ﷺ نے جواب نہیں دیا، تو مجھ سے کون سا قصور ہو گیا؟ کیا بات ہو گئی؟ شاید یہ شاید وہ۔ اس طرح ساری زندگی کا خاکہ اور سارے واقعات سامنے آ گئے کہ کونسی بات حضور ﷺ کو ناپسند آئی، یہاں تک کہ حضور ﷺ نے سلام پھیرا، اس کے بعد صحابہ سے فرمایا: دیکھو! اللہ تعالیٰ اپنا حکم بدلتے رہتے ہیں پہلے نماز میں سلام کا جواب دینے کے اجازت تھی، اب نماز میں سلام کا جواب دینے کی اجازت نہیں رہی، اس لئے میں نے تمہارے سلام کا جواب نہیں دیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: تب مجھے اطمینان ہوا۔ یہ محبت کی بات ہے۔

﴿مؤمنین کی محبت قرآن کی زبانی﴾

تو حقیقت یہ ہے کہ جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے، اور جب محبّ اور عاشق کو معلوم ہو جاتا ہے کہ میرا محبوب مجھ سے ناراض ہے؛ تو اس کو کسی کل چین نہیں آتا، اب اہل ایمان کو تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بڑی شدید محبت ہوتی ہے ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (سورۂ بقرہ پ۲)﴾ جو ایمان والے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بڑی شدید محبت ہے۔ ایمان نام ہی ہے محبت کا۔ اس لئے اگر کوئی آدمی گناہ کرتا ہے اور اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہیں؛ تو پھر اس کو کیسے چین اور سکون حاصل ہو سکتا ہے؟ ویسے گناہ کی نحوست بھی یہ ہے کہ اس

کی وجہ سے دل میں بے چینی آتی ہے اور بے اطمینانی ہوتی ہے، جب تک کہ گناہ سے توبہ نہیں کرتا؛ تب تک قلب میں سکون اور اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے کیسے سکون حاصل ہوسکتا ہے؟ آدمی کیسے بھی اسبابِ راحت حاصل کرے، عمدہ سے عمدہ مکان بنائے، عمدہ سے عمدہ بستر تیار کرے، ایرکنڈیشنڈ گھر ہو جائے؛ تب بھی گناہ کے ذریعہ سے دل میں جو آگ لگا رکھی ہے، اس کا کیا؟ یہ ایرکنڈیشن تو باہر کی کھال کو ٹھنڈا کرے گا، دل کی آگ تھوڑا ہی بجھائے گا۔ دل میں گناہوں کی جو آگ ہے وہ ایرکنڈیشن سے بجھنے والی نہیں ہے۔ وہ تو توبہ کر کے اور اللہ تعالیٰ کو راضی کر کے ہی ختم ہوگی، اس لئے آدمی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتا؛ تب تک یہ بے چینی ختم نہیں ہوتی۔ لہٰذا توبہ کی دوسری شرط علامہ نوویؒ نے بیان فرمائی کہ اب تک اس نے جو گناہ کئے ہیں ان پر ندامت ہو، یعنی دل میں اس پر شرمندگی ہو کہ ہائے! میں نے کس کی نافرمانی کی؟ کس عظیم ذات کے ساتھ میں نے یہ معاملہ کیا؟ اس طرح سوچے۔ یہ دوسری شرط ہوئی۔

﴿ تیسری شرط ﴾

تیسری شرط فرماتے ہیں ﴿أَن يَّعْزِمَ أَن لَّا يَعُوْدَ إِلَيْهَا أَبَداً ﴾ پکّا ارادہ اور عزمِ مصمم کرے کہ اب دوبارہ کبھی بھی یہ کام نہیں کروں گا، مرجاؤں گا لیکن یہ کام نہیں کروں گا، مرجاؤں گا لیکن یہ گناہ نہیں کروں گا۔

﴿ حضرت حکیم الامت کا حکیمانہ نسخہ ﴾

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کو ایک صاحب نے لکھا کہ حضرت! جب کوئی حسین سامنے آتا ہے تو آنکھیں بے اختیار اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور میں اپنی آنکھوں کو روک

نہیں سکتا، ان آنکھوں کو روکنے پر مجھے قدرت حاصل نہیں ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ بھئی دیکھو! تمہارا یہ کہنا کہ قدرت حاصل نہیں؛ یہ صحیح نہیں ہے۔ اہل فلسفہ کا قاعدہ ہے کہ آدمی کی قدرت متضادین سے متعلق ہوتی ہے یعنی جو کام آدمی کرسکتا ہے، اس کو نہیں بھی کرسکتا۔ مثلاً یہ انگلی مَیں اپنے اختیار اور اپنی مرضی سے ہلا رہا ہوں، جب اپنے ارادہ سے ہلا رہا ہوں تو اپنے ارادے سے اس کو روک بھی سکتا ہوں۔ اور ایک بیماری ہوتی ہے جس میں آدمی کا ہاتھ خود بخود حرکت کرتا رہتا ہے، وہ آدمی اپنا ہاتھ روکنا چاہے؛ تب بھی نہیں روک سکتا، لہٰذا جب وہ اپنے ارادے سے ہلا نہیں رہا ہے تو اپنے ارادے سے روک بھی نہیں سکتا تو جس کام کے کرنے پر آدمی قادر ہے، یقیناً اس کے نہ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے یہ کہنا کہ میں اس سے بچ نہیں سکتا، اس کو نہ کرنے کی قدرت نہیں؛ یہ صحیح نہیں ہے۔ حضرت تھانویؒ نے لکھا تھا کہ تمہارا یہ لکھنا غلط ہے، قدرت کا تعلق دونوں طرف سے ہے، تب ہی تو قدرت ہے، ورنہ یہ تو غیر اختیاری چیز ہوئی۔

خیر! اس پر انہوں نے لکھا کہ جب میں نہیں دیکھتا ہوں تو قلب میں بہت زیادہ بے چینی ہوتی ہے کہ معلوم نہیں جس کو نہیں دیکھا وہ کیسا حسین ہوگا؟ کیسا خوبصورت ہوگا؟ معلوم نہیں آدمی کیا کیا سوچتا ہے۔ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ اچھا! نہ دیکھنے کی صورت میں جو بے چینی ہوتی ہے؛ وہ کتنی دیر تک رہتی ہے؟ لکھا کہ دو چار منٹ۔ حضرت نے لکھا کہ اچھا! دیکھ لیتے ہو تو؟ اس نے لکھا کہ تین دن تک بے چینی رہتی ہے۔ تب حضرت نے فرمایا کہ ۷۲/گھنٹے کی بے چینی اگر دو تین منٹ کی بے چینی سے دور ہوسکتی ہے؛ تو یہ سودا بڑا سستا ہے۔

خیر! بتلانا یہ ہے کہ آدمی پختہ ارادہ کرے کہ مرجاؤں گا لیکن کبھی بھی یہ کام نہیں

کروں گا، کچھ بھی ہوجائے۔تب یہ توبہ "توبہ" کہلائے گی۔

﴿اگر کوئی ایک شرط نہ پائی گئی﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تین شرطیں ہیں، ان میں سے اگر ایک بھی مفقود ہوگئی اور نہیں پائی گئی؛ تو اس کی توبہ درست نہیں ہوئی۔ تینوں باتیں پائی جائیں گی تب ہی توبہ "توبہ" کہلائے گی۔ اگر دل میں یہ بات ہے کہ پھر سے وہ کروں گا تو پھر توبہ کا مطلب ہی تھا "لوٹنا" تو وہ فرمانبرداری کی طرف کہاں لوٹا؟ ابھی تو فرمانبرداری کی طرف آیا ہی نہیں۔اس لئے یہ پکا ارادہ کرنا پڑے گا کہ کچھ بھی ہو جائے؛ مَیں دوبارہ یہ کام نہیں کروں گا۔ جب یہ تینوں باتیں ہوں گی؛ تب توبہ مکمل ہوگی۔ یہ تو حقوق اللہ کا معاملہ ہوا۔

﴿اگر گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہو تو؟﴾

اور جس کا تعلق بندوں کے حق سے ہے اس کے متعلق علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں ایک چیز زیادہ ہے، وہ یہ کہ جو حق والا ہے؛ اس کا حق ادا کردے۔ مثلاً کسی کے آپ نے پانچ ہزار روپئے لے لئے اور مار لئے۔اب ہر وقت آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے تنہائیوں میں یوں کہیں: کہ "توبہ توبہ" اب کسی کے پیسے نہیں ماروں گا، اور اس پر پچھتاویں اور پکّا ارادہ بھی کریں۔ سب کچھ ٹھیک ہے، لیکن چونکہ یہ بندے کا معاملہ تھا تو پانچ ہزار اس کو لوٹاؤ۔ یہ بھی توبہ کے واسطے شرط ہے۔

﴿اجمالی معافی کافی نہیں﴾

بندوں کے حق کو لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ بس! ایسے ہی معافی صافی کرلو، اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ کسی کی غیر حاضری میں اس کی برائی

کی اب اس سے کہا: بھئی! بولا چالا معاف کرنا، حالانکہ اس کو تو معلوم بھی نہیں کہ میری غیبت کی ہے۔

﴿حقوق العباد کی معافی کا طریقہ﴾

حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ تفصیل بتلانی پڑے گی کہ میں نے تمہاری غیبت کی تھی، لہٰذا اب مہربانی کردو اور معاف کردو۔ بہرحال! یہ جو حقوق ہیں، مالی حق ہے تو مال دے دو، اس پر تہمت لگائی ہے تو اپنے آپ کو پیش کردو، اسلامی حکومت ہے اور کسی پر زنا کی تہمت لگائی تو اس تہمت لگانے والے کو سزا میں اسّی (۸۰) کوڑے لگائے جاتے ہیں، یہ تہمت کی حد اور سزا ہے، وہ اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کردے یا پھر مال ہے تو دے دو، ورنہ معاف کراؤ۔

﴿قیامت میں اعزہ ہی ساتھ چھوڑ دیں گے﴾

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: کسی کا کسی پر حق ہے تو دنیا میں معاف کرالے؛ ورنہ آخرت میں کوئی معاف کرنے والا نہیں ہے، وہاں تو رشتہ دار اور اعزہ بھی معاف نہیں کریں گے، ماں بھی معاف نہیں کرے گی، باپ بھی معاف نہیں کرے گا، بھائی اور بیوی بھی نہیں ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ (سورۂ عبس پ۳۰)﴾ انہیں رشتہ داروں سے آدمی بھاگے گا۔ اور بھاگنا بھی چاہیے۔ غیروں کے ساتھ زیادہ معاملہ پڑتا نہیں ہے، ماں کے ساتھ، باپ کے ساتھ، بھائی کے ساتھ، بیوی کے ساتھ، گھر والوں کے ساتھ، اعزہ واقارب کے ساتھ زیادہ معاملہ پڑتا ہے، لہٰذا انہیں کے لین دین تو باقی ہیں، کل قیامت کے روز حساب کتاب لینے کو وہی

تو اٹھیں گے، انہیں کو دیکھ کر آدمی بھاگے گا کہ وہ آئے۔ پرایوں کو دیکھ کر بھاگنے کا کوئی زیادہ سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔

بہرحال! اگر حق بندے سے متعلق ہے تو توبہ کے قبول ہونے کے لئے یہ چار شرطیں ضروری ہیں۔ مثلاً کسی کی غیبت کی۔ غیبت یہ بندے کا حق ہے، یاد رکھنا۔ شراب پینا تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے یعنی وہ ہے تو کبیرہ گناہ۔ لیکن اس میں یہ ہے کہ آپ رات کے اندھیرے میں اُٹھ کر آنسو بہا کر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلیں اور پکا ارادہ کرلیں کہ آئندہ نہیں کریں گے اور جو ہوا اس پر ندامت کرلیں گے؛ تو توبہ قبول ہوگئی۔ اب کوئی چوتھی بات نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی کی غیبت کی ہے تو ان تین کے ساتھ چوتھی بات یہ بھی ہے کہ جس کی غیبت کی ہے اس کے پاس جا کر معاف کرائیں، اس سے کہیں کہ مَیں نے آپ کی غیبت کی تھی، معاف کردو، اور وہ معاف کرے گا تو معاف ہوگا، ورنہ اس کے بغیر معاف ہونے والا نہیں ہے۔

حاجی معافی کس طرح مانگے؟

بعض لوگ حج میں جاتے ہیں اور پہلے سے کسی کے کچھ پیسے کھا رکھے ہیں، جانے سے پہلے جب اس سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: بھائی! کچھ لین دین باقی رہ گیا ہو؛ تو معاف کردینا۔ یہ درست نہیں ہے۔ باقاعدہ بات صاف کرے کہ تمہارا حساب کتاب اور کچھ لینا دینا باقی ہو تو بولو، یا رقم یاد ہو تو خود کہے کہ تمہارے اتنے پیسے باقی ہیں، مَیں ادا کرتا ہوں، یا مجھ میں ادا کرنے کی طاقت نہیں ہے، معاف کردو، اور وہ معاف کرے تب معاف ہوں گے۔ باقی ایسے ہی اوپر اوپر کہا تو اس سے معاف ہونے والے نہیں۔ ایسے ہی مالی حقوق

جتنے بھی ہیں وہ کسی کے شرما حضوری میں معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتے۔ حدیث پاک میں ہے ﴿لایَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبَۃٍ مِّن نَّفْسِہٖ﴾ کہ مسلمان کا مال حلال نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنی دلی خوشنودی کے ساتھ پیش نہ کرے، اس پر تو بہت سارے مسائل مرتب ہوتے ہیں۔

بہرحال! بعض لوگ بیوی کا مہر معاف کروالیتے ہیں، خوشی ناخوشی اس سے بلوالیتے ہیں کہ معاف کردے۔ حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے لکھا ہے کہ صرف اس سے معاف نہیں ہوتا ہے۔

بہرحال! یہ توبہ کی چار شرطیں ہیں جو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہیں۔ اسی پر آج اس مجلس کو ختم کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توبہ کی حقیقت سے مالا مال فرمائے۔ آمین۔

توبہ
و
تکمیل توبہ

﴿ مجلس ۲ ﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. امابعد.

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: وَاللّٰہِ اِنِّی لَأَسْتَغْفِرُاللّٰہَ وَأَتُوبُ اِلَیْہِ فِی الْیَوْمِ اَکْثَرَمِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم استغفار کیوں کرتے تھے؟

توبہ کے سلسلے میں کچھ روایتیں باقی رہ گئی تھیں ان کو پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوارشادفرماتے ہوئے سنا کہ اللہ کی قسم! مَیں دن میں ستّر سے زیادہ مرتبہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اوراس کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔

حضرت اغربن یسارمزنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرواورتوبہ کرواوراپنے گناہوں سے معافی مانگواس لئے کہ مَیں سومرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا ہوں اورتوبہ کرتا ہوں۔ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپناعمل بتایا کہ ستّر (۷۰) سے زیادہ مرتبہ استغفارکرتا ہوں اوردوسری روایت میں سو(۱۰۰) مرتبہ بتلایا، تطبیق یہ ہوئی کہ ستّر (۷۰) سے زیادہ میں سو(۱۰۰) کاعدد آ ہی جاتا ہے ستر (۷۰)

سے زیادہ کتنی مرتبہ استغفار کرتے تھے، یہ سو(۱۰۰) والی روایت نے بتلا دیا۔

نبی کریم ﷺ تو معصوم تھے اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ''قدغفر اللہ لک ماتقدم من ذنبک وماتأخر'' کی بشارت سنادی گئی تھی۔اس لئے درحقیقت آپ کوتوبہ واستغفار کی ضرورت نہیں تھی لیکن نبی کریم ﷺ کے استغفار کرنے کی چندوجوہات ہیں۔ایک توامت کے لئے عملی نمونہ پیش کرنا ہے۔اوردوسراامت کوتعلیم دینا مقصود ہے کہ حضوراکرم ﷺ اپنی معصومیت اور مغفرت کی بشارت سنائے جانے کے باوجود بھی جب اتنا اہتمام فرماتے ہیں تو پھرامتیوں کواس کا کتنا اہتمام کرنا چاہیے۔اور بعضوں نے یہ توجیہ بھی فرمائی ہے کہ چونکہ ہرآن آپ کے درجات میں ترقی ہوتی رہتی تھی اور ہر وقت آپ اوپر کے درجات کی طرف بڑھتے رہتے تھے،توجب اوپر کے درجے پر پہنچتے تھے تو نیچے کے درجے کوکم سمجھتے ہوئے اس سے توبہ ومغفرت کی نوبت آتی تھی۔

خادم رسول حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مختصر حالات

وعن أبی حمزۃأنس بن مالک الأنصاری رضی اللہ عنہ خادم رسول اللہ ﷺ قال قال رسول اللہ ﷺ :أَللّٰهُ أَفْرَحُ بِتَوْبَةِ عَبْدِهٖ مِنْ أَحَدِكُمْ سَقَطَ عَلٰى بَعِيْرِهٖ وَقَدْأَضَلَّهُ فِیْ أَرْضٍ فَلَاةٍ

نبی کریم ﷺ کے خادم ابوحمزہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی دس سال خدمت کی ہے۔جب نبی کریم ﷺ ہجرت فرماکرمدینہ منورہ تشریف لائے توحضوراکرم ﷺ نے حضرت ابوطلحہ سے فرمایا:تمہارے گھر کا کوئی چھوٹا بچہ ہوتوہمارے گھر کے کام کاج کے لئے دےدو۔حضرت انس فرماتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ مجھے سواری پراپنے پیچھے بٹھا کرنبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے گئے اور مجھے

آپ کے حوالے کیا کہ یہ آپ کی خدمت کے لئے ہے۔اس وقت حضرت انس کی عمر دس سال کی تھی اور دس سال انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت کی، نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عمر بیس سال کی تھی۔حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے سوتیلے والد ہوتے تھے، ان کے والد کا تو انتقال ہو گیا تھا اس کے بعد ان کی والدہ ام سلیم نے حضرت ابوطلحہ سے نکاح کیا تھا اس لئے وہ ان کے سوتیلے ابا ہوتے تھے۔

بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میری والدہ، خالہ، نانی وغیرہ گھر کی عورتیں مجھ سے پابندی کرواتی تھیں۔چونکہ بچوں کی طرف سے غفلت تو ہو ہی جاتی ہے۔فرماتے ہیں کہ مجھے یہ عورتیں تاکید کر کے نبی کریم ﷺ کے پاس بھیجتی رہتی تھیں اگر مَیں ادھر اُدھر ہو جاتا تو میرا خیال رکھا جاتا تھا اور وہاں بھیجا جاتا تھا اور مَیں نے دس سال خدمت کی، نبی کریم ﷺ نے مجھ سے کسی کرنے کے لئے کہے گئے کام کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ یہ کیوں نہیں کیا۔اور نہیں کرنے کے لئے کہے گئے کام کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ یہ کیوں کیا۔یہ نبی کریم ﷺ کی غایتِ شفقت اور اونچے اخلاق کا نمونہ تھا۔ورنہ ظاہر ہے کہ دس سال کے بچے سے فروگذاشت ہونا اور خدمت کے معاملے میں کوتاہی ہونا؛ یہ تو فطری چیز ہے لیکن آپ ﷺ نے کبھی ٹوکا نہیں۔بلکہ کبھی تو حضور ﷺ کسی کام کے لئے فرماتے تو حضرت انس فرماتے ہیں کہ مَیں بچہ ہونے کی وجہ سے کہہ دیتا تھا کہ نہیں جاؤں گا حالانکہ میرے دل میں ہوتا تھا کہ مَیں جاؤں گا،لیکن زبان سے یوں کہتا تھا۔

خیر! یہی حضرت انس جو نبی کریم ﷺ کے خادم تھے ان کی والدہ نے ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ آپ اپنے خادم انس کے لئے دعا کر دیجیے کہ اللہ تعالیٰ

ان کی اولاد میں اور ان کے مال میں اور ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔ چنانچہ ان کی عمر سو سال کے قریب ہوئی اور اخیر میں جن صحابہ کرام کی وفات ہوئی ان میں حضرت انس بھی ہیں۔ اور انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی کئی پشتیں دیکھیں اور اللہ تعالیٰ نے مال میں بھی اتنی برکت دی کہ ان کے باغات سال میں دو مرتبہ پھل دیا کرتے تھے۔ ان کے باغ میں ایک پھول تھا جس کے اندر سے مشک کی خوشبو آیا کرتی تھی۔

﴿بندہ کی توبہ پر اللہ تعالیٰ کتنے خوش ہوتے ہیں﴾

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی آدمی کا اونٹ سفر کے اندر گم ہو گیا، حالانکہ اس کے اوپر سفر کا توشہ، کھانے پینے کا سامان بھی موجود تھا، تلاش کیا لیکن نہیں ملا، پھر اچانک وہ اونٹ اس کو مل گیا تو اس کے ملنے پر اس کو جتنی خوشی ہو سکتی ہے؛ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

چنانچہ اسی چیز کو ایک اور روایت میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے کہ اللہ کی قسم! ''لَلّٰهُ'' کہا گیا، اس میں قسم کے الفاظ محذوف مانے جاتے ہیں۔ عبارت یوں ہو جائے گی ﴿وَاللّٰهِ لَلّٰهُ﴾ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں اپنے بندے کی توبہ سے، جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع وتوبہ کرتا ہے، تم میں سے اس آدمی کی خوشی سے زیادہ جو کسی بنجر زمین وصحراء میں ہو اور اس کی سواری کا اونٹ گم ہو گیا، حالانکہ اس کا کھانے پینے کا سامان اسی کے اوپر تھا، اس کو تلاش بھی کیا، لیکن نہیں ملا اور اس کی طرف سے مایوس ہو گیا اور اب تو یہ سمجھ کر کے کہ موت ہی آنے والی ہے ایک درخت کے پاس آ کر اس کے سایہ میں سو گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: وہ اسی طرح لیٹا ہوا تھا کہ اچانک کیا دیکھتا ہے کہ

وہ اونٹ اس کے پاس آ گیا اور فوراً اس نے اس کی نکیل پکڑ لی اور مارے خوشی کے کہنے لگا کہ اے اللہ! تو میرا بندہ، مَیں تیرا پروردگار۔ اصل میں تو اُلٹا کہنا چاہیے کہ میں تیرا بندہ اور تو میرا پروردگار ہے۔ لیکن خوشی کی شدت کی بنا پر اس کی زبان قابو میں نہیں رہی۔ سوچئے! اس کی خوشی کا کیا عالم ہوگا۔ تو اسی طرح جب کوئی بندہ توبہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

دیکھئے! اللہ تعالیٰ کی شفقت و رحمت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ حالانکہ اللہ تو مالک الملک ہیں اور غنی ہیں، ان کو بندوں کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود بندہ جب توبہ کرکے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کتنے خوش ہوتے ہیں۔ اب بندے کو خود کتنا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے، اس کا اندازہ لگائیے۔

﴿اللہ تعالیٰ اپنا ہاتھ بڑھاتے ہیں﴾

وعن أبی موسیٰ عبد اللّٰہ بن قیس الأشعری رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: اِنَّ اللّٰہَ تَعَالیٰ یَبْسُطُ یَدَہٗ بِاللَّیْلِ لِیَتُوْبَ مُسِیْءُ النَّھَارِ وَیَبْسُطُ یَدَہٗ بِالنَّھَارِ لِیَتُوْبَ مُسِیْءُ اللَّیْلِ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِن مَّغْرِبِھَا.

وعن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: مَنْ تَابَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِن مَّغْرِبِھَا تَابَ اللّٰہُ عَلَیْہِ.

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جن کا نام عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ ہے۔ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ بڑھاتے ہیں یعنی بندوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تاکہ دن کا گناہ کرنے والا رجوع کرے اور توبہ کرے، اور دن میں

اپنے ہاتھ کو بڑھاتے ہیں یعنی متوجہ ہوتے ہیں تاکہ رات کا گنہگار توبہ کرلے؛ یہاں تک کہ سورج مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سورج کے جانب مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے جو بھی توبہ کرے گا اللہ تعالی اس کی توبہ قبول کریں گے۔ قیامت کے قریب سورج مشرق کی جانب سے طلوع ہونے کے بجائے جانبِ مغرب سے طلوع ہوگا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سورج جب غروب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہوتا ہے، سجدہ ریز ہوتا ہے اور پھر آئندہ از سرِ نو چلنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے اجازت مانگتا ہے، جب اجازت دی جاتی ہے تو پھر وہ نیا دورہ شروع کرتا ہے، قیامت کے قریب جب وہ اجازت مانگے گا تو اس کو یوں کہا جائے گا کہ جدھر سے آیا ہے اس طرف ہی لوٹ جاؤ، تو وہ جانب مغرب سے طلوع ہوگا، اور جب وہ مغرب سے طلوع ہوگا تو کسی کی توبہ قبول نہیں ہوگی، وہاں تک توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور خود اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بندوں کی طرف خاص رحمت اور فضل و کرم کی عنایت وتوجہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ بندے کو فرماتے ہیں کہ توبہ کرلے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا غایت فضل ہے ورنہ دنیا میں کون ایسا ہے؟ اگر کسی کا بیٹا بار بار قصور کرے اور معافی مانگے تو باپ بھی کتنی مرتبہ معاف کرے گا؟ ایک مرتبہ، دو مرتبہ، تین مرتبہ، چھ مرتبہ، اگر بہت زیادہ نرم ہوگا تو دس یا پندرہ مرتبہ معاف کرے گا، اس کے بعد کہہ دے گا کہ بس بیٹا! اب تم جاؤ۔ ہمارا تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ دوسروں کا تو کیا کہنا، یہ حال انسانوں کا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ جب

تک بندہ توبہ کرتا رہے گا؛ وہ قبول فرماتے رہیں گے۔

﴿ پھراس کی توبہ قبول نہیں ہوتی ﴾

وعن ابی عبدالرحمن عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ یَقْبَلُ تَوْبَۃَ الْعَبْدِ مَالَمْ یُغَرْغِرْ.

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ کو قبول کرتے ہیں جب تک کہ اس کی جان حلق میں نہ آئے۔ ''غرغرہ'' اصل میں کہتے ہیں کہ پانی کو حلق میں لے جا کر اس کو اوپر نیچے کرنا۔ اسی طرح سے آدمی کی روح نکلنے کا جب وقت آتا ہے تو روح حلق میں آتی ہے اس سے پہلے تک اللہ تعالیٰ آدمی کی توبہ کو قبول کرتے ہیں اور اخیر میں جب نزع والی کیفیت شروع ہو جاتی ہے اس کے بعد اگر کوئی توبہ کرے تو پھر اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔

﴿ طلب علم کی فضیلت ﴾

وعن زربن حبیش قال: أَتَیْتُ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّال رضی اللہ عنہ: أَسْئَلُہُ عَنِ الْمَسْحِ عَلیٰ الْخُفَّیْنِ فَقَالَ: مَاجَاءَ بِکَ یَازِر؟ فَقُلْتُ: اِبْتِغَآءَ الْعِلْمِ. الخ

حضرت زر بن حبیشؒ جو تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں: میں حضرت صفوان بن عسّالؓ کے پاس موزوں پر مسح کے سلسلے میں معلوم کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ حضرت صفوانؓ نے ان کو دیکھ کر پوچھا کہ اے زر! کون سی چیز تم کو میرے پاس لائی؟ کیوں آئے؟ میں نے عرض کیا: علم حاصل کرنے کے لئے اور مسئلہ پوچھنے کے لئے آیا ہوں۔ اس پر انہوں نے فرمایا: کہ فرشتے طالب علم کے لئے، وہ جو علم حاصل کرتا ہے اس پر خوشی اور رضا مندی کا

اظہار کرتے ہوئے اپنے پروں کو بچھاتے ہیں۔ لہٰذا دیکھئے۔ دین کا علم حاصل کرنا یہ کتنی بڑی چیز ہوگئی۔

موزوں پر مسح ثابت ہے

میں نے عرض کیا: پیشاب و پائخانہ کے بعد موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں میرے دل میں کچھ تردد ہے کہ کرنا چاہیے یا نہیں اور چونکہ آپ حضور اکرم ﷺ کے صحابی ہیں اس لئے مَیں آپ کے پاس پوچھنے کے لئے آیا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ اس سلسلے میں آپ کے پاس کچھ معلومات ہوں۔ کیا آپ نے اس سلسلے میں حضور کو کچھ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! جب ہم لوگ سفر میں ہوتے تھے تو حضور اکرم ﷺ ہم کو حکم دیتے تھے کہ تین دن اور تین رات تک ہم موزوں کو نہ نکالیں، سوائے اس کے کہ جنابت کے غسل کی حاجت ہو، البتہ پیشاب پائخانہ اور نیند کی وجہ سے وضو کرنے کے وقت ان کو نکالا نہیں جائیگا

کوشش ہی علامت ہے محبت کے صحیح ہونے کی

میں نے پوچھا: محبت کے سلسلے میں آپ نے حضور کو کچھ فرماتے ہوئے سنا؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! ہم ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے، اسی دوران ایک دیہاتی نے بلند آواز سے حضور کو پکارا: ﴿یـا مُـحَمَّدُ﴾ ویسے تو نام لے کر حضور اکرم ﷺ کو پکارنے سے منع کیا گیا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور کے جو آداب بتلائے ان میں ایک ادب یہ بھی ہے کہ آپ کا نام لے کر نہ پکارا جائے بلکہ آپ کا لقب لے کر پکارا جائے جیسے یا نبی اللہ، یا رسول اللہ وغیرہ، لیکن دیہاتی لوگ ان آداب سے مستثنیٰ تھے، وہ آداب جانتے بھی نہیں تھے اور ان پر کوئی پکڑ دھکڑ بھی نہیں تھی، صحابہ کو البتہ اس کا پابند کیا گیا تھا۔ جب اس

نے آپ کا نام لے کر پکارا تو حضور نے بھی اتنی ہی بلند آواز سے جواب دیا: جی بولو۔ حضرت صفوان جو اس روایت کے راوی ہیں فرماتے ہیں: میں نے اس دیہاتی کو یوں کہا: ہلاکت ہو تیرے لئے! آواز کو ذرا نیچی کر، حضور کے سامنے اتنا زور سے کیوں بولتا ہے؟ حضور کے سامنے بلند آواز سے بولنے سے منع کیا گیا ہے، ﴿لاتـرفعـوا أصـواتـكم فوق صـوت النبي﴾ اس دیہاتی نے کہا: میں آواز نیچی نہیں کروں گا، مَیں تو زور سے ہی بولوں گا۔ پھر اس دیہاتی نے حضور سے سوال کیا کہ ایک آدمی ہے جس کو ایک جماعت کے ساتھ محبت ہے، نیک لوگوں سے اس کو تعلق اور دل میں ربط ہے لیکن ابھی اپنے اعمال کی وجہ سے ان کے درجے تک نہیں پہنچا، مطلب یہ ہے کہ اس کی طرف سے کوشش جاری ہے، جن کے ساتھ تعلق و محبت ہے ان کے درجے تک پہنچنے کے لئے وہ کوشش تو کر رہا ہے لیکن ابھی تک وہاں پہنچا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی طرف سے کوشش ہونا ضروری ہے، صرف محبت کافی نہیں، اور محبت اسی وقت معتبر ہے جب کہ ساتھ میں کوشش بھی ہو، کوشش ہی علامت ہے محبت کے صحیح ہونے کی، ورنہ تو دعویٰ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: آدمی قیامت کے روز اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کو محبت ہے۔

﴿لمْ اور لمّا کا فرق﴾

(ولـمايلحق بهم) عربی میں لفظ (لَمَّا) اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ کسی چیز کی نفی کی جا رہی ہو لیکن آئندہ اس کے وجود کی توقع ہو۔ جیسے کسی نے پوچھا کہ زید آیا؟ (أجاء زيد؟) تو عربی میں اگر یوں جواب دیں ﴿لـمايجئ﴾ ابھی تک تو نہیں آیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ آنے کی امید ہے اور انتظار ہے لیکن آیا نہیں ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ

''نہیں آیا'' کہہ دیا جائے۔ اور ایک جملہ ہوتا ہے ابھی تک نہیں آیا۔ دونوں میں فرق ہے یہاں پر بھی ﴿لما یلحق بھم﴾ کہا گیا جس کا معنٰی یہ ہے کہ ابھی تک ان کے درجہ کو پہنچا تو نہیں ہے لیکن آئندہ امید ہے۔

﴿توبہ کا دروازہ﴾

حضرت زر بن جبیش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ برابر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہمارے سامنے بیان کرتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے ایک دروازے کا تذکرہ کیا کہ جانبِ مغرب میں شام کی طرف ایک دروازہ ہے جس کی چوڑائی اتنی ہے کہ سوار آدمی چالیس یا ستّر سال تک اس کے اندر چلتا رہے؛ تب بھی وہ پورا نہیں ہوگا، اتنا چوڑا دروازہ ہے، جس دن سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اس دن سے اس دروازہ کو بھی پیدا کیا، اور وہ توبہ کے واسطے کھلا ہوا ہے، وہ دروازہ بند نہیں کیا جائے گا جب تک کہ سورج جانبِ مغرب سے طلوع نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں توبہ کے لئے کوئی قید نہیں ہے۔ دنیا کے اندر تو ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا سخی ہو اس کے یہاں بھی درخواستوں کو قبول کرنے کے لئے اوقات مقرر ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں توبہ کے لئے وقت کی کوئی تحدید نہیں، جس وقت بندہ اپنی درخواست لے کر پہنچ جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے؛ وہاں دروازہ چوبیس گھنٹے کھلا ہوا ہے۔

﴿مسئلہ پوچھنے کا ایک ادب﴾

وعن أبی سعید سعد بن مالک بن سنان الخدری رضی اللہ عنہ أن نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: كَانَ فِيمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ رَجُلٌ قَتَلَ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ نَفْسًا . . الیٰ آخر الحدیث.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ ان کا نام سعد بن مالک بن سنان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ تم سے اگلی امتوں میں ایک آدمی تھا جس نے ننانوے آدمیوں کا قتل کیا اب اس کو دل میں خیال آیا کہ میں نے اتنے سارے قتل اور گناہ کئے ہیں، اس کے معاف ہونے کی کوئی تدبیر ہو۔ لہٰذا اس نے معلومات حاصل کی کہ اس وقت روئے زمین پر سب سے بڑا عالم کون ہے۔ چنانچہ اس کو ایک راہب کا پتہ دیا گیا۔ اس نے اس راہب کے پاس آ کر کہا: ایک شخص نے ننانوے قتل کئے ہیں ﴿ھل لہٗ من توبۃ؟﴾ کیا اس کے لئے توبہ کی گنجائش ہے؟ یہاں دیکھئے (ھل لی) نہیں پوچھا، بلکہ (ھل لہٗ) کہا۔ ایسے موقع پر پوچھنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے ایسا کیا ہے، کیا حکم ہے؟ حالاں کہ خود نے ہی کیا ہوتا ہے لیکن خود کا نام لینے کے بجائے اس طرح پوچھتے ہیں، یہی طریقہ ہے اور آداب میں سے ہے۔ ان الفاظ سے یہی ادب نکالا گیا ہے کہ یوں کہے کہ ایک آدمی نے ایسا بڑا جرم کیا ہے اس کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے۔

﴿عالم اور عابد کا فرق﴾

اس راہب نے کہا: اس نے ننانوے آدمیوں کا قتل کیا ہے اس کے لئے توبہ کیسی؟ لہٰذا اس شخص نے اس راہب کو بھی نمٹا دیا اور سو پورے کر دیئے۔ اس کے بعد پھر اس کو خیال آیا تو اس نے پوچھا کہ روئے زمین پر کوئی بڑا عالم ہو تو بتاؤ۔ لہٰذا اس کی ایک عالم کی طرف رہنمائی کی گئی۔ دیکھئے! وہ پہلا صرف عابد تھا، اس نے پوچھا تو عالم کے متعلق تھا لیکن لوگوں نے پتہ دیا تھا راہب کا۔ وہ عابد تھا نیک تھا راہب تھا لیکن عالم نہیں تھا۔ اس لئے اس نے ایسا جواب دیا اور ایک آدمی کو مایوس کیا تو مایوسی کے اندر اس نے اس کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ

کیا۔ روایت کے الفاظ ہیں کہ (فدل علی عالم) اب اس کو ایک عالم کا پتہ بتلایا گیا۔ چنانچہ وہ ان کے پاس پہنچا اور پوچھا: ایک آدمی نے سو آدمیوں کا قتل کیا ہے، کیا اس کے لئے توبہ ہے؟ عالم نے جواب دیا: جی ہاں! توبہ ہے۔ وہ کون ہے جو اس کے اور توبہ کے درمیان رکاوٹ بن سکتا ہے؟ توبہ تو ہے ہی اس کے لئے۔ سو قتل کئے تو کیا ہوا؟

توبہ کے لئے ایک تدبیر

ایک کام کر کہ فلاں سرزمین کے اندر اللہ کے نیک بندے رہتے ہیں اور اللہ کی عبادت میں مشغول ہیں، تو وہاں چلا جا اور ان کے ساتھ تو بھی اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جا اور توبہ کرتا رہ؛ تیری توبہ قبول ہو جائے گی۔ گویا توبہ کے قبول ہونے کے لئے سازگار ماحول بھی ہونا چاہیے، اس لئے کہ توبہ میں اصل یہ بھی ہے کہ آدمی اس گناہ سے باز آ جائے اور اس کے اوپر ندامت بھی ہو کہ میں نے یہ کیا کیا اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ عزم ہو، یہ تینوں باتیں توبہ کے اندر ضروری ہیں۔ اور جب تک کہ سازگار ماحول میں نہیں پہنچے گا یہ کیفیت پیدا نہیں ہوگی، اس لئے کہ ظاہر ہے کہ اگر بُرے لوگوں کے ساتھ اسی ماحول میں پڑا رہا تو وہ گناہ ہی نہیں چھوٹے گا، اس ماحول میں رہتے ہوئے تو اس گناہ میں مبتلا ہو ہی جائے گا، گناہ کو چھوڑنے کے لئے اپنے آپ کو اس گندے ماحول سے نکالنا ضروری ہے۔

جہاں توبہ کے اقسام کی تفصیل بتلائی تھی وہاں بتلایا تھا کہ ایک آدمی نجاست کے گھڑے میں پڑا ہے اور وہ پاک ہونا چاہتا ہے تو گھڑے کے اندر پڑا ہوا ہونے کی حالت میں ساری دنیا کا پانی اس پر بہا دیں گے تب بھی وہ پاک ہونے والا نہیں ہے، اس کو کہا جائے گا کہ پہلے اس نجاست کے گھڑے میں سے باہر نکل، اس کے بعد دو بالٹی پانی بھی اس

پر ڈالیں گے؛ تو وہ پاک ہو جائے گا۔

بہر حال! پہلی شرط تو یہ ہے کہ اس گناہ کے ماحول سے اپنے آپ کو نکالے۔ تو اس کو نیک لوگوں کے پاس اسی وجہ سے بھیجا گیا کہ وہاں جاؤ، جب وہ ان نیک لوگوں کے ماحول میں پہنچے گا تو اس کو اپنے بُرا ہونے کا احساس بھی ہوگا کہ آج تک میں نے کیا کیا؟ جب کوئی آدمی بُرائی کے اندر مبتلا ہوتا ہے اور اس کے بعد نیک ماحول اس کو میسّر آتا ہے تو اس نیک ماحول کو دیکھ کے اپنے پرانے گناہ یاد آتے ہیں اور اس پر ندامت ہوتی ہے کہ دیکھو! یہ اللہ کے بندے تو ہر وقت اطاعت وفرمانبرداری میں مشغول ہیں اور ایک میرا حال تھا کہ میں گناہوں میں مبتلا رہا۔ اسی لئے اس عالم نے اس کو مشورہ دیا کہ فلانی سرزمین میں چلے جاؤ، وہاں اللہ کے نیک بندے اللہ کی عبادت میں مشغول ہیں، تم بھی ان کے ساتھ اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ۔ اور جس سرزمین میں رہتا تھا اور جہاں یہ گناہ کئے تھے وہاں پھر تو جانا ہی مت، وہ بڑی بُری جگہ ہے۔ چنانچہ یہ آدمی وہیں سے چلا اس کے دل میں جذبہ تو تھا ہی، اس لئے گھر واپس نہیں گیا، یہاں تک کہ جب آدھے راستے پر پہنچا، تو اس کو موت آ گئی۔

﴿ندامت کے جذبے کی قدر و قیمت﴾

دیکھو! ابھی تو توبہ کے ارادے سے جا رہا ہے یعنی ایک ندامت کا جذبہ ہے اور اس ارادے سے آگے بڑھ رہا ہے کہ میں اپنے گناہوں سے وہاں جا کر توبہ کروں گا اور موت آ گئی، تب بھی رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے اس کے لئے جھگڑ رہے ہیں عذاب والے فرشتے کہتے ہیں کہ ہم اس کو لے جائیں گے، رحمت والے فرشتے کہتے ہیں

کہ ہم لے جائیں گے، اس لئے کہ یہ تو اللہ کی طرف متوجہ ہو کر توبہ کے ارادے سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اور عذاب والے فرشتے کہنے لگے کہ آج تک کبھی اس نے ایک بھی نیک عمل نہیں کیا۔ ان دونوں میں جھگڑا چل رہا تھا کہ انسانی شکل میں ایک فرشتہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ ان دونوں نے اس کو اپنا فیصل اور حکم بنا دیا۔ اس نے فیصلہ یہ کیا کہ دونوں زمینوں کا ناپ لو، اس کی موت جہاں آئی ہے وہاں سے لیکر جہاں جا رہا تھا -یعنی نیک لوگوں کی بستی کی طرف- وہاں تک کی زمین کتنی ہے اور جہاں سے وہ چلا ہے -یعنی اس کی اپنی بستی- وہ یہاں سے کتنی دور ہے؟ دونوں کو ناپ لو کہ کس زمین سے قریب ہے، جس زمین سے قریب ہو اس کے مطابق تم لوگ لے جانا۔ چنانچہ ناپا گیا تو دیکھا کہ جس بستی کی طرف جا رہا تھا اس سے تھوڑا قریب تھا، چنانچہ رحمت کے فرشتوں نے اس کو اپنے ساتھ لے لیا۔

ایک روایت میں ہے کہ وہ نیک لوگوں کی بستی کی طرف صرف ایک بالشت قریب تھا۔ دیکھو! ابھی توبہ نہیں کی تھی بلکہ صرف ارادہ کیا تھا اور اس طرف قدم اُٹھائے تھے، مگر یہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو گیا اور اس کی مغفرت ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ جب کسی کو قبول کرنا چاہتے ہیں تو......

ایک اور روایت میں یہ ہے کہ اصل میں تو بالکل بیچ ہی میں موت آئی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے گناہ والی بستی کی طرف وحی بھیجی اور اس کو حکم دیا کہ دور ہو جا اور نیک لوگوں والی بستی کی طرف وحی بھیج کر حکم دیا کہ تو قریب ہو جا۔ اب جب ناپا گیا تو نیک لوگوں کی بستی کے قریب نکلا۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کو قبول کرنا چاہتے ہیں تو وہاں سے سارے اسباب مہیّا کئے جاتے ہیں۔ اس لئے آدمی کو اللہ تعالیٰ ہی سے توفیق مانگتے رہنا چاہیے۔ یہاں اس

کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سارے اسباب مہیا کئے گئے۔

گناہوں کی کیا حیثیت ہے؟

بہرحال! آدمی کا محض اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے پر اور توبہ کا ارادہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ معاملہ کیا گیا، اب اس کے بعد بھی کوئی آدمی اپنے متعلق یہ سوچے کہ میں تو بڑا گنہ گار ہوں تو یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ بھائی! تم کتنے بڑے گنہ گار ہو؟ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں کہ تم زمین سے آسمان تک کی فضا کے برابر گناہ لے کر آؤ؛ مَیں اس سے بڑی رحمت لیکر آؤں گا، اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مقابلے میں بندوں کے گناہوں کی کیا حیثیت ہے؟

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں سے ہیں، کراچی میں رہتے تھے۔ ان سے کسی نے یہی کہا تو جواب میں فرمایا کہ یہاں کی اتنی بڑی آبادی ہے اور یہ سب پیشاب پائخانہ کرتے ہیں اور وہ سارا سمندر بحیرۂ عرب میں جاتا ہے اور یہ بحیرۂ عرب تو دنیا کے سمندروں میں چھوٹا شمار ہوتا ہے، اس سے بڑے بڑے سمندر اوقیانوس وغیرہ دنیا میں موجود ہیں۔ تو فرمایا کہ یہ سب وہاں جاتا ہے اور ایک موج آتی ہے تو وہ سب ناپاکی ختم ہو جاتی ہے۔ ایک کروڑ لوگوں کی ناپاکی کے اس سمندر کے اندر جانے کی وجہ سے کیا سمندر ناپاک ہوگیا؟ اس میں نجاست آ گئی؟ نہیں! بلکہ سمندر کی ایک موج نے اس سب کو پاک اور صاف کردیا تو انسانوں کے گناہوں کی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے، آدمی ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلے۔

شیطانی چال میں نہ آوے

لیکن بات دراصل یہ ہے کہ شیطان کی جو چالیں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ گنہ گار بندہ جب توبہ کا ارادہ کرتا ہے تو اس وقت شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ اتنے سارے گناہ تو تو نے گناہ کئے ہیں، کیا منہ لے کے جائے گا؟ تو جواب دو کہ یہی گنہ گار منہ لے کر جاؤں گا اور اپنے گناہوں کو بخشواؤں گا۔ ضرورت اسی کی ہے کہ شیطانی چال میں نہ آوے۔ اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ جب آدمی نیکوں کی صحبت اختیار کرے۔ نیک لوگوں کی صحبت کا کم سے کم اور ادنیٰ فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں اپنے گناہوں کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد پھر توبہ کی توفیق ہوتی ہے اور جب توبہ کر لیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو بھی نیک لوگوں میں شمار کر لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عطا فرماوے

آمین

آہِ سحر گاہی

میں نور کے تڑکے میں جس وقت اٹھا سو کر
اللہ کی رحمت کے دروازے کھلے پائے
آتی تھی صدا پیہم جو مانگنے والا ہو
ہاتھ اپنے عقیدت سے آگے مرے پھیلائے
جس جس کو گناہوں سے بخشش کی تمنا ہو
وہ اپنے گناہوں کی کثرت سے نہ گھبرائے
وہ مائل توبہ ہو میں مائل بخشش ہوں
میں رحم سے بخشوں گا وہ شرم سے پچھتائے
وہ کشتِ طلب بوئے، میں بارشِ رحمت ہوں
میں دیکھ نہیں سکتا کھیتی کوئی مرجھائے
یہ سن کے ہوئے جاری آنکھوں سے مری آنسو
قسمت ہے محبت میں رونا جسے آجائے
آقائے گدا پرور، سائل ہوں ترے در پر
میں اور تو کیا مانگوں تو ہی مجھے مل جائے

توبہ
و
تکمیل توبہ

مجلس ۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تُعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. امابعد.

جنگ تبوک

توبہ کا بیان چل رہا ہے اوراسی مناسبت سے حضرت کعب بن مالکؓ کی روایت پیش فرمارہے ہیں۔ یہ بڑی لمبی روایت ہے، شاید پوری کتاب میں اتنی لمبی کوئی روایت نہیں ہوگی۔ یہ واقعہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر پیش آیا تھا۔ غزوۂ تبوک نبی کریم ﷺ کے غزوات میں آخری غزوہ ہے، ۹ سنہ ھ میں رجب کے مہینہ میں پیش آیا، شام سے نبطی جو زیتون کا تیل فروخت کرنے کے لئے مدینہ منورہ آیا کرتے تھے ان کے ذریعہ سے نبی کریم ﷺ کومعلوم ہوا کہ قیصرِ روم ہرقل نے مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنے کے واسطے ایک فوج روانہ کی ہے اوراس کے متعلق لکھا کہ عرب میں جو نصرانی مذہب اختیار کئے ہوئے تھے، لخم، جذام، قین وغیرہ یہ وہ قبائل ہیں جو جزیرۃ العرب میں شام کی سرحد پر آباد ہیں، تبوک بھی ایک جگہ کا نام ہے، مدینہ منورہ سے دمشق جاتے ہوئے راستہ میں شام کی سرحد کے قریب یہ جگہ آتی ہے، اس زمانہ میں شام قیصر روم کی حکومت میں داخل تھا تو یہاں کے نصرانی عرب نے قیصر کولکھا تھا کہ ہمارے یہاں جو نبی ظاہر ہوئے تھے ان کا انتقال ہو چکا

ہے اوران کے ماننے والے بڑی کشمکش میں مبتلا ہیں اوران پر حملہ کرنے کا یہ بڑا اچھا موقع ہے۔ان لوگوں کی اسی اطلاع کی بنیاد پر قیصر روم نے اپنا ایک لشکر چالیس ہزار کا ایک قباد نامی سپہ سالار کے ماتحتی میں بھیجا اوران میں جوش وخروش پیدا کرنے کے لئے ان کو ایک سال کی پیشگی تنخواہ بھی دے دی۔

نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ قیصر روم نے ایک لشکر روانہ کیا ہے، حالانکہ اگلے ہی سال ۸ ؁ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوا تھا اورآج تک قریش کے ساتھ جو مقابلے ہوتے رہے اس سے نبی کریم ﷺ یک گونہ فارغ ہوکر اطمینان کی سانس لے رہے تھے اوراُدھر یہ اطلاع ملی۔ بہرحال! آپ ﷺ نے سوچا کہ وہ وہاں سے حملہ کر کے مدینہ منورہ پر آویں اس کے بجائے ہم ہی آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کریں۔چنانچہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مقابلے کی تیاری کرنے کا حکم دیا کہ ہم دشمن سے مقابلے کے لئے جارہے ہیں،اس لئے سفر کی تیاری کرلو۔

حضور ﷺ کی عادتِ شریفہ تو یہ تھی کہ جب کسی غزوہ میں جانا ہوتا تھا تو جہاں جانا ہوتا تھا اس کا تعین کے ساتھ تذکرہ نہیں کرتے تھے۔توریہ،اشارہ اورکنایہ میں کوئی بات ارشاد فرمادیا کرتے تھے اور تیاری کا حکم دیتے تھے اور جنگی مصلحتوں کا تقاضہ بھی یہی ہے۔ آج بھی یہی ترکیبیں اختیار کی جاتی ہیں۔لیکن یہ غزوہ ایک ایسا غزوہ تھا کہ ایک بہت بڑے دشمن کے ساتھ مقابلہ تھا،اُس زمانے میں جو دو بڑی اورسوپر پاور طاقتیں سمجھی جاتی تھیں؛ وہ روم اورفارس کی تھی،اس میں سے رومیوں کا معاملہ تھا اوران کی فوجیں بھی بڑی تربیت یافتہ تھیں۔آج تک تو قریش اور قبائل عرب سے مقابلہ رہا،وہ کوئی پروفیشنل

(Professional) لوگ نہیں تھے، اس لائن کی تربیت یافتہ بھی نہیں تھے، لیکن اس کی یہ فوج تو تربیت یافتہ اور اس لائن کی ماہر تھی اور بڑی طاقتور تھی، ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اور دور کا سفر تھا اس لئے نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو پہلے سے ہی بتلا دیا تھا کہ وہاں جانا ہے تاکہ اچھی طرح تیاریاں کرلیں۔

﴿مدینہ منورہ کی صورت حال﴾

اب اتفاق کی بات کہ یہاں مدینہ منورہ میں یہ صورتِ حال تھی کہ اگلا سال تو قحط کا گذرا تھا اور یہ گرمی کا زمانہ تھا اور اسی زمانہ میں کھجوریں پکا کرتی ہیں اور یہ حضرات اگلے سال کے قحط کی وجہ سے اس سال کے موسم کے منتظر بھی تھے اور مدینہ والوں کی عادت تھی اور جہاں کہیں بھی باغات ہوتے ہیں وہاں کے باغات والوں کی عادت ہوتی ہے کہ باغات کے پھلنے کا جب زمانہ آتا ہے تو وہ لوگ اپنے گھروں کی رہائش چھوڑ کر باغ کے گھروں میں منتقل ہوجاتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی آم کے موسم میں باغ والے ایسا ہی کرتے ہیں۔ تو مدینہ والوں کی بھی عادت تھی کہ جب کھجوروں کے پکنے کا زمانہ آتا تھا تو وہ باغوں میں منتقل ہوجاتے تھے، وہاں سایہ بھی بڑا ٹھنڈا ہوتا تھا، پانی بھی ٹھنڈا ملتا تھا اور پھلوں کی بھی حفاظت ہوتی تھی۔ اب لوگ تو ویسے بھی اس وقت کے منتظر تھے اور عین ایسے وقت میں نبی کریم ﷺ نے تیاری کا حکم دیا کہ چلو۔ لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کے لئے تیاریاں شروع کردیں۔ بہت سے وہ جو صاحب استطاعت تھے انہوں نے اپنے طور پر تیاریاں کیں اور بہت سے وہ جن کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ سفر کے لئے تیاری کرسکتے تو ان کے لئے نبی کریم ﷺ نے باقاعدہ اعلان کیا کہ اللہ کے راستے میں دو گویا چندہ کیا اور

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے برابر بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا۔

﴿حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سخاوت﴾

اسی زمانہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک قافلہ دوسو اونٹ کا تجارت کی غرض سے بھیجا تھا وہ پورا دوسو اونٹ مع ساز و سامان کے اور ساتھ میں مزید دو ہزار دینار نقد رقم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش فرمائے۔ سونے کے سکّے تھے، حضور ﷺ اس کو ہاتھ سے اُلٹ پلٹ کر فرما رہے تھے کہ آج کے بعد اگر عثمان کوئی نفل عمل نہ کرے تب بھی ان کے لئے کافی ہے۔ بہر حال! اس موقع پر بہت سے صحابہ نے۔ جن کے پاس پیسے نہیں تھے- محنت مزدوری کی اور جو صاع، آدھا صاع کھجوریں مزدوری کے طور پر ملیں؛ وہ لا کر حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں پیش کیں۔

﴿منافقین کی پول کھول دی﴾

منافقین کا تو کام، دھندا ہی مخلصین کے اوپر طعن و تشنیع اور اعتراض کرنا تھا۔ چنانچہ جنہوں نے بڑی رقمیں پیش کی تھیں ان کے متعلق یہ طعنہ دیا کہ اللہ کے واسطے نہیں بلکہ یہ تو دکھلاوے کے واسطے ہے، تاکہ لوگ یوں کہیں کہ بڑے سخی ہیں۔ اور جنہوں نے ایک صاع اور ایک مُد لا کر پیش کیا تھا ان کے متعلق یہ کہنا شروع کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ ان کے ایک مد یا آدھے صاع کا محتاج تھا ﴿الذین یلمزون المطوعین﴾ والی آیت سورۂ توبہ میں اسی غزوہ کے سارے حالات پر نازل ہوئی، جس میں منافقین کی مختلف چیزوں کو بیان کیا گیا ہے

﴿اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے اوپر رعب ڈال دیا﴾

بہر حال! یہ موقع تھا اور حضور اکرم ﷺ ایک قول کے مطابق چالیس ہزار کا لشکر

لے کر اور ایک قول کے مطابق ستر ہزار کا لشکر لے کر جس میں دس ہزار گھوڑے سوار تھے، اتنا بڑا لشکر مدینہ منورہ سے رجب کے مہینہ میں روانہ ہوئے اور راستہ لمبا تھا۔ تبوک جاتے ہوئے راستہ میں قومِ ثمود کی آبادیاں مقامِ حجر بھی آتی تھیں وہاں سے بھی گذر ہوا اور تبوک میں پہنچ کر نبی کریم ﷺ نے چند روز قیام کیا اور اس انتظار میں رہے کہ ان کا لشکر آوے، لیکن اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے اوپر رعب ڈال دیا۔ خود نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن خصوصیات سے نوازا گیا تھا اس میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ کا رعب ایک مہینے کی مسافت تک پہنچتا تھا۔

بہر حال! دشمن تو مقابلہ پر آیا نہیں، چند روز وہاں قیام رہا اور اس کے بعد نبی کریم ﷺ رمضان المبارک میں واپس تشریف لائے۔ اسی غزوہ کے موقع پر چونکہ لمبا سفر تھا اس وجہ سے منافقین نے اور بعض دیہات کے رہنے والوں نے شرکت نہیں کی تھی۔ منافقین تو مختلف بہانے نکالتے تھے کہ ہمارے گھروں پر کوئی ہے نہیں، جو گھروں کو سنبھالے، اس لئے ہمیں اجازت دیجیے اور بھی قسم قسم کے بہانے تراش کر شریک نہیں ہوئے۔ اور بعض مخلصین مومنین بھی شریک نہیں ہو سکے، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معذور رکھا گیا۔

وہ تین جو جنگ سے غیر حاضر رہے

لیکن جن کے پاس سواری تھی اور سفر کی صلاحیت تھی اس کے باوجود وہ شریک نہیں ہوئے، ان کی ذرا پکڑ دھکڑ ہوئی، انہیں میں سے تین حضرات: حضرت کعب بن مالک، حضرت مرارہ بن ربیع اور حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم تھے، انہیں تینوں کا یہ واقعہ ہے، انہیں

میں سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ خود ہی اس روایت کے راوی ہیں اور وہ خود ہی اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں۔ یہاں توبہ والے باب میں اس مناسبت سے لائے ہیں کہ ان حضرات کی توبہ قبول ہوئی تھی۔

سرگذشت بزبانِ خود

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ اپنے والد کی خدمت میں رہتے تھے اور حضرت کعبؓ جب آخری عمر میں نابینا ہوگئے تھے تو ان کو لانے لے جانے کا کام انجام دیتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو بیان کرتے ہوئے سنا جب وہ غزوۂ تبوک کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہے یعنی شریک نہیں ہوئے۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بھی غزوات فرمائے ان میں سے کسی میں بھی مَیں پیچھے نہیں رہا سوائے غزوۂ تبوک کے۔ البتہ غزوۂ بدر میں بھی مَیں حاضر نہیں تھا۔

یہاں دو غزووں میں غیر حاضری بتلائی اور دونوں کی غیر حاضری کو الگ الگ انداز سے بیان کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر کی غیر حاضری قصداً نہیں تھی۔ آگے اس کی تفصیل آرہی ہے۔ اور غزوۂ تبوک کی غیر حاضری قصداً ہوئی تھی اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ دھکڑ بھی ہوئی تھی، دونوں کی غیر حاضریوں میں فرق تھا اس لئے اس کو بیان کرنے کیلئے انداز بھی الگ الگ اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں بھی غیر حاضر رہا لیکن جو لوگ بھی غزوۂ بدر میں غیر حاضر رہے ان کو کوئی سرزنش نہیں کی گئی، اس پر کوئی ڈانٹ نہیں پڑی۔

بدر کی لڑائی

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ غزوۂ بدر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے باقاعدہ غزوہ کے

ارادے سے نہیں نکلے تھے بلکہ غزوۂ بدر یوں پیش آیا کہ قریش کا ایک قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں تجارت کے لئے شام گیا ہوا تھا، وہاں سے واپس لوٹ رہا تھا، جب نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ وہ جزیرۃ العرب کی حدود میں داخل ہوا تو ایک مرتبہ آپ نے صحابہ کے مجمع میں اپنے ارادے کا اظہار فرمایا کہ قریش کا تجارتی قافلہ واپس لوٹ رہا ہے، کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ان پر قابو نصیب فرمائے، چلو! ہم اس کا تعاقب کریں۔ چنانچہ آپ نے جس مجلس میں یہ بات ارشاد فرمائی تھی اس میں جو لوگ موجود تھے وہ تیار ہو گئے، بہت سے لوگوں نے یوں کہا کہ ہم تیاری کر کے آتے ہیں تو حضور نے فرمایا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے، جو تیار ہیں وہ ہمارے ساتھ چلیں۔ اسی وجہ سے اس غزوہ میں اونٹوں کی تعداد بھی کم تھی اور تلواریں بھی گنی چنی تھیں، لوگوں کے پاس تیر کمان اور بھالے وغیرہ تھے، ایسے حالات میں تین سو تیرہ کی تعداد روانہ ہوئی تھی اور اصل میں تو قافلہ کا تعاقب کرنے کے لئے گئے تھے لیکن وہاں قافلے والوں کو پتہ چل گیا کہ یہ لوگ مدینہ سے نکلے ہیں تو انہوں نے اپنی احتیاطی تدبیریں شروع کیں۔

ایک کام تو انہوں نے یہ کیا کہ مکہ مکرمہ کہلوا دیا کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے، اگر آپ اپنے سامان کو بچانا چاہتے ہو؛ تو مدد کے لئے آؤ۔ اس لئے کہ اس قافلے میں تجارت کا جو سامان تھا سارے مکہ والوں کی پونجی اس کے اندر لگی ہوئی تھی، مکہ کا کوئی گھرانہ ایسا نہیں تھا کہ جس کی پونجی اس قافلہ میں نہ ہو، اس لئے کہ اس زمانے میں عرب میں مضاربت کے طور پر کام کرنے کا رواج تھا، سب گھروں کا سرمایہ تھا اس لئے سب کو فکر تھی، چنانچہ جب وہاں اطلاع ملی تو ابوجہل نے سارے مکہ میں اعلان کروا دیا اور سب کو جمع کر کے مقابلہ

کرنے کے لئے نکالا، وہ سب مل کر ایک ہزار کا لشکر مکہ سے چلا۔ سارا ساز وسامان اور ہتھیار ساتھ تھا اور یہ حضرات تو تین سو تیرہ تھے اور اس میں بھی کوئی تیاری نہیں تھی اس لئے کہ جنگ اور لڑائی ہوگی اس کا ان کو وہم وگمان اور خواب وخیال بھی نہیں تھا۔ تجارتی قافلہ کی تعداد پچاس ساٹھ تھی اس لئے ان کے ساتھ مقابلہ ہوگا ایسا خیال نہیں تھا اور اگر ہوگا تب بھی ایسا زوردار ہوگا اس کی توقع نہیں تھی۔

بہرحال! قافلہ کے سردار ابوسفیان تھے انہوں نے احتیاطی تدبیر کرتے ہوئے راستہ بدل دیا۔ ادھر نبی کریم ﷺ روانہ ہوکر بدر کے قریب پہنچے۔ اور حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ قافلہ تو بچ بچا کر نکل گیا اور جو لشکر مکہ مکرمہ سے آیا تھا اس سے مقابلے کی نوبت آ گئی، گویا یہ سب اچانک ہوگیا اسی لئے بہت سے حضرات صحابہ کی خواہش یہ تھی کہ مقابلہ نہ ہو۔ قرآنِ پاک میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے ﴿وَتَوَدُّوْنَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللهُ أَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ﴾ کہ بہت سے لوگ یہ چاہتے تھے کہ جس میں کوئی تکلیف نہ ہو؛ ایسا معاملہ ہو یعنی قافلہ پر قابو پانے کی نوبت آئے لیکن اللہ تعالیٰ حق و باطل میں مقابلہ کروا کر حق کو غالب کرنا چاہتے تھے؛ اس لئے ان کے نہ چاہنے کے باوجود مقابلے کی نوبت آئی۔

﴿حضرت کعب رضی اللہ عنہ اور بیعتِ عقبہ﴾

پھر حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ اس سے پہلے عقبہ والی رات میں مَیں حاضر تھا۔ عقبہ والی رات سے مراد وہ واقعہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف نہیں لے گئے تھے، اس زمانہ میں حضور اکرم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ حج کے

موقع پر جب مختلف قبائل کے لوگ حج کے لئے آتے تھے تو عرفات اور منیٰ میں آپ ﷺ ان کے اندر گھوم گھوم کر اسلام کی دعوت ان کے سامنے پیش کرتے تھے اور چونکہ مکہ والے آپ کی دعوت کو قبول نہیں کر رہے تھے اور آپ کے کام میں رکاوٹیں ڈالتے تھے اس لئے آپ ﷺ یہ بھی فرماتے تھے: کون ہے جو میرے اس کام میں میری مدد کرے گا اور مجھے اپنے یہاں لے جائے گا؛ تاکہ مَیں اطمینان کے ساتھ وہاں اپنا کام کرسکوں۔

بہر حال! ہوا ایسا کہ نبوت کے گیارہویں سال نبی کریم ﷺ کی ملاقات مدینہ منورہ سے آنے والے حجاج سے ہوئی اور ان کے سامنے آپ نے دعوت پیش کی، انہوں نے کہا: اگلے سال ہم آئیں گے۔ دوسرے سال وہ پھر آئے، ان کی ایک جماعت نے اسلام قبول کیا اور نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر- جمرۂ عقبہ جہاں ہے اسی جگہ پر- بیعت ہوئے اسی لئے اس بیعت کو بیعت العقبہ کہتے ہیں۔ ان حضرات کے ساتھ گفتگو ہوئی، انہوں نے کہا: اگلے سال ہم بڑی تعداد میں آئیں گے، چنانچہ دوسرے سال پھر بڑی تعداد میں ستّر [۷۰] آدمی آئے اور سب نے نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی، آپ نے ان سے کہا: کہ اگر تم لوگ مجھے اپنے یہاں لے جاؤ تو میں وہاں لوگوں کو اسلام کی دعوت اطمینان سے پیش کرسکوں، اس لئے کہ مکہ والے تو میرا ساتھ نہیں دیتے۔ چنانچہ ان لوگوں نے درخواست کی کہ آپ ہمارے یہاں تشریف لائیے اور ہم آپ کا ساتھ دیں گے، اگر کوئی دشمن آپ پر حملہ کرے گا تو ہم آپ کی طرف سے دفاع کریں گے، مگر یہ ساری شرطیں جو ہوئی تھیں وہ مدینہ میں رہتے ہوئے کرنے کی ہوئی تھی، باہر نکلنے کی بات نہیں ہوئی تھی۔

چنانچہ اس موقعہ پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو آپ ﷺ کے چچا تھے وہ بھی آئے اور

انہوں نے مدینہ منورہ سے آئے ہوئے ان لوگوں کو متنبہ کیا کہ دیکھو! تم کس کو اپنے ساتھ لے جارہے ہو؟ ان کو اپنے ساتھ لے جا کر پورے عرب کو تم اپنا دشمن بنارہے ہو، ذرا سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ انہوں نے کہا: ہم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔

بہرحال! ان حضرات نے حضور اکرم ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت بھی کی اور یہ سب باتیں طے بھی ہوئیں اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بھی مدینہ منورہ ہجرت کی اجازت ملی اور مسلمان ہجرت کر کے جانے لگے۔ گویا یہ سارا جو کچھ ہوا اور مدینہ میں اسلام پھیلا اور یہاں آکر اسلام میں جو قوت آئی اور آگے فتوحات کا سلسلہ جاری ہوا؛ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان سب کی بنیاد اور جڑ، اس کا فاؤنڈیشن (Foundation) بیعتِ عقبہ تھی اسی لئے انصار میں سے جو لوگ اس بیعت میں شریک ہوئے تھے، یہ چیز ان کے لئے بہت خصوصیت اور اعزاز کی سمجھی جاتی تھی اور فخر کی چیز شمار کی جاتی تھی اور ان کے لئے یہ کہا جاتا تھا کہ یہ بیعتِ عقبہ والوں میں سے ہیں۔

اسی کو حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ بیعت العقبہ میں بھی حاضر رہا تھا۔ جبکہ ہم نے آپ کے دستِ مبارک پر اسلام کے معاملہ میں عہد و پیمان کیا۔ اب وہ بیعتِ عقبہ کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں کہ کہتے ہیں کہ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے بدلے میں مجھے بدر کی حاضری نصیب ہوئی ہوتی۔ گویا ان کی نگاہوں میں لیلۃ العقبہ والے واقعہ کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ بدر کو بھی وہ اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ حالانکہ نصوص کی اعتبار سے دیکھا جائے تو بدر کی فضیلت اس سے بڑھ کر ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ غزوۂ بدر لوگوں میں زیادہ مشہور ہے۔ خیر! فرماتے ہیں کہ اللہ نے مجھے اس کی بھی توفیق دی تھی۔

تبوک کی لڑائی اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ

اور فرماتے ہیں کہ جب غزوۂ تبوک میں مَیں غیر حاضر رہا تو اُس وقت کا میرا قصہ یہ ہوا کہ اس پہلے کبھی میں اس سے زیادہ مالی اعتبار سے مضبوط اور خوش حال نہیں تھا؛ جتنا غزوۂ تبوک کے موقعہ پر تھا۔ اس سے پہلے کسی غزوے میں میرے پاس سواری کے لئے دو اونٹنیاں جمع نہیں ہوئی تھیں؛ اس غزوہ میں سواری کے قابل دو اونٹنیاں موجود تھیں گویا ایسی فراغت و وسعت اور ایسی خوش حالی کسی اور وقت مجھے نصیب نہیں ہوئی تھی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی غزوے کا ارادہ کرتے تھے تو بطورِ توریہ و اشارہ کے ارشاد فرماتے تھے (جیسا کہ میں بتلا چکا ہوں) البتہ اس غزوہ میں آپ نے صاف صاف بتلا دیا تھا کہ فلاں جگہ جانا ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ غزوہ سخت گرمی کے زمانے میں کیا اور لمبا سفر تھا، بڑے بڑے چٹیل میدان اور صحرا راستے میں پڑتے تھے اور آپ کو دشمن کی بڑی تعداد در پیش تھی، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بات کو چھپانے کے بجائے بالکل کھول کر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا تھا؛ تا کہ وہ اس کے مناسب تیاری کر لیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو واضح طور پر بتلا دیا کہ تبوک جانا ہے اور قیصرِ روم کا مقابلہ کرنا ہے۔ اور اس غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اس لئے کہ آج تک جتنے غزوات ہوئے اس میں آخری فتح مکہ ہوا تھا اور اس موقعہ پر آپ کے ساتھ گیارہ یا بارہ ہزار صحابہ تھے اور اس غزوۂ تبوک کے موقعہ پر ایک قول کے مطابق کم سے کم تعداد چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) کی اور زیادہ سے زیادہ ستر ہزار (۷۰۰۰۰) کی آتی ہے، اور کوئی رجسٹر بھی نہیں تھا کہ جس میں باقاعدہ سب کے نام درج کئے جاتے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ جس زمانے میں یہ روایت بیان کررہے ہیں وہ تو بہت بعد کا زمانہ ہے، حضرت عمر نے اپنے دورِ خلافت میں حکومت کے ضوابط مقرر کئے تھے، اس سے پہلے رجسٹر وغیرہ کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ جب حضرت کعب یہ واقعہ بیان کررہے ہیں اس وقت تو رجسٹروں کا رواج ہو چکا تھا، اسی لئے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں کوئی رجسٹر نہیں ہوتا تھا کہ ہر جانے والے کا نام اس میں درج کیا جاتا؛ تاکہ پتہ چلے کہ کون جارہا ہے اور کون نہیں، اس لئے اگر کوئی غیر حاضر رہنا چاہتا تو اس کو یہ خیال ہوتا کہ میری غیر حاضری کا پتہ نہیں چلے گا۔ اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آجائے اور حضور کو بذریعہ وحی بتلا دیا جائے کہ فلاں غیر حاضر ہے تو بات دوسری ہے، ورنہ تو اتنی بڑی تعداد تھی اور رجسٹر کا رواج نہیں تھا اس لئے کوئی غیر حاضر رہنا چاہے تو کسی کو پتہ نہ چلے۔

کہتے ہیں کہ یہ غزوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے زمانے میں کیا جب کہ پھل پکے تھے اور سائے بھی اچھے ہورہے تھے، اور میری طبیعت کا رجحان ادھر زیادہ ہوگیا کہ باغات میں رہنے کا زمانہ آیا اور یہ سفر ہورہا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام مسلمانوں نے سفر کی تیاری کی، مَیں بھی روزانہ صبح کو سوچتا تھا کہ تیاری کرلوں اور شام ہوتی تھی اور کوئی فیصلہ نہیں کرپاتا تھا۔ یعنی آج کل کرتا رہتا تھا اور مَیں اپنے جی میں یوں سوچتا تھا کہ جب بھی ارادہ ہوجائے گا؛ تیار ہوجاؤں گا، سارا سامان موجود ہے، دیر کیا لگتی ہے۔

جس کے پاس سامان موجود ہوتا ہے وہ بڑا بے فکر ہوتا ہے اور جس کے پاس نہیں ہوتا وہ جلدی سے فکر کرتا ہے۔

چنانچہ اسی طرح تاخیر ہوتی رہی یہاں تک کہ باقاعدہ جانے کا وقت آگیا یعنی

اب تک تو باتیں ہو رہی تھیں اب تو روانگی کا وقت آ گیا۔ چنانچہ آپ ﷺ روانہ ہونے لگے اور ساتھ میں مسلمان بھی روانہ ہوئے اور سامان کے سلسلے میں مَیں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا یعنی تیاری نہیں کر پایا۔ پھر صبح ہوئی اور واپس گھر آیا اور کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ اور اس زمانے میں سفر تیز نہیں ہوتا تھا اور پھر بڑا مجمع ہو تو اور دھیرے دھیرے جاتا ہے تو میں اپنے جی میں یوں سوچتا تھا کہ کل تیار ہو کر سواری پر نکلوں گا اور تیزی سے جا کر قافلے سے مل لوں گا۔

فرماتے ہیں کہ اسی طرح برابر تاخیر ہوتی رہی یہاں تک کہ وہ لوگ آگے نکل گئے اور غزوہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا یعنی اس میں حاضری نہیں ہوئی۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ مَیں نکلوں اور کسی بھی طرح جا کر ان کو پا لوں، کاش کہ مَیں ایسا کرتا، لیکن یہ چیز میرے لئے تقدیر میں نہیں لکھی تھی۔

کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد جب مَیں مدینہ منورہ میں باہر نکلتا تھا تو یہ بات مجھے بڑی غمگین کرتی تھی کہ مَیں اپنے لئے کوئی نمونہ نہیں دیکھتا تھا یعنی میرے جیسا کوئی نظر نہیں آتا تھا کہ جس کو دیکھ کر اطمینان ہو کہ یہ بھی نہیں گیا اور میں بھی نہیں گیا؛ چلو! برابر ہے۔ فارسی میں کہاوت ہے: ''مرگِ انبوہ جشنے دارد'' کہ جماعتی شکل میں موت ہو تو وہ بھی ایک جشن کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی ناگوار چیز جب کئی لوگوں کو پیش آتی ہے تو آدمی کے لئے اس کا برداشت کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔

حضرت کعب فرماتے ہیں: مجھے کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا تھا کہ جس کو دیکھ کر میرے دل کو یوں ہو کہ یہ بھی نہیں گیا ہے، میں بھی نہیں گیا؛ چلو! کوئی حرج نہیں۔ ایسا کوئی نمونہ نہیں دیکھتا تھا سوائے اس کے کہ جن پر نفاق کی تہمت ہوتی تھی یا ایسا آدمی جس کو

اللہ تعالیٰ نے ضعف کی وجہ سے معذور قرار دیا ہو، دو ہی قسم کے لوگ مجھے نظر آتے تھے، ایک تو وہ جن کے اندر سفر میں جانے کی طاقت نہیں تھی یا ایسے جن کے متعلق سب جانتے تھے کہ یہ منافقین میں سے ہیں۔ چھپائیلا کاٹلا (છપાયલા કાટલા) ہے۔

فرماتے ہیں کہ پورے راستے میں نبی کریم ﷺ نے مجھے یاد نہیں فرمایا، یہاں تک کہ تبوک پہنچ گئے۔ اب تبوک میں تو کئی روز قیام رہا، بیس پچیس دن آپ تبوک میں ٹھہرے تھے، وہاں کوئی کام تو تھا نہیں، صرف اس کا انتظار تھا کہ دشمن آوے تو مقابلہ کریں گے، جب اور کوئی کام تھا نہیں؛ تو صبح سے شام کیا ہوتا؟ حضور ﷺ کی مجلس ہوا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ مجلس لگی ہوتی تھی تو حضور نے فرمایا: کعب بن مالک کا کیا ہے، وہ نظر نہیں آتے؟ حضرت کعب رضی اللہ عنہ انصار کے قبیلہ بنو سلمہ سے تعلق رکھتے ہیں تو انہیں کے قبیلہ کے ایک آدمی نے حضور کا یہ ارشاد سن کر کہا: یا رسول اللہ! اس کو اپنی چادروں کی خوبی نے روک لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تو اپنی خود پسندی میں ایسا مست ہے کہ اس کو یہاں آنے کی فرصت کہاں؟ وہ تو ٹھاٹ سے گھومتا پھرتا ہے، اس لئے وہ آ نہیں سکا۔ گویا اس آدمی نے ان کی کمزوری بیان کرتے ہوئے یہ بات کہی، تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فوراً اس آدمی کو ٹوکا کہ تو نے غلط بات کہی، یا رسول اللہ! ہم تو کعب بن مالک کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ اگر کسی مجلس میں کسی مومن کا تذکرہ برائی کے ساتھ ہو تو دوسروں کو چاہیے کہ اس طرف سے ڈفینس (Difence) اور دفاع کریں۔

مجلس میں کسی مومن کی برائی کی جائے تو کیا کرے؟

اسی لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: کسی مجلس میں مومن کا

برائی کے ساتھ تذکرہ ہو؛ تو دوسروں کی ذمہ داری ہے کہ اس کا دفاع کریں، اگر طاقت ہوتے ہوئے بھی وہ دفاع نہیں کریں گے تو کل کو قیامت میں اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے شاملِ حال نہیں ہوگی۔ گویا ایمانی رشتہ کا یہ تقاضہ ہے، لیکن آج کل یہ بات نہیں رہی۔ آج تو یہ مزاج بنتا جارہا ہے کہ اگر کوئی کسی کی برائی کرتا ہے تو ہمیں بھی بڑی اچھی لگتی ہے، ذرا اور ہوا دیتے ہیں اور اگر اس نے دو باتیں کہی ہوں تو چار اور اس کے منہ سے نکلواتے ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے۔

﴿تم تو اور کھولو گے﴾

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ اپنے حواریوں سے کہا: تمہارا بھائی سو رہا ہو اور ہوا کی وجہ سے اس کا کپڑا ہٹ جائے اور ستر کھل جائے؛ تو تم کیا کرو گے؟ حواریوں نے کہا: ہم اس کو ڈھانپ دیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: نہیں! تم تو اور کھولو گے۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم ایسا کر سکتے ہیں؟ فرمایا: تم ایسا کرتے ہو، تمہارے کسی بھائی کی کوئی چیز تمہارے کانوں میں پڑتی ہے تو اس کو چھپانے کے بجائے اور ہوا دے کر لوگوں میں پھیلاتے ہو کہ اس نے ایسا کیا، یہ اس کو ننگا کرنا نہیں ہوا تو اور کیا ہوا؟ ہمارا مزاج بھی ایسا ہی بن گیا ہے، ہم کو اس کے بغیر چین نہیں پڑتا، ہم کو وہی اچھا لگتا ہے۔ کسی کی بات ڈھکی چھپی رہے؛ اس کو ہم پسند نہیں کرتے۔

خیر! حضرت کعب فرماتے ہیں کہ اس مجلس میں حضرت معاذ بن جبل بھی تھے جو اسی بنوسلمہ قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے فوراً اُس آدمی کو ٹوکا۔ خیر! یہ تو تذکرہ ہوگیا۔ یعنی گویا یہ یوں سمجھتے تھے کہ میں چھپا رہوں گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ حضور کے سامنے آ گیا کہ

وہ آئے نہیں ہیں۔ خیر! حضور تو خاموش ہو گئے اور کچھ بولے نہیں۔

﴿جنگ تبوک اور حضرت ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ﴾

کہتے ہیں: حضور ﷺ وہاں تبوک میں قیام پذیر تھے کہ دور سے سفید لباس میں ایک آدمی کو آتا ہوا دیکھا جن کے آنے کی وجہ سے سراب ہٹ رہی تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ چٹیل میدان یا ریتیلی جگہ ہوتی ہے اور تیز دھوپ پڑ رہی ہوتی ہے تو دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پانی بہہ رہا ہے اور اسی جگہ سے اگر کوئی آ رہا ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا اس پانی کو کاٹتے ہوئے آ رہا ہے؛ اسی کو سراب کہتے ہیں۔ تو دور سے ایک آدمی کو آتا ہوا جب دیکھا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿کن أباخیثمة﴾ ابوخیثمہ ہو جاؤ۔

حضرت ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں جو غزوہ میں نہیں آئے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں غزوہ میں شریک نہیں ہوا تھا، ایک روز ایسا ہوا کہ میں اپنے باغ میں تھا اور پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا، بیوی نے میرے سامنے کھانا رکھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں تھی کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ تو انصاف کی بات نہیں ہے کہ مَیں یہاں ٹھنڈی چھاؤں کے اندر اس طرح آرام سے بیٹھوں اور اللہ کے رسول ﷺ دھوپ کی تیزی میں اللہ کے راستے میں سفر کر رہے ہیں، بس! مَیں اسی وقت اُٹھا، سواری کا اونٹ لیا اور سوار ہو کر وہاں پہنچ گیا، یہ اکیلے پہنچے تھے۔ انھیں کو دیکھ کر حضور نے فرمایا: ﴿کن أباخیثمة﴾ ابوخیثمہ ہو جاؤ یعنی ابوخیثمہ معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ وہ ابوخیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ یہ وہی صحابی تھے جنھوں نے ایک صاع کھجور چندہ میں دی تھی اور منافقین نے طعن و تشنیع کی تھی کہ کیا اللہ تعالیٰ ان کے ایک صاع کے محتاج ہیں۔

خیر! اب غزوہ تو ہوا نہیں اس لئے کہ دشمن نہیں آیا، پچیس روز قیام کے بعد حضور وہاں سے واپس لوٹے۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: جب مجھے اطلاع ملی کہ نبی کریم ﷺ تبوک سے واپس لوٹنے لگے ہیں تو مجھے میرا غم لاحق ہوا یعنی فکر ہوئی کہ آپ مدینہ تشریف لائیں گے تو مَیں کیا منہ دکھاؤں گا اور کیا جواب دوں گا؟ کہتے ہیں: میں اپنے جی میں جھوٹے بہانے سوچنے لگا کہ ایسا کون سا بہانہ ہوسکتا ہے کہ جس کی وجہ سے میں حضور ﷺ کی ناراضگی سے اپنے آپ کو بچاؤں اور اس معاملہ میں اپنے خاندان کے ہر ذی رائے سے مشورہ اور مدد بھی چاہنے لگا کہ بھائی! بتاؤ! میرا مسئلہ حل کرو۔

اور جب مجھے یہ بتایا گیا کہ بس! نبی کریم ﷺ آیا ہی چاہتے ہیں تو سارے غلط خیالات جو میرے دل و دماغ میں گھوم رہے تھے؛ وہ سب نکل گئے، یہاں تک کہ مجھے اپنے دل میں اس بات کا یقین ہوگیا کہ میں حضور کی ناراضگی سے کسی چیز سے بھی بچ نہیں سکتا اور نجات نہیں پاسکتا، اس لئے مَیں نے دل میں طے کرلیا کہ جو سچ سچ ہے وہی بتانا ہے، کوئی جھوٹا بہانہ نہیں کرنا ہے۔

﴿تبوک سے حضور ﷺ کی واپسی﴾

چنانچہ دوسرے روز صبح کو نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لے آئے اور حضور کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب کسی سفر سے لوٹتے تھے تو عام طور پر طلوعِ شمس کے بعد چاشت کے وقت تشریف لاتے تھے اور سیدھے مسجد تشریف لے جاتے تھے وہاں دو رکعت نماز ادا فرماتے تھے اور اس کے بعد وہاں پر ہی بیٹھتے تھے تاکہ ملاقات کرنے والے ملاقات کرلیں، چنانچہ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ منافقین میں سے جو لوگ یہاں رہ گئے تھے وہ

آنے لگے اور اپنے اعذار آپ ﷺ کے سامنے پیش کرتے تھے کہ اے اللہ کے رسول! ایسا ہوا، ویسا ہوا؛ اس لئے میں تو نہیں آسکا اور قسمیں کھا کر اپنے عذر بیان کرتے، چنانچہ حضور کی عادتِ شریفہ بھی یہی تھی کہ جو کوئی جو بات کہتا آپ اندر کی کھود کرید نہیں فرماتے۔ وہ جو کہتا آپ مان لیتے۔ چنانچہ انہوں نے جو عذر پیش کئے حضور نے مان لئے کہ ٹھیک ہے اور بیعت کی تجدید بھی کر لی اور ان کے لئے دعائے مغفرت بھی فرمائی اور اندرونی معاملے کو اللہ کے سپرد کیا، ظاہر کو قبول کر لیا، دعا بھی فرمائی اور ہر ایک کو اس طرح رخصت فرمانے لگے، اور ایسے منافقین کی تعداد اسّی [۸۰] سے کچھ زیادہ تھی۔

ناراضگی کی مسکراہٹ

یہاں تک کہ مَیں آیا جب میں نے حضور اکرم ﷺ کو سلام کیا تو ایک ناراض آدمی جیسا مسکراتا ہے؛ آپ ایسے مسکرائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ناراضگی کی مسکراہٹ بھی ہوتی ہے، وہ تو جس کے سامنے ہوتی ہے؛ وہ جان لیتا ہے کہ یہ کیسی ہے؟ کسی کو زبان سے بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ خود سمجھ لیتا ہے۔

معاملہ تو آپ کا ہے

(**ثم قال: تعال**) جب مَیں نے سلام کیا تو آپ نے فرمایا کہ ادھر آؤ، چنانچہ میں آگے بڑھا یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا۔ حضور نے پوچھا: کیوں بھائی! کیوں نہیں آئے؟ کونسی چیز نے تمہیں غیر حاضر رکھا؟ کیا تم نے سواری کا جانور نہیں خریدا تھا؟ حضرت کعبؓ کہتے ہیں: یارسول اللہ! اللہ کی قسم! اگر آپ کے علاوہ دنیاداروں میں سے کسی کے سامنے بیٹھا ہوتا؛ تو مَیں اپنے آپ کو ایسا پاتا کہ کوئی نہ کوئی عذر بیان کر کے اس کی

ناراضگی سے اپنے آپ کو بچا لیتا، اور چونکہ شاعر تھے اس لئے فرماتے ہیں کہ مجھے چرب زبانی دی گئی ہے، اس لئے اگر کوئی دنیادار بادشاہ ہوتا تو مجھے کوئی فکر نہیں تھی، مَیں کوئی بھی بہانہ بنا کر اس کی ناراضگی سے بچ سکتا تھا۔ لیکن اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! مجھے معلوم ہے کہ اگر آج آپ کے سامنے میں کوئی جھوٹ بات پیش کروں جس کو سن کر آپ مجھ سے راضی ہوجائیں؛ تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ میری حقیقت آپ کے سامنے ظاہر کر کے آپ کو مجھ سے ناراض کردے۔ معاملہ تو آپ کا ہے، اللہ کے رسول کا ہے۔

دیکھئے! یہاں حضرت کعبؓ نے یوں نہیں فرمایا کہ میں جھوٹ بولوں گا تو آپ کو پتہ چل جائے گا بلکہ یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آگاہ فرمادیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ غیب نہیں جانتے تھے۔

﴿کوئی بہانہ نہیں ہے﴾

اور اگر آج میں آپ کے سامنے سچی بات بیان کردوں جس کو سن کر آپ مجھ سے ناراض ہوجائیں گے، مجھے اس میں اللہ تعالیٰ سے معافی کی امید ہے۔ بس! آپ سن لیجیے ﴿واللہ! مالی من عذر﴾ اللہ کی قسم! میرا کوئی عذر نہیں تھا، اب کی مرتبہ جو میں غیر حاضر رہا اس سے پہلے میں کبھی اتنا خوش حال اور میری مالی پوزیشن اتنی مضبوط نہیں تھی یعنی میرے پاس سفر کے سارے اسباب موجود تھے، اس کے باوجود مَیں نہیں آیا، کوئی بہانہ نہیں ہے سیدھی بات ہے۔

﴿قال رسول اللہ ﷺ: أما ھذا فقد صدق﴾ حضور ﷺ نے فرمایا: بھئی! اس نے تو سچی بات بیان کردی، لہٰذا تم اٹھو، یہاں تک کہ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف

سے کوئی حکم آوے۔ دیکھو﴿أما هذا فقد صدق﴾ کہہ کر حضور ﷺ نے بتلا دیا کہ پہلے جو لوگ بہانے پیش کر کے گئے تھے وہ حضور کو پسند نہیں آئے تھے۔

﴿لوگوں نے بہت اُکسایا﴾

فرماتے ہیں: مَیں حضور کی مجلس سے اُٹھا اور مسجد سے جب باہر نکلا تو خاندان بنوسلمہ کے کچھ لوگ بھی میرے ساتھ ساتھ باہر چلے اور میرے پیچھے آئے۔ ایسے موقعہ پر لوگ اپنے طور پر بھی بہت باتیں کرتے ہیں۔ انہوں نے جو اپنا حال سچ سچ بیان کر دیا تھا اس پر ان لوگوں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا: اللہ کی قسم! ہمیں معلوم نہیں کہ اس سے پہلے تم نے کوئی جرم کیا ہو یعنی تمہاری زندگی میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ باوجود استطاعت کے اور حضور کی طرف سے غزوہ میں چلنے کی تاکید کے تم نہیں گئے، ٹھیک ہے؛ تمہاری طرف سے یہ قصور ہوا لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ ہے، پھر جس طرح دوسرے لوگوں نے اعذار بیان کر دیئے تم بھی بیان کر دیتے، پھر تم اس بات سے کیوں قاصر رہے؟ اب رہا سوال یہ ہے کہ بہانہ بتلاتے تو وہ جھوٹ ہو جاتا تو اس کا تدارک یہ ہوتا کہ حضور نے ان لوگوں کے لئے دعائے مغفرت بھی تو کی تھی، تمہارے لئے بھی دعائے مغفرت فرما دیتے، تو تمہارا گناہ معاف ہونے کے لئے کافی ہو جاتی۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وہ لوگ مجھے برابر اس پر ٹوکتے رہے، اور تنبیہ کرتے رہے یہاں تک کہ میرے جی میں خیال آیا کہ مَیں واپس جاؤں اور حضور کے سامنے اپنے آپ کو پہلی باتوں میں جھوٹا بتلاؤں یعنی ان لوگوں نے مجھے اتنا گرم کیا کہ دل میں ایسا خیال آنے لگا، لیکن پھر میں نے ان لوگوں سے پوچھا: میرے جیسا معاملہ کسی اور

کے ساتھ بھی پیش آیا ہے؟ ان لوگوں نے کہا: جی ہاں! دو آدمی ایسے ہیں کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کے سامنے اسی طرح صحیح بات کہی، کوئی بہانہ نہیں بنایا بلکہ جو حقیقت تھی وہ پیش کردی اور ان کو بھی جواب میں وہی بات کہی گئی جو آپ کو کہی گئی۔ مَیں نے پوچھا: وہ دوکون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرے قبیلے والوں نے جن دو حضرات کے نام لئے، وہ نیک آدمی تھے اور ایسے تھے کہ جو غزوۂ بدر میں شریک ہو چکے تھے، حالانکہ غزوۂ بدر میں شریک ہونے والوں کے لئے مخصوص فضائل بیان کئے گئے ہیں، وہ دونوں ان سارے فضائل کے حامل تھے۔ گویا ان دونوں کی شخصیتوں میں میرے لئے نمونہ موجود تھا کہ میرے جیسے وہ بھی ہیں، کوئی فکر کی بات نہیں ہے، جو حال اُن کا ہوگا؛ وہی میرا ہوگا، چنانچہ میں اپنی بات پر قائم رہا۔

تینوں سے بائیکاٹ کا حکم نبوی ﷺ

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ہم تینوں کے ساتھ خاص طور پر بات چیت کرنے سے لوگوں کو منع کردیا، گرچہ غیر حاضر رہنے والے تو اور بھی بہت سارے لوگ تھے، لیکن ہم تینوں کے ساتھ لوگوں کو بات کرنے سے منع فرمادیا، گویا ہمارا بائیکاٹ کردیا گیا۔ حضرت کعب فرماتے ہیں: کہ حضور ﷺ کے اس حکم کے نتیجے میں لوگ ہم سے دور رہنے لگے اور ان کا سلوک ہمارے ساتھ بالکل بدل گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ وہ سرزمین ہی نہیں ہے جس میں ہم رہتے تھے، بلکہ دوسری بستی ہے۔ یہ حال اور کیفیت پچاس رات دن رہی۔ میرے وہ دونوں ساتھی تو تھک ہار کر گھروں میں بیٹھ گئے اور روتے رہے۔ ویسے بھی عمر کے اعتبار سے وہ میرے جیسے مضبوط نہیں تھے اور مَیں تو نوجوان آدمی تھا اور بڑا قوی و توانا تھا، مجھ سے

گھر میں بیٹھا نہیں جاتا تھا، میں تو روزانہ گھر سے نکلتا تھا، نماز کے وقت مسجد میں آتا تھا، لوگوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوتا تھا، بازاروں میں گھومتا تھا، لیکن کوئی بھی مجھ سے بات نہیں کرتا تھا اور نماز کے بعد جب نبی کریم ﷺ اپنی مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو آپ کے پاس حاضر ہو کر سلام بھی کرتا تھا اور اپنے جی میں سوچتا تھا کہ میرے سلام کے جواب میں حضور اکرم ﷺ نے ہونٹ مبارک ہلائے یا نہیں، گویا حیا و شرم کے مارے اتنی جرأت و ہمت نہیں ہوتی تھی کہ حضور کے ہونٹ مبارک کو ہلتا ہوا دیکھیں۔ اور پھر میں حضور کے قریب ہی نفل نماز کی نیت باندھتا تھا اور نماز کے دوران نظریں چرا کر حضور کو دیکھ بھی لیا کرتا تھا، مَیں جب نماز میں مشغول ہوتا تھا تو نبی کریم ﷺ مجھے دیکھتے تھے اور جب نماز سے فارغ ہو کر حضور کی طرف متوجہ ہوتا تھا؛ تو آپ منہ پھیر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی بے رُخی بہت طویل ہوگئی۔

حضراتِ صحابہ کا حضور ﷺ کے حکم پر عمل کا جذبہ

پھر ایک دن میں چلا یہاں تک کہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے باغ کی دیوار پھلانگ کر اندر گیا اور جا کر اُن کو سلام کیا۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ ان کے چچازاد بھائی بھی تھے اور بہت محبوب دوست بھی تھے۔ یہاں دیکھئے ! کہ ان حضراتِ صحابہ کا حضور ﷺ کے حکم پر عمل کا جذبہ کیسا تھا۔ آج کل اگر دنیا کا بڑے سے بڑا حکمران کوئی حکم دے تو کسی ایسی جگہ جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو؛ وہاں تو بات کر ہی لیں گے۔ لیکن وہ کہتے ہیں: میں دیوار پھلانگ کر اندر گیا اور سلام کیا تو اللہ کی قسم! انہوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا، حالانکہ وہاں اور کوئی نہیں تھا، ہم دو ہی تھے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی دیکھنے والا نہیں تھا یعنی اگر صرف

دکھلاوے کے خاطر ہی حضور اکرم ﷺ کے حکم اور بات پر عمل کرنا ہوتا؛ تو یہاں تو کوئی بھی دیکھنے والا نہیں تھا، وہ بات کر لیتے، لیکن ایسا نہیں کیا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صحابہ کا معاملہ حضور ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری کے سلسلے میں کیسا تھا۔ حضرت کعب کہتے ہیں کہ جب انہوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا تو میں نے ان سے کہا کہ اے ابوقتادہ! میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ تمہیں معلوم ہے نا کہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہوں؟ اس کا بھی انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، اس پر بھی خاموش رہے۔ میں نے دوبارہ اُن کو قسم دی، اس پر بھی وہ خاموش رہے۔ پھر تیسری مرتبہ میں نے قسم دے کر ان کو پوچھا تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا: ﴿**الله ورسولهٗ أعلم**﴾ یہ کوئی جواب نہیں ہے بلکہ یہ بار بار قسم دے کر دریافت کر رہے تھے تو ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے یہ کہا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ حضرت کعب کہتے ہیں: ان کا یہ سلوک اور رویہ دیکھ کر بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں وہاں سے لوٹا یہاں تک کہ باغ کی دیوار پھاند کر باہر آ گیا۔

﴿شاہِ غسان کی آفر (OFFER)﴾

میں بازار کے اندر چل رہا تھا تو شام کے دیہات کے رہنے والوں میں سے ایک باشندہ جو وہاں سے غلہ لے کر مدینہ منورہ میں بیچنے آیا تھا وہ آواز لگا رہا تھا کہ کون ہے جو مجھے کعب بن مالک کا پتہ بتائے، اس طرح وہ زور زور سے اعلان کر رہا تھا۔ لوگ میری طرف اشارہ کر کے بتلا رہے تھے، کوئی زبان سے کچھ نہیں بولتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ آدمی میرے پاس آیا اور اس نے غسان کے بادشاہ کا خط مجھے دیا۔ شام کے علاقے میں جو حصہ

حجاز کی سرحدوں سے قریب پڑتا ہے وہاں ان کی حکومت تھی اور یہ علاقہ قیصر کے ماتحت تھا اور مَیں لکھنا پڑھنا جانتا تھا، چنانچہ وہ خط کھول کر میں نے خود ہی پڑھا تو اس خط میں لکھا ہوا تھا:-اما بعد! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھی (یعنی نبی کریم ﷺ) نے تمہارے ساتھ بے رُخی کا معاملہ کیا ہے اور تم کو اللہ تعالیٰ نے بے عزت اور ضائع ہونے کے لئے نہیں بنایا ہے، آپ ہمارے یہاں آ جاؤ، ہم آپ کی دل جوئی واعزاز کریں گے۔

آفر (OFFER) کا منہ توڑ جواب

دیکھو! پوری حکومت کا بادشاہ ان کو اپنی طرف مائل کر رہا ہے اور کئی دن ایسے گذرے ہیں اور وہ خود بھی ایسے حالات سے دوچار ہیں کہ خود کہہ چکے ہیں کہ زمین بھی وہ نہیں رہی تھی اور اپنے محبوب دوست نے بھی سلام کا جواب دینا گوارہ نہیں کیا۔لہٰذا سوچئے! کیا گذر رہی ہوگی۔ایسے حالات میں یہ خط پہنچا ہے۔فرماتے ہیں: کہ یہ بھی ایک آزمائش ہے، لہٰذا اس خط کو لے کر مَیں تنور کی طرف بڑھا اور اس میں ڈال کر جلا دیا اور اس کو بتا دیا کہ وہاں جا کر بتا دینا کہ یہ تیرے خط کا جواب ہے۔

ایک اور بڑی آزمائش

کہتے ہیں کہ جب چالیس دن پورے ہوئے اور وحی بھی نہیں آ رہی تھی کہ نبی کریم ﷺ کا قاصد میرے پاس آیا اور اس نے کہا: نبی کریم ﷺ حکم دے رہے ہیں کہ تم بیوی سے الگ رہو۔آج تک تو بیوی ساتھ تھی، اب یہ حکم آیا۔مَیں نے اس قاصد سے پوچھا: کیا طلاق دے دوں؟ اس نے کہا: نہیں! طلاق نہیں دینی ہے، بس الگ رہو، اس کے ساتھ مت رہو۔اب دیکھئے! گھر میں انس کے لئے ایک شخصیت تھی اس کو بھی الگ کیا جا رہا

ہے۔ چنانچہ مَیں نے اپنی بیوی سے کہا: اپنے گھر جاؤ اور وہاں رہیو؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فیصلہ آجائے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو کتاب الطلاق میں یہ بتلانے کے لئے پیش فرمایا ہے کہ کوئی آدمی بیوی سے کہے کہ اپنے گھر چلی جا اور طلاق کی نیت نہ ہو؛ تو طلاق نہیں پڑتی ہے۔

غم کی کیفیت

حضور اکرم ﷺ کی طرف سے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی یہی کہلوایا گیا تھا تو ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کی بیوی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آکر عرض کیا: اللہ کے رسول! ہلال بن امیہ بہت بوڑھے آدمی ہیں اور ان کا کوئی خدمت گذار بھی نہیں ہے، وہ خدمت کے محتاج ہیں، اگر ان کی خیر خبر نہیں لی گئی؛ تو وہ ضائع ہوجائیں گے، تو کیا آپ اس بات کو ناپسند کریں گے کہ مَیں ان کی خدمت کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: خدمت کرنے سے منع نہیں ہے؛ لیکن وہ تمہارے قریب نہ ہونے پائیں، تم سے صحبت نہ کرنے پائیں۔ اس کے جواب میں ان کی بیوی نے کہا: اللہ کے رسول! ان کو تو کسی چیز کا ہوش وحواس بھی نہیں ہے، جب سے یہ معاملہ پیش آیا ہے ان کا تو پورا وقت رونے میں ہی گذرتا ہے۔ خیر! حضور نے ان کے خاص حالات کے پیشِ نظر اجازت دی کہ بیوی خدمت کرسکتی ہے۔

حضرت کعبؓ کہتے ہیں: میرے خاندان میں سے کسی نے مجھ سے کہا کہ ان کو اجازت مل گئی ہے، اس لئے تم بھی حضور ﷺ سے بیوی کے سلسلے میں اجازت لے لو۔ مَیں نے جواب میں کہا: مَیں حضور ﷺ سے اس سلسلے میں اجازت نہیں مانگوں گا، کیا پتہ مجھے کیا

جواب ملے، وہ تو بوڑھے تھے اور مَیں تو نوجوان ہوں، مجھے کسی کی خدمت کی ضرورت نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ اسی طرح دس راتیں اور گذریں اور جب سے ہمارے ساتھ بات چیت کرنے سے منع کیا گیا تھا؛ اس کو پورے پچاس دن گذر گئے۔

﴿اے کعب! خوش ہو جاؤ﴾

حضرت کعب فرماتے ہیں: پچاسویں رات کی صبح کو فجر کی نماز مَیں نے اپنے گھر کی چھت پر پڑھی اور اسی حالت میں بیٹھا ہوا تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے متعلق قرآن پاک میں بیان کیا ہے ﴿وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ﴾ یہاں تک کہ زمین ان کے اوپر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں بھی ان پر تنگ ہوگئیں، وہ خود بھی اپنی جان سے عاجز آ گئے۔ آدمی پر جب حالات آتے ہیں تو وہ اپنی جان سے بھی عاجز آ جاتا ہے، یوں سوچتا ہے کہ اس سے بھی پیچھا چھڑا لوں۔ کہتے ہیں: وہی کیفیت میری تھی، اور اسی حالت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی جبلِ سلع پر- جو مدینہ منورہ کا ایک پہاڑ ہے - چڑھا ہوا تھا اور وہیں سے اس نے زور سے آواز دی: ﴿یا کعب بن مالک! أبشر﴾ اے کعب بن مالک! خوش ہو جاؤ، بشارت سن لو۔ مَیں سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری توبہ کی قبولیت کی اطلاع آ چکی ہے، اس کی آواز سنتے ہی مَیں سجدۂ شکر میں گر گیا اور مَیں سمجھ گیا کہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشادگی آ گئی۔

﴿خوش خبری سنانے کے لئے جانا ثابت ہے﴾

بات یہ ہوئی تھی کہ فجر کی نماز کے بعد حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری توبہ قبول ہونے کی اطلاع دی تھی، اسی رات کو وحی آئی تھی۔ رات کے وقت

حضرت اُمِ سلمہؓ کے یہاں حضور اکرم ﷺ تھے اور حضرت ام سلمہ کو اطلاع دی تھی کہ ان لوگوں کے بارے میں وحی آ گئی ہے۔حضرت امِ سلمہؓ نے عرض بھی کیا: اللہ کے رسول! مَیں ان لوگوں کو بتا دوں؟ آپ نے فرمایا: کوئی ان کو سونے نہیں دے گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی ایسی اطلاع ایسے وقت میں آئی ہو کہ آرام کا وقت ہو اور اس کے ظاہر کرنے میں لوگوں کے آرام ضائع ہونے کا اندیشہ ہو؛ تو بعد میں دی جا سکتی ہے۔ بہر حال! حضور ﷺ نے فجر کی نماز کے بعد لوگوں کو ان کی توبہ کے قبول ہونے کی اطلاع دی اور جو آیتیں اتری تھیں؛ وہ بتلائی۔جیسے ہی لوگوں نے یہ سنا، ہم کو بشارت سنانے کے لئے دوڑے۔اس سے خوش خبری سنانے کے لئے جانا ثابت ہوتا ہے۔

﴿خوش خبری سنانے والے کو انعام دینا ثابت ہے﴾

چنانچہ میرے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی خوش خبری سنانے والے گئے اور ایک آدمی میرے پاس آنے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا، ایک اور آدمی پیدل چلا، تو اس پیدل چلنے والے نے دیکھا کہ مَیں اس گھوڑے والے سے پہلے پہنچ نہیں سکوں گا تو اس نے پہاڑ پر چڑھ کر وہیں سے آواز لگا دی، گویا فون کر دیا، لہٰذا وہ آواز گھوڑے سے زیادہ جلدی پہنچی، اور جو پہلی اطلاع ہو اسی کو تو بشارت کہتے ہیں۔اس کے بعد وہ پہاڑ سے اُتر کر میرے پاس آیا تو مَیں نے اپنے کپڑے ان کے لئے نکال دیئے اور وہی پہنے ہوئے کپڑے اتار کر ان کو انعام کے طور پر دے دیئے، اور اس دن ان دو کپڑوں کے علاوہ کوئی کپڑے میرے پاس نہیں تھے۔خیر! اس سے خوش خبری سنانے والے کو انعام دینا ثابت ہوتا ہے۔جیسے بچے کی خوش خبری سنانے والے کو دیا جاتا ہے۔

﴿وصال کی لذت﴾

اس کے بعد دو کپڑے مانگ کر لئے اور ان کو پہن کر مَیں حضور اکرم ﷺ کی ملاقات کی غرض سے آگے بڑھا۔ راستے میں لوگ جماعت در جماعت، ٹولی در ٹولی مجھے سے ملتے تھے اور توبہ کے قبول ہونے کی مبارک باد دیتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا تمہاری توبہ کو قبول کرنا؛ مبارک ہو۔ یہاں تک کہ مَیں مسجدِ نبوی میں داخل ہوا۔ نبی کریم ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اور لوگ آپ کے آس پاس بیٹھے تھے، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ مجھے دیکھ کر اُٹھے اور مبارک باد دی، مصافحہ کیا۔ وہاں جو حضراتِ مہاجرین بیٹھے تھے ان میں سے کسی نے اس طرح لپک کر ملاقات نہیں کی تھی۔ ان کا یہ احسان مَیں کبھی نہیں بھولوں گا۔

﴿حضور اکرم ﷺ کی خوشی کی کیفیت﴾

اور جب مَیں نے نبی کریم ﷺ کو سلام کیا تو حضور اکرم ﷺ کا چہرۂ انور مارے خوشی کے چمک رہا تھا اور حضور کی اس کیفیت کو ہم لوگ سمجھتے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جب سے تمہاری ماں نے تم کو جنا ہے اس کے بعد سے ایسا بہترین دن اللہ تعالیٰ نے تم کو دکھلایا؛ اس کی بشارت سن لو۔ اس پر مَیں نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! یہ میری معافی کا اعلان آپ کی طرف سے ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور جب حضور اکرم ﷺ مسرور اور خوش ہوتے تھے تو آپ کا چہرہ ایسا روشن معلوم ہوتا تھا جیسا کہ چاند کا ٹکڑا ہو اور اس چیز کو ہم صحابہ کرام جانتے تھے۔ اس روز بھی یہی کیفیت تھی۔

خوشی میں آدمی سارا مال نہ دے ڈالے

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: جب میں حضور کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میری توبہ کا تکملہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے خاطر میں سارے مال سے نکل آؤں یعنی اللہ کے راستے میں دے دوں، تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کچھ مال اپنے پاس رہنے دو، اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ خوشی میں آدمی سارا مال نہ دے ڈالے، بلکہ اپنی ضرورت کے لئے تو رکھنا پڑے گا۔ خوشی میں سب دے ڈالے اور پھر لوگوں سے مانگنے لگے؛ ایسی نوبت نہ آنی چاہیے۔ مَیں نے حضور ﷺ سے عرض کیا: خیبر میں مالِ غنیمت کے طور پر جو حصہ ملا تھا وہ رہنے دیتا ہوں، باقی سارا مال اللہ کے راستے میں صدقہ کرتا ہوں۔

توبہ کا تکملہ

پھر میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے مجھے اس مصیبت سے نجات سچائی کی برکت سے عطا فرمائی ہے، اس لئے اب میری توبہ کا تکملہ یہ ہے کہ مَیں جب تک زندہ رہوں گا؛ ہمیشہ سچ بولوں گا، کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔

اور فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! مجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کو اس کے سچ بولنے پر ایسا آزمایا ہو؛ جتنا کہ حضور ﷺ کے سامنے سچ بولنے پر مجھے آزمایا۔ ویسے ان کے دو ساتھی تھے؛ لیکن بیوی کے معاملے میں انہوں نے جو تکلیف اُٹھائی اس میں تو یہ تنہا ہی تھے۔ اور فرماتے ہیں: جب سے مَیں نے حضور ﷺ سے یہ وعدہ کیا ہے اس کے بعد سے آج تک میری زبان سے جھوٹ بات نہیں نکلی یعنی میں اپنے اس عہد پر قائم ہوں اور جب تک

مَیں زندہ رہوں گا اللہ تعالیٰ سے یہی امید ہے کہ وہ میری جھوٹ سے حفاظت فرمائیں گے۔

اور فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائی تھیں ﴿لَقَدْ تَابَ اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ وَالْمُھَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ فِیْ سَاعَۃِ الْعُسْرَۃِ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ متوجہ ہوا نبی کریم ﷺ کی طرف اور ان مہاجرین وانصار کی طرف؛ جنہوں نے سختی کی گھڑی میں نبی کریم ﷺ کا ساتھ دیا ﴿وَعَلَی الثَّلٰثَۃِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا﴾ اور اللہ تعالیٰ متوجہ ہوا ان تین آدمیوں پر؛ جن کا معاملہ پیچھے ڈال دیا گیا تھا یعنی جن کی توبہ کو فوری طور پر قبول نہیں کیا تھا اور معاملہ موقوف رکھا گیا تھا یہاں تک کہ ان پر زمین باوجود کشادگی کے تنگ ہوگئی۔

﴿پھر بھی اللہ تعالیٰ تو راضی نہیں ہوگا﴾

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! میرے خیال میں اللہ تعالیٰ نے جب سے مجھے اسلام کی ہدایت عطا فرمائی مجھ پر اس سے بڑی نعمت نہیں اتاری کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ سے سچ سچ کہا، اللہ تعالیٰ نے مجھے حضور کے سامنے جھوٹی بات کہنے سے بچالیا، ورنہ اگر میں نے بھی جھوٹا بہانہ تراش لیا ہوتا جیسا کہ منافقین نے تراشا تھا؛ تو میں بھی اسی طرح ہلاک ہو جاتا جیسے وہ ہلاک ہوئے۔ اس لئے کہ جنہوں نے جھوٹے بہانے پیش کئے تھے اللہ تعالیٰ نے جب اُن کے متعلق وحی نازل فرمائی تو ان کے لئے بہت خطرناک الفاظ استعمال فرمائے۔ باری تعالیٰ حضور ﷺ کو فرماتے ہیں ﴿سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَکُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَیْھِمْ﴾ جب آپ لوٹ کر جاؤ گے وہ منافقین جو غزوہ میں حاضر نہیں رہے تھے، وہ آکر جھوٹی قسمیں کھائیں گے ﴿لِتُعْرِضُوْا عَنْھُمْ﴾ یہ قسمیں اس لئے کھائیں گے تاکہ آپ ان سے درگذر کرو، ان کو چھوڑ دو، ان کی پکڑ نہ کرو ﴿فَأَعْرِضُوْا عَنْھُمْ﴾ باری تعالیٰ فرماتے

ہیں: ٹھیک ہے ان کی پکڑ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ان سے اعراض کرو ﴿اِنَّھُمْ رِجْسٌ﴾ وہ تو گندے ہیں ﴿وَمَأْوٰھُمْ جَھَنَّم﴾ اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے ﴿جَزَآءً بِّمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْن﴾ ان کے کرتوتوں کی وجہ سے۔ ﴿یَحْلِفُوْنَ لَکُمْ لِتَرْضَوْا عَنْھُمْ﴾ یہ تمہارے سامنے آکر جھوٹی قسمیں اس لئے کھاتے ہیں کہ تم ان سے راضی اور خوش ہوجاؤ، ان کی طرف سے تمہارے دل میں کوئی میل نہ رہے ﴿فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْھُمْ فَاِنَّ اللہَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِیْن﴾ اگر تم راضی ہو بھی گئے تو اللہ تعالیٰ تو ان گنہ گاروں سے راضی نہیں ہوگا۔

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر کا سارا حال بیان کردیا۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: یہ غیر حاضر رہنے والے جنہوں نے آکر حضور کے سامنے جھوٹی قسمیں کھائیں تھیں اور حضور نے ان کا عذر قبول کرلیا تھا ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے ان تین کا معاملہ مؤخر کیا تھا اور جھوٹے بہانے والوں سے حضور نے دوبارہ بیعت بھی کرلی، ان کے لئے دعائے مغفرت بھی کی اور حضور نے ہمارے معاملے کو مؤخر کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں یہ آیتیں نازل فرمائیں ﴿وَعَلَی الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا﴾

بس! یہاں تو اس قصہ کو تفصیل سے اس لئے ذکر کیا کہ ان حضرات کی توبہ اس طرح قبول ہوئی۔

توبہ
و
تکمیل توبہ
مجلس ۴

یہ مجلس تاریخ ۶/ جمادیٰ الاخریٰ ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۹/ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو بمقام مسجد ابرار شالیمار سوسائٹی۔سورت میں ہوئی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً .اما بعد .

اسلامی سزاؤں کا اصلی چہرہ

توبہ کا باب چل رہا تھا توبہ کے سلسلے میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت ساری روایتیں پیش کی ہیں ان میں سے ایک روایت ہے۔حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ قبیلۂ جہینہ کی ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایسی حالت میں حاضر ہوئی کہ زنا کی وجہ سے وہ حاملہ بن چکی تھی ،اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے ایک ایسے جرم اور گناہ کا ارتکاب کیا ہے جو حد کو واجب کرنے والا ہے۔اسلام نے بعض مخصوص گناہوں پر جو سزائیں مقرر کی ہیں ان کو حد کہتے ہیں جیسے چور چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے کوئی زنا کرے اور زانی اگر غیر شادی شدہ ہے تو اس کو کوڑے لگائے جاتے ہیں اور اگر شادی شدہ ہے تو اس کو رجم یعنی سنگسار کیا جاتا ہے، پتھر مار کر اس کو ختم کیا جاتا ہے کوئی شراب پئے تو اس کو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔اس عورت نے آکر کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے ایک ایسے

جرم اور گناہ کا ارتکاب کیا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر حد واجب ہوچکی ہے آپ وہ حد مجھ پر جاری کیجئے۔ تو نبی کریم ﷺ نے اس عورت کے سرپرست اور ولی (وارث) کو بلا کر کہا کہ اس وقت چونکہ وہ حاملہ ہے اس کے پیٹ میں بچہ ہے، جرم عورت نے کیا ہے، جو بچہ پیٹ میں ہے اگرچہ زنا کی وجہ سے حمل ٹھیرا ہوا ہے لیکن اس بچے نے تو کوئی جرم کیا نہیں ہے، اگر اس حالتِ حمل میں اس پر سزا جاری کی گئی اور پتھر مار کر ختم کیا گیا تو جو بچہ پیٹ میں ہے وہ نا کردہ گناہ کی سزا بھگتے گا، اس لئے قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے زنا کرایا ہے اور حاملہ ہے، چاہے وہ حمل اسی زنا کی وجہ سے ٹھیرا ہو، تو جب تک وہ حالتِ حمل میں ہے وہاں تک اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی، بلکہ بچہ پیدا ہو جانے کے بعد جو نفاس کی حالت ہوتی ہے۔ یعنی بچے کی پیدائش کے بعد عورت کو اس کے رحم اور بچہ دانی سے چند روز تک خون جاری رہتا ہے جس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن کی ہے اور کم سے کم کے لئے کوئی حد نہیں، بعض عورتوں کو کبھی تھوڑا سا خون آکر معاملہ ختم ہو جاتا ہے اور بعضوں کو کئی دن تک یہ سلسلہ رہتا ہے۔ تو اگر وہ عورت غیر شادی شدہ ہے اور اس کی سزا کوڑے ہیں تو سو کوڑے اس کو لگائے جاتے ہیں لیکن حالتِ نفاس میں اس کو کوڑے نہیں لگائے جائیں گے، چونکہ یہ بھی ایک قسم کی بیماری ہے، کمزوری کی حالت ہے، اس بیماری میں اگر کوڑے لگائے گئے؛ تو ہوسکتا ہے کہ وہ کوڑوں کی مار برداشت نہ کرتے ہوئے انتقال کر جائے اور چونکہ شریعت نے اس کے لئے جو سزا مقرر کی ہے وہ موت کی نہیں ہے، صرف کوڑوں کی ہے، اس کو مار ڈالنا مقصود نہیں ہے، اس لئے جب تک نفاس والی کیفیت ہے، اس پر یہ سزا جاری نہیں کی جائے گی، نفاس کا زمانہ گذرنے کے بعد اس کو کوڑے لگائے جائیں گے۔

اور اگر شادی شدہ مرد یا عورت زنا کا ارتکاب کریں تو اسلام میں ان کی سزا سنگساری ہے یعنی پتھر مار کر ان کو ختم کیا جائے، ویسے بھی زنا کے ثبوت کے لئے بڑے کڑے شرائط رکھے ہیں یا تو یہ کہ خود مجرم اس کا اقرار کرے اور اقرار بھی ایک مرتبہ کر لینا کافی نہیں ہے، بلکہ چار مرتبہ، وہ بھی ایک مجلس میں نہیں، الگ الگ مجلس میں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے پاک فرما دیجئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور اللہ سے معافی مانگو؛ وہ معاف کرنے والا ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے منہ پھیر لیا اور ان کو وہاں سے نکال دیا کہ چلے جاؤ۔ وہ گئے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد بے چینی بڑھی تو چونکہ آپ نے رخ پھیر لیا تھا اس لئے دوسری طرف سے واپس آئے، آپ کے چہرۂ انور کی طرف گئے اور پھر انہوں نے وہی بات عرض کی: یارسول اللہ! مجھے گناہ کی نجاست اور نحوست سے پاک کیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ان کو وہاں سے نکال دیا اور یوں کہا: اپنے گناہوں کی معافی مانگو اللہ تبارک وتعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔ چلے گئے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد پھر آئے۔ چار مرتبہ اس طرح ہوا، جب چوتھی مرتبہ انہوں نے آ کر اس بات کا اقرار کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کس چیز سے پاک کروں؟ عرض کیا: زنا سے۔ حاضرین سے آپ نے پوچھا: یہ پاگل تو نہیں ہیں؟ بتایا گیا: کہ نہیں۔ تب فرمایا: ٹھیک ہے۔

اس لئے کہ پاگل آدمی ایسا کوئی اقرار کر لے تو ویسے بھی اس پر کوئی سزا یا شریعت کا کوئی حکم جاری ہوتا نہیں ہے۔ شریعت نے تین آدمیوں کو اپنے احکام سے مستثنیٰ کر دیا ہے،

الگ رکھا ہے، حدیث میں آتا ہے: ﴿رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلاثَةٍ. عَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰى يَحْتَلِمَ وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰى يُفِيْقَ وَعَنِ النَّائِمِ حَتّٰى يَسْتَيْقِظَ (اخرجہ الاربعۃ الا الترمذی من حدیث عائشۃ)﴾ تین آدمیوں سے شریعت کے احکام اٹھالئے گئے ہیں ان میں سے ایک تو بچہ ہے یہاں تک کہ وہ بالغ ہوجائے، دوسرے پاگل پر بھی نماز روزہ کچھ نہیں ہے یہاں تک کہ اس کا پاگل پن دور ہوجائے اور تندرست ہوجائے، سونے والے پر سونے کی حالت میں شریعت کا کوئی حکم لاگو نہیں پڑتا جیسے نیند میں جو بڑبڑاہٹ نکلتی ہے مثلاً ایک آدمی سو رہا ہے، نیند کی حالت میں اس نے بڑبڑاہٹ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی؛ تو طلاق نہیں پڑے گی۔ یہ تین آدمی ہوئے

بہرحال! اس لئے حضور ﷺ نے پوچھا کہ دماغ تو ٹھیک ہے نا؟ پاگل تو نہیں ہیں؟ پھر حضور ﷺ نے پوچھا کہ کیا: انھوں نے شراب پی رکھی ہے کہ اس کے نشہ میں ایسی بات کہہ رہے ہیں؟ ایک صحابی نے کھڑے ہوکر ان کا منہ سونگھا تو ان کو شراب کی بو نہیں آئی پھر آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کیا تم نے زنا کیا ہے؟ جواب دیا کہ جی ہاں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان پر حد جاری کرو، ان کو پتھر مار کر ختم کرو، چنانچہ ان کو مسجد سے باہر ایک میدان میں کھڑا کیا گیا اور تمام صحابہ کو حکم دیا کہ ان کو پتھر مارو، چنانچہ ان کو پتھر برسا کر ختم کردیا گیا۔ (مشکوۃ ص ۳۱۰ فصل اول بحوالہ مسلم)

اس سے علماء نے یہ مسئلہ نکالا کہ ایک مرتبہ کے اقرار سے نہیں بلکہ چار مرتبہ اور وہ بھی الگ الگ مجلسوں میں اگر زنا کا اقرار کرے؛ تو زنا کا ثبوت ہوگا، ورنہ نہیں۔ ایک جگہ کھڑے ہوکر چار مرتبہ کہے تو بھی نہیں۔ یا پھر یہ کہ گواہ اس کے خلاف موجود ہوں اور گواہ بھی چار، اور گواہوں کے لئے بھی شریعت نے بہت ساری کڑی کڑی شرطیں رکھی ہیں کہ وہ

عادل ہونے چاہئیں، نیک اور دین دار ہونے چاہئیں، انھوں نے کبھی کسی پر تہمت نہ لگائی ہو، کسی پر تہمت لگانے کی وجہ سے ان کو سزا نہ ہوئی ہو، اور غلام نہ ہوں، مرد ہونے چاہئیں عورتیں نہیں، بالغ ہونے چاہئیں۔ مطلب یہ کہ بہت ساری شرطیں ہیں، ایسے چار گواہ ہوں اور پھر وہ یوں کہیں کہ ہم نے اس مرد کو اس عورت کے ساتھ اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھا جیسے سرمہ دانی میں سلائی ہوتی ہے، ویسے ہی دیکھ لیا کہ دونوں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے ہیں؛ یہ کافی نہیں ہے۔ یہ سب شرطیں پائی جائیں تو پھر اس پر سزا جاری کی جاتی ہے

تو بات یہ چل رہی تھی کہ شریعت کی طرف سے جو سزائیں مقرر ہیں ان میں بہت سارے قوانین ہیں، شریعت کی مقرر کردہ سزاؤں کے متعلق جو غیر مذہب کے لوگ ہیں وہ تو اعتراض کریں لیکن مسلمانوں میں بھی بہت سے وہ ہیں جو ان سزاؤں سے واقف نہیں ان کی حقیقتوں سے واقف نہیں کہ ان میں شریعت نے کیسی کڑی کڑی شرطیں رکھی ہیں، ایسے ہی تو جاری نہیں ہوں گی، وہ بھی اعتراض کرتے ہیں۔ بلکہ چار مرتبہ اقرار کرنے کے بعد ابھی سزا جاری نہیں کی گئی ہے اس سے پہلے اس نے اقرار ختم کر دیا کہ میں نے زنا نہیں کیا ہے تو سزا نہیں دیں گے، بلکہ وہ سزا دینے کے درمیان بھاگ گیا تو اس سے پوچھیں گے کہ کیوں بھاگا؟ اگر وہ اپنے اقرار سے پھر جائے کہ میں اپنا اقرار واپس لیتا ہوں؛ تو بھی سزا نہیں دیں گے، اور اگر یوں کہے کہ مار پڑی تو مجھے ذرا تکلیف ہوئی، اس وجہ سے بھاگا، ورنہ میں اپنے اقرار پر قائم ہوں؛ تو پھر سزا جاری کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی ایسی تفصیلات ہیں۔

﴿ایک اہم اشکال﴾

دیکھئے! یہاں ایک بات اور ہے بہت سارے اہل علم اور اہل ایمان یہاں موجود

ہیں۔یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، بہت سے بزرگوں کے حالات میں ہے کہ ان کو کبھی گناہ کا تصور بھی نہیں آیا ، اللہ کے ایسے مقبول بندے بھی گذرے ہیں۔چنانچہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو میاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں، جن کی قبر یہیں راندیر کے قبرستان میں ہے ، اصلاً دیوبند کے رہنے والے ہیں ، حضرت یہیں تشریف لائے ہوئے تھے، بیمار ہوئے اور انتقال فرمایا اور قبر یہیں بنی، ان کے نانا تھے منے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ دار العلوم کی جب بنیاد پڑی تو پہلی اینٹ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے ہاتھ سے رکھوائی تھی ۔ان کے حالات میں لکھا ہے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: ان کو کبھی صغیرہ گناہ کا تصور بھی نہیں آیا، کبیرہ کی بات تو دور کی رہی ۔اور بھی بہت سے اکابر اہل اللہ کے حالات میں لکھا ہے۔

ایک طرف اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ولی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہ طے ہے۔ صحابی اس کو کہتے ہیں جس نے ایمان کی حالت میں نبی کریم ﷺ کو دیکھا ہو۔اور جنہوں نے ایمان کی حالت میں صحابی کو دیکھا ہو اس کو تابعی کہتے ہیں اور جس نے ایمان کی حالت میں تابعی کو دیکھا ہو اس کو تبعِ تابعی کہتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: زمانوں میں سب سے بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے اس کے بعد میرے بعد والا اور اس کے بعد اس کے بعد والا، اس لئے امت کے ان طبقوں کو ایک خاص مقام اور خاص فضیلت حاصل ہے جو بعد والوں کو نہیں۔ اسی کو خیر القرون کہا جاتا ہے۔اسی طرح صحابہ میں بھی مختلف درجات ہیں چنانچہ صحابہ میں

عشرۂ مبشرہ یعنی وہ دس صحابۂ کرام ﷺ جن کو نبی کریم ﷺ نے دنیا ہی میں جنت کی بشارت ایک ہی موقع پر ایک ہی مجلس میں عطا فرمائی۔جن میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعید بن زید، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ۔ ان دس حضرات کو فضیلت حاصل ہے، پھر ان میں بھی خلفاء راشدین اربعہ اور سب میں افضل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔عشرہ مبشرہ کے بعد وہ صحابۂ کرام ﷺ جنہوں نے غزوۂ بدر میں حصہ لیا جن کو بدریین کہا جاتا ہے ان کو دوسرے صحابۂ کرام ﷺ کے مقابلے میں ایک مخصوص مقام حاصل ہے اور بدریین کے بعد اہل بیعت رضوان کو فضیلت حاصل ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر جنہوں نے بیعت کی تھی جب کہ آپ عمرہ کے ارادے سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے اور مکہ والوں نے آپ کا راستہ روکا اس وقت آپ ﷺ نے صحابۂ کرام سے بیعت کی کہ اگر لڑائی کی نوبت آئے گی تو ہم جان دے دیں گے لیکن قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گے۔اس پر قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی خوشنودی کا پروانہ دیا گیا تھا ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ اِذْيُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح پ۲۶)﴾ اللہ تعالیٰ خوش ہوگیا اور راضی ہوگیا ان ایمان والوں سے جبکہ وہ آپ کے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ یہ بیعت رضوان والے ہوئے۔اس کے بعد دوسرے صحابہ ہیں ان میں بھی ترتیب ہے لیکن کوئی بھی صحابی کم سے کم درجے کا کیوں نہ ہو؛ امت کا کوئی دوسرا آدمی صحابہ کے بعد والا چاہے وہ اپنے زمانے کا کتنا ہی بڑا شخص کیوں نہ ہو (غوث پاک سیدنا حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ تھے، حضرت خواجہ

معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ تھے، اور بھی جتنے بڑے بڑے اہل اللہ گذرے ہیں) لیکن کوئی بھی چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی صحابی کے درجے کو پہنچ نہیں سکتا ہے۔ یہ اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ؟

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا مقام بہت اونچا ہے لیکن وہ صحابی نہیں ہیں وہ خلفاءِ بنوامیہ میں سے ہیں اور ان کا دورِ خلافت ایسا شاندار اور عظیم تھا کہ لوگوں نے ان کے دورِ خلافت کو خلافتِ راشدہ سے تشبیہ دی ہے۔ گویا وہ خلافتِ راشدہ کا ہی ایک حصہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ صحابی نہیں ہیں۔

اس پوچھنے والے کو یہ جواب دیا گیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جن غزوات میں حصہ لیا اور اس شرکت کے موقع پر ان کے گھوڑے کی ناک میں جو غبار پہنچا، حضرت عمر بن عبدالعزیز اس کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اتنا اونچا مقام ہر صحابی کو حاصل ہے۔ (مکتوبات مجدد الف ثانی رحمہ اللہ ص ۲۰۵ دفتر اول مکتوب ۲۰۷ بحوالۂ فتاوی رحیمیہ ۴/۳۰)

میں یہ بات عرض کر رہا تھا کہ اہل اللہ میں سے بہت سوں کے حالات آپ نے بھی پڑھے ہوں گے اور میں نے ایک نمونہ بھی پیش کیا کہ انہوں نے کبھی گناہ نہیں کیا بلکہ گناہ کا کبھی تصور بھی نہیں آیا، ایک طرف ان حضرات کا معاملہ ہے جو مفضول ہیں یعنی فضیلت میں کم ہیں اور ان کو یہ بات حاصل ہے، تو جو افضل حضرات تھے یعنی صحابہ ان کا ایسی چیزوں کا، ایسے امور کا اور ایسے افعال کا ارتکاب کرنا جس کی وجہ سے ان پر سزا ہو جائے اور

حدواجب ہو؛ یہ ایک اشکال کی چیز ہے، جو بہت سے لوگوں کو رہتی ہے۔

حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی ایک کتاب ہے ''شریعت و طریقت کا تلازم''اس میں حضرت نے اس سوال کو خاص طور پر ذکر کیا ہے۔حضرت فرماتے ہیں کہ کبھی مجھے یہ اشکال پیدا ہی نہیں ہوا کہ ایسا کیوں؟ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام بہت اونچا ہے۔

﴿جواب﴾

دیکھئے! اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شریعتِ مطہرہ دے کر بھیجا تھا اور چونکہ آپ پر دین کی تکمیل ہو چکی تھی، اب کوئی نئے نبی آنے والے نہیں تھے، آخر میں یہ آیت نازل ہوئی ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً (المائدۃ۔پ۶)﴾ کہ یہ دین مکمل کیا جاتا ہے۔اب دین کے متعلق ساری چیزیں جو امت کو تعلیم دینی تھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ امت کو بتلادیں، یا تو صاف اور صراحۃً بتلادیں یا ایسے اصول آپ کی طرف سے بتلائے گئے کہ جو واقعات نئے پیش آئیں؛ ان کے احکام بھی ان سے معلوم ہو سکتے ہیں۔تو شریعت کی تکمیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی دور میں ہونی تھی۔

اور دیکھئے! خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں بعض افعال خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے باری تعالیٰ کی طرف سے ایسے صادر کروائے گئے؛ جو شانِ نبوت کے خلاف نہیں تھے۔جیسے لیلۃ التعریس والا واقعہ۔کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر سے واپس لوٹ رہے تھے، گرمی کے دن تھے، عرب میں دستور یہ تھا کہ لوگ صبح چلتے تھے، دوپہر کو آرام کرتے تھے، شام سے رات کے ایک حصے تک چلتے تھے، اس کے بعد آخری رات میں

آرام کرتے تھے، فجر کے لئے اٹھ کر پھر چلتے تھے، یہ سلسلہ اسی طرح رہتا تھا۔ غزوۂ خیبر سے واپسی میں اسی طرح ہوا، رات کے آخری حصے میں آرام کیلئے ٹھہرے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہم کو نماز کے لئے کون اٹھائے گا؟ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ کبھی آپ ایسا نہیں فرماتے تھے، اس روز یہ فرمایا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ انبیاءِ کرام اور جن کو انبیاءِ کرام کے ساتھ خصوصی ربط رہتا ہے جو جتنے قریب ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں میں ایسے واقعات کے متعلق جو پیش آنے والے ہیں ایسی چیزیں ڈال ہی دی جاتی ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہم کو نماز کے لئے کون اٹھائے گا؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: مَیں اٹھاؤں گا۔ ٹھیک ہے، سب سو گئے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بیٹھے رہے کہ جب صبح کی روشنی نمودار ہو گی اس وقت مَیں اٹھا دوں گا۔ چنانچہ کجاوہ (جو اونٹ کے اوپر رکھا جاتا ہے لکڑی کا ہوتا ہے) سے ٹیک لگا کر مشرق کی جانب رخ کر کے جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے؛ بیٹھ گئے اور دیکھتے رہے کہ جہاں صبح کا سفیدا نمودار ہو گا تو مَیں اٹھا دوں گا، لیکن بیٹھے بیٹھے ان پر بھی نیند طاری ہو گئی یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور اوپر چڑھا، اس کی تپش سے سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کی آنکھ کھلی۔ دیکھئے! یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کو نمونہ پیش کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کی نماز قضا کروائی گئی۔ اسی لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿اِنِّیْ لَا اُنْسٰی بَلْ اُنَسّٰی لِاَسُنَّ﴾ میں بھولتا نہیں بلکہ مجھے بھلایا جاتا ہے تا کہ امت کیلئے ایک طریقہ معلوم ہو۔ لہٰذا قضا نماز کس طرح پڑھی جائے یہ کس طرح معلوم ہوتا؟ اسی لئے جب اٹھے تو نبی کریم ﷺ نے ایک دوسری بات بھی ارشاد فرمائی کہ چلو! اس وادی سے آگے بڑھو، آگے بڑھ کر پھر وہاں وضو کیا اور باقاعدہ اذان و جماعت کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔

دیکھئے! جس جگہ پر آنکھ لگ جانے کی وجہ سے نماز کے فوت ہونے کی نوبت آئی تھی؛ آپ نے اس وادی میں ٹھیرنا بھی پسند نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور غفلت کے جو محرکات ہوتے ہیں ان سے بھی آدمی کو اپنا پیچھا چھڑانا ضروری ہے۔

اس سے علماء نے یہ مسئلہ نکالا کہ اگر کئی آدمیوں کی نماز قضا ہوئی ہو تو جماعت کے ساتھ ادا کی جاسکتی ہے، اذان بھی دے سکتے ہیں، لیکن اتنی زور سے نہ ہو کہ دوسروں کو تکلیف ہو، جس کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو۔

خیر! آپ نے امت کو ایک حکم بتلا دیا کہ ﴿لَيْسَ فِي النَّوْمِ تَفْرِيطٌ ،اِنَّمَا التَّفْرِيطُ فِي الْيَقْظَةِ (ترمذی ۱/۴۳ باب ماجاء فی النوم عن الصلوۃ)﴾ کہ سونے میں آدمی کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں، کوتاہی تو بیداری میں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی نہ وہ بیچارہ خود اٹھ پایا اور نہ کوئی اٹھانے والے نے اٹھایا، اس نے پوری کوشش کی تھی، باقاعدہ اس کا انتظام کیا تھا، لوگوں کو بھی کہہ رکھا تھا کہ نماز کے وقت مجھے اٹھا دینا اور الارم بھی رکھ دیا تھا، لیکن اس کی آنکھ لگی ہی رہی، یہاں تک کہ نماز کا وقت گذر گیا، اس نے اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ دیکھئے! یہاں حضور ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا تھا لیکن ان کی بھی آنکھ لگ گئی اور سب کی آنکھ لگی رہی تو آپ نے تسلی دی کہ بھئی! اگر آئندہ بھی کسی کو ایسا ہو جاوے تو چونکہ یہ غیر اختیاری چیز ہے اس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم لوگوں کو کوئی جگائے اور پھر نہ جاگیں یا بیدار ہونے کے لئے کوئی انتظام ہی نہ کریں تو وہاں یہ بات نہیں چلے گی۔ البتہ بیداری میں کوتاہی کہلائے گی کہ آدمی جان رہا ہے کہ نماز کا وقت آیا پھر بھی اپنے مشغلے میں اور کام کاج میں لگا رہا یہاں تک کہ نماز کا وقت گذر گیا اور نماز قضا ہوگئی، یہ

غفلت کی بات ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ ہوگی۔ دیکھئے! آپ ﷺ کی نماز قضا ہوئی اور امت کے لئے نمونہ بنا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر آپ کی نمازیں ظہر عصر مغرب فوت ہوئیں آپ نے باقاعدہ ترتیب سے رات کو پڑھیں (ترمذی ۱/۴۳ باب الرجل تفوتہ الصلوات بایتھن یبداء) اس سے امت کو ایک اور مسئلہ معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ نمازیں چھوٹی ہوں تو اسی ترتیب سے پڑھی جائیں گی جس ترتیب سے چھوٹی ہیں۔ اور یہ بھی غیر اختیاری طور پر فوت ہوئی تھیں کہ دشمن کے مقابلے کی وجہ سے مہلت ہی نہیں ملی اور اس وقت تک صلوٰۃ الخوف کس طرح پڑھنی چاہیے؛ وہ حکم آیا نہیں تھا، لیکن اب اس کی وجہ سے فوت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خیر! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بعض وہ باتیں جس کی وجہ سے شانِ نبوت پر کوئی زد نہیں پڑتی؛ وہ تو خود آپ ﷺ سے کروائی گئیں تا کہ امت کو راستہ اور نمونہ ملے۔ حضور ﷺ نے باقاعدہ امت کی سہولت کے لئے سہولت کی چیزیں کر کے بتلائیں جیسے سفر میں آپ نے روزہ افطار کر کے بتلایا؛ تا کہ امت کو معلوم ہو کہ سفر میں روزہ نہ رکھنے کی شریعت کی طرف سے اجازت ہے۔ بلکہ جنہوں نے روزہ رکھا تھا اور اس کی وجہ سے دوسروں کی خدمت کے محتاج ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ (مشکوۃ ص ۱۷۷، از بخاری و مسلم، فصل اول، باب صوم المسافر)﴾ سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے اگر اس کی وجہ سے کوئی تکلیف پیش آتی ہو۔ ویسے علماء نے آج بھی لکھا ہے کہ اگر آسانی کے ساتھ رکھ سکتا ہے تو افضل یہی ہے کہ روزہ رکھے، لیکن نبی کریم ﷺ نے سارے طریقے بتلائے ہیں، اسی لئے جو سہولتیں آپ نے بتلائیں ان سہولتوں کو نہ برتنے پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم ﷺ کی

طرف سے باقاعدہ تنبیہ کی گئی اور عتاب فرمایا گیا۔

ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ کو معلوم ہوا کہ آپ نے فلاں کام امت کے لئے بطور سہولت کے کیا تھا لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ ہیں جو اس عمل کے سخت پہلو پر ہی عمل پیرا ہیں تو باقاعدہ نبی کریم ﷺ نے ان صحابۂ کرام کو ڈانٹا اور تنبیہ فرمائی۔

احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ جس طرح عزیمت پر عمل کیا جائے اسی طرح رخصتوں پر بھی عمل کیا جائے۔ شریعت نے اسی لئے تو رخصتیں رکھی ہیں، آدمی کو بہادر بننے کی ضرورت نہیں۔ بیماری میں آپ کو کنسیشن ملا ہے تو کنسیشن سے فائدہ اٹھائیے، سیدھی بات ہے۔ بلکہ سفر کی حالت میں جو کنسیشن ملا ہے؛ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو اس کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی نماز پوری پڑھنا چاہے تو پوری نہیں پڑھ سکتا، کنسیشن کے ساتھ ہی پڑھے۔ لہٰذا شریعت نے جہاں جہاں کنسیشن دیا ہے اس کنسیشن کو بھی برتو، بہادر مت بنو۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ بیمار ہوتے تھے تو خوب شور مچاتے تھے کہ یوں ہو گیا اور سر میں درد ہو رہا ہے۔ اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ سخت سے سخت بیماری میں بھی کبھی کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ کسی نے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! چھوٹی سی تکلیف ہوتی ہے، سر میں درد ہو گیا؛ تو آپ اتنا چلاتے ہیں؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تکلیف اسی لئے تو بھیجی کہ بندہ چلّائے، بیماری اسی لئے تو آتی ہے، ہم کا ہے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادر بنیں۔

غرض کہ شریعت کا مزاج یہ ہے کہ نہ وہ انسان پر سخت حکم ڈالتی ہے اور نہ اس کو یہ

پسند ہے کہ انسان خود اپنے اوپر ایسی سختی کرے۔ اور جہاں شریعت نے دو پہلو بتائے ہوں انسان ان میں سے آسان پہلو کو اختیار کرے۔

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر حیاء کا اس قدر حد سے زیادہ غلبہ ہوا کہ جب وہ قضائے حاجت کے لئے جاتے تھے تو استنجاء کے لئے ستر تو کھولنا ہی پڑتا ہے یا عورتوں کے ساتھ جماع کی نوبت آتی تھی تو مارے شرم کے وہ دوہرے ہو جاتے تھے جیسے ستر کھلا ہو اور کوئی دیکھ رہا ہو تو آدمی چمٹ جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے ﴿اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ﴾ وہ اپنے سینوں کو دوہرا کر لیتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ سے چھپے رہیں، یہ ان کی ایک خاص کیفیت تھی اور ان کا حال تھا لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جیسی عالی صفات ہستیوں کے لئے یہ حال پسند نہیں کیا گیا، چونکہ ان کو بھی امت کے لئے نمونہ بننا تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی کہ ضرورت کے موقع پر ستر کھولا گیا ہے تو یہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں، اگر یہی بات ہے تو پھر تم جسموں پر کپڑے پہنے ہوئے ہوتے ہو؛ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہوتے ہیں ﴿اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴾ اس وقت کیا کرو گے؟ گویا ان کو تنبیہ کی گئی کہ ہر موقع کا ایک ادب ہوتا ہے، اس کا لحاظ اسی وقت تک کرنا ہے۔

بہر حال! میں یہ عرض کر رہا تھا اور بات یہاں سے چلی کہ بہت سے اہل اللہ ہیں جن کو گناہِ صغیرہ کا بھی تصور نہیں آیا اور یہاں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات میں یہ صحابیہ جن سے زنا کا صدور ہوا، اس کا کیا سبب ہے؟ تو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: دیکھئے! اسلام نے جو سزائیں مقرر کی ہیں وہ سزائیں بھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں باقاعدہ جاری کی

جاتیں؛ تب ہی امت کو پتہ چلتا کہ یہ سزا ہے اور یوں جاری کی جاتی ہے۔ زنا کی سزا یہ ہے اور اس طرح کوڑے لگائے جائیں گے۔ شراب نوشی کی سزا یہ ہے اور یہ کوڑے اس طرح لگائے جائیں گے۔ زنا کے اوپر اس طرح سنگسار کیا جاتا ہے اور یہ سزا یوں دی جاتی ہے۔ مرد ہو تو اس کو یوں دی جائے گی اور عورت ہو تو اس کو اس طرح دی جائے گی۔ اب یہ چیزیں اگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے صادر نہ ہوئی ہوتیں تو امت کو یہ احکام کیسے معلوم ہوتے ؟ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قربان جایئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر کہ جنہوں نے اپنے آپ کو شریعت کی تکمیل کے واسطے پیش کیا، گویا انہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے زبانِ حال سے یوں کہا: ع ''تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر''

اور یہ گناہ ان سے صادر ہوئے اور شریعت کی سزا جاری کروانے کے واسطے انہوں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔

جیسا کہ ابھی مَیں نے آپ کے سامنے قصہ پیش کیا۔ حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو حضور دھکے دے کر نکلوا رہے ہیں اور وہ پھر آ رہے ہیں، چار چار مرتبہ ایسا ہوا، وہ آئے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آج ہم میں سے کون ہے بڑے سے بڑا؛ جس کو گناہ کرنے کے بعد وہ بے چینی ہو؛ جو اُن حضرات کو ہوا کرتی تھی؟ جس بے چینی نے اُن کو ختم کروانے کے واسطے پیش کر دیا۔ کوئی ان کو پکڑ کر تو نہیں لایا تھا؟ اُن کے خلاف کوئی گواہ تو قائم نہیں کئے گئے تھے؟ وہ تو ازخود آئے تھے اور حضور بار بار لوٹا رہے ہیں، واپس کر رہے ہیں، پھر بھی وہ آ رہے ہیں۔

اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ جس وقت ان کو سنگسار کر دیا گیا تو دو صحابی آپس

میں بات کرنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہ کو چھپایا تھا، پردہ پوشی کی تھی، یہ خود بھی اگر اپنے گناہ کو چھپاتا اور توبہ کرلیتا تو کیا ہو جاتا؟ اس طرح کتے کی موت تو نہ مرتا؟ یہ جملہ حضور ﷺ نے سنا تو کچھ نہیں فرمایا، آگے بڑھ گئے۔ کچھ دور پہنچے تو دیکھا کہ ایک مرا ہوا گدھا پڑا تھا اور اس کا جسم پھول گیا تھا اور ٹانگ بھی اکڑ کر کھڑی ہوگئی تھی، حضور ﷺ نے فرمایا: کہاں گئے وہ دونوں؟ ان کو بلایا اور فرمایا کہ اس میں سے کھاؤ۔ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ کوئی کھانے کی چیز ہے؟ اس کو کیسے کھایا جائے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اپنے بھائی کا گوشت کھایا اور اس کی جو آبروریزی کی؛ وہ اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ پھر حضور ﷺ نے قسم کھا کر حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا: خدا کی قسم! وہ تو اِس وقت جنت کی نہروں میں غوطہ لگا رہا ہے (مشکوۃ ص۳۱۶ از ابو داؤد۔ باب ما لا یدعی علی المحدود۔ فصل اول) دیکھئے! یہ ان حضرات کا مقام ہے۔

اور ان صحابیہ کا جو قصہ ہے اس کے متعلق حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عورت ہونے کے باوجود ان کی بے چینی دیکھئے۔ دوسری کتبِ حدیث میں روایت اس طرح بھی ہے کہ وہ آئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے پاک کیجئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا ہوا؟ کہا: مَیں نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: چلی جاؤ۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد آ کر کہتی ہیں: یارسول اللہ! میرے پیٹ میں تو زنا کی وجہ سے بچہ بھی ہے، مجھے پاک کیجئے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: دیکھو! تمہارے پیٹ میں بچہ ہے، جب تک وہ پیدا نہ ہو جائے؛ وہاں تک تجھ پر سزا جاری نہیں کی جاسکتی، اس لئے ابھی تو چلی جا۔ وہ چلی گئی، اس پر کوئی پہرہ مقرر نہیں کیا گیا، اس کے خلاف کوئی وارنٹ جاری نہیں کیا گیا۔ جب بچہ پیدا ہوا

تواس بچے کو لے کر آئی۔ کسی کو بلانے کے لئے نہیں بھیجا گیا اور اس نے کہا: یارسول اللہ! بچہ پیدا ہوگیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ابھی تو یہ تیرے دودھ کا محتاج ہے، اگر ابھی ماں کو سزا دے کر ختم کردیا جائے تو بچے کا کیا ہوگا؟ بچہ بڑا کیسے ہوگا؟ ابھی دودھ پلاؤ جب وہ تیرے دودھ سے بے پرواہ اور مستغنی ہوجائے؛ تب آنا۔ ایک زمانے کے بعد وہ پھر آئیں ایسی حالت میں کہ بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا اور وہ کھا رہا تھا، اور کہا: یارسول اللہ! اب تو یہ میرے دودھ کا محتاج نہیں رہا۔ حضور ﷺ نے بچہ اس کے پاس سے لے کر تربیت کے واسطے ایک اور شخص کے حوالے کیا اور پھر ان کے اوپر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔

روایت میں آتا ہے کہ اس کے انتقال کے بعد نبی کریم ﷺ نے جنازہ کی نماز پڑھائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ﴿تُصَلِّی عَلَیْهَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَقَدْ زَنَتْ؟﴾ اے اللہ کے رسول! اس نے تو زنا کا ارتکاب کیا تھا اور آپ اس کے جنازے کی نماز پڑھ رہے ہیں؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَیْنَ سَبْعِیْنَ مِنْ أَهْلِ الْمَدِیْنَةِ لَوَسِعَتْهُمْ﴾ اس عورت نے ایسی زوردار توبہ کی ہے کہ اگر مدینہ کے ستّر (۷۰) آدمیوں پر تقسیم کی جائے تو ان کے لئے کافی ہوجائے یعنی ان کے گناہ معاف ہوجائیں۔ پھر آگے حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿وَهَلْ وَجَدْتَ أَفْضَلَ مِنْ أَنْ جَادَتْ بِنَفْسِهَا لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ﴾ اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی کہ اس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے واسطے قربان کردیا۔ کوئی پکڑنے تو نہیں گیا تھا؟ اس نے اپنے آپ پر اللہ کے حکم کو جاری کرنے کے واسطے خود کو پیش کیا، اس نے کتنی اونچی توبہ کی؟

ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ جس وقت اس کو سنگسار کررہے تھے اس کے خون

کا کوئی قطرہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے جسم پر آ کر لگا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کوئی سخت جملہ کہا، اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر چنگی کا ایسا افسر جو ظلم کی انتہاء کو پہنچا ہوا ہو؛ وہ بھی اگر ایسی توبہ کر لیتا تو اس کی بھی معافی ہو جاتی۔

(مشکوۃ ص ۳۱۰ از مسلم کتاب الحدود فصل اول)

بہر حال دیکھئے! توبہ کے سلسلے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک شان تو یہ تھی، انہوں نے شریعت کی تکمیل کے لئے اور احکام کو لوگوں کے واسطے نمونہ بنا کر پیش کرنے کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا، یہ ان کی شان تھی، اس کی وجہ سے ان کے مقام اور مرتبے میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اہل سنت والجماعت کا یہ بھی ایک عقیدہ ہے کہ بڑے سے بڑا ولی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تمام امت میں افضل ہیں۔

﴿لالچ کسی حد پر نہیں ٹھہرتی ہے﴾

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں ﴿لَوْ أَنَّ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ أَنْ يَّكُوْنَ لَهُ وَادِيَانِ وَلَنْ يَّمْلَأَفَاهُ اِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ﴾ کہ انسان کی حرص اور لالچ کا حال یہ ہے کہ اگر اس کے پاس ایک وادی سونے کی بھری ہوئی ہو۔ دو پہاڑیوں کے بیچ کا جو خلا اور سپاٹ زمین ہوتی ہے اس کو وادی کہتے ہیں جس کو گجراتی میں (ખીણ) بولتے ہیں، بہت بڑا خلا ہوتا ہے کوئی معمولی نہیں، بڑے بڑے مکانات اور بڑی بڑی عمارتیں بن جاتی ہیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس ایک وادی سونے کی بھری ہوئی ہو، کوئی دو چار کوڑیوں کا تذکرہ نہیں ہے، یا دو چار کنٹینر (container) کا تذکرہ نہیں ہے، دو چار اسٹیمر (steamer)

کا تذکرہ نہیں ہے، ایک وادی جس میں کئی سو اسٹیمر (steamers) آسکتی ہیں۔ تو کہتے ہیں کہ پوری وادی سونے کی ہو تو انسان کی لالچ کا حال یہ ہے کہ وہ یوں تمنا کرے گا کہ دو ہو جائیں، دو ہوں تو تیسری کا، تین ہوں تو چوتھی کا، یوں سلسلہ جاری رہے گا۔ اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی کے منہ کو مٹی ہی بھرتی ہے۔ قبر کی مٹی بھرے گی یعنی جب تک زندہ ہے وہاں تک تو اس کا لالچ ختم ہوتا نہیں ہے، اسی لالچ میں تو معلوم نہیں انسان کیا کیا کر ڈالتا ہے۔ حالانکہ آدمی کی ضرورت کے لئے تھوڑا سا کافی ہوتا ہے۔ آپ دنیا میں ایسے تو بہت سارے لوگوں کو دیکھیں گے کہ ان کی ضرورت کے لئے بہت کچھ موجود ہے، پھر بھی وہ اپنے آپ کو اور زیادہ حاصل کرنے کے واسطے کھپا رہے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔

﴿لالچ کے نقصان سے اپنے آپ کو کیسے بچائے؟﴾

آگے حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿ویتوب اللہ علیٰ من تاب﴾ اسی لئے یہ روایت لائے ہیں کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر مہربانی فرماتے ہیں یعنی اگر وہ اپنے آپ کو گناہوں اور نافرمانی سے بچائے، حرص اور لالچ میں آکر نافرمانی کا ارتکاب نہ کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے؛ تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ مہربانی کا معاملہ کرتے ہیں۔

﴿توبہ کا کرشمہ﴾

ایک اور روایت ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں ﴿یَضْحَکُ اللّٰہُ سبحانہ وتعالیٰ اِلیٰ رَجُلَیْنِ یَقْتُلُ أَحَدُھُمَا الْاٰخَرَ، یَدْخُلَانِ الْجَنَّۃَ. یُقَاتِلُ ھٰذَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیُقْتَلُ. ثُمَّ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلیٰ الْقَاتِلِ، فَیُسْلِمُ فَیُسْتَشْھَدُ (مشکوۃ ص ۳۳۰)﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ دو آدمیوں کو دیکھ

کر بڑے خوش ہوتے ہیں اور ان سے راضی ہیں کہ ان میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کیا اور دونوں جنت میں جائیں گے۔ یہ کیسے؟ ایک کافر تھا، دوسرا مسلمان۔ دین کی خاطر دونوں میں جنگ ہوئی اور اس کافر نے مسلمان کو قتل کر دیا تو مسلمان شہید ہو گیا اور شہید ہو کر جنت میں چلا گیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کافر کو بھی ایمان کی توفیق دی اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید ہوا اور وہ بھی جنت میں چلا گیا، دونوں جنت میں، قاتل بھی اور مقتول بھی۔ دیکھو! اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو بھی ایمان کی توفیق مل جائے۔

تاریخ میں اس کی مثال

روایتوں میں ایک عجیب وغریب واقعہ آتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم تھے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے سوتیلے والد ہوتے ہیں، حضرت انسؓ کے والد کا انتقال ہو گیا تھا، ان کی والدہ نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے دوسرا نکاح کیا تھا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوتیلے ابا سے کہا کہ کوئی چھوٹا بچہ ایسا ہو جو گھر کے کام کاج میں مدد کرے؛ تو لے آؤ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ مجھے اونٹ پر بٹھا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے کہ یہ میرا بچہ ہے۔ اُس وقت اُن کی عمر دس سال کی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد دس سال مدینہ منورہ میں رہے، انھوں نے دس سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی حضور کی وفات کے وقت بیس سال کی عمر تھی۔ ان کے ماموں حرام بنِ مَلْحَانْ رضی اللہ عنہ تھے، غزوۂ بئرِ معونہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھیجا تھا اس جماعت میں یہ بھی تھے۔ اس قبیلے کے سردار کو دینے کے واسطے ان کو ایک خط بھی دیا تھا، وہ بڑا شریر تھا،

بعد میں کفر کی حالت میں ہی مرا، خط دینے کے لئے یہ پہنچے اور انھوں نے اس کو جب حضور ﷺ کا خط پیش کیا اور اس کو معلوم تھا کہ یہ لوگ آرہے ہیں تو اس نے پہلے سے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کر دیا تھا، یہ ادھر خط دے رہے تھے کہ پیچھے سے اس کے آدمی نے ان کو نیزہ مارا جس کی وجہ سے خون کا فوارہ نکلا، وہ صحابی اس خون کو ہاتھ میں لے کر چہرے پر مل رہے تھے اور بول رہے تھے ﴿فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ ﴾ کعبہ کے رب کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔ سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال ہو گیا تو جس نے بھالا مارا تھا وہ تو کافر تھا، بعد میں وہ لوگوں سے پوچھتا ہے کہ یہ کیا کہہ رہے تھے؟ ﴿فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ ﴾ یہ کامیابی کیسی؟ اس کو بتلایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شہید ہو گئے، اب تو سیدھے جنت میں جائیں گے۔ اس نے کہا: اچھا! پھر تو میں بھی ایمان لے آتا ہوں۔ وہ بھی مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

بہرحال! توبہ کا یہ کرشمہ ہے کہ کفر کی حالت میں ایک مؤمن کو قتل کیا تھا لیکن جب توبہ کر کے ایمان لے آئے اور اس کے بعد خود بھی شہید ہوئے تو وہ بھی جنت میں جائیں گے، دونوں جنت میں جائیں گے۔ یہ توبہ ہی کا کرشمہ بتلانا چاہتے ہیں۔

اس روایت کو لاکر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ توبہ کی وجہ سے آدمی کے گناہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معاف ہو جاتے ہیں۔

﴿ گنہ گار کے خلاف چار گواہ ﴾

دیکھئے! آدمی جب گناہ کرتا ہے تو علماء نے لکھا ہے کہ اس گناہ پر اللہ تعالیٰ کے یہاں چار گواہ قائم ہوتے ہیں، ایک تو جب وہ گناہ کرتا ہے تو زمین کے جس خطہ پر اس نے

گناہ کیا ہے، زمین کا وہ حصہ اس کے خلاف قیامت کے دن گواہی دے گا۔قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا﴾ کہ زمین اپنے سماچار (સમાચાર) اور خبریں دے گی۔ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ یہ آیت تلاوت فرمائی اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا: جانتے ہو اس کی خبریں کیا ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے روز زمین کا وہ حصہ جس پر آپ نے نیکی کا کام کیا ہے آپ کے حق میں گواہی دے گا اور گناہ کا کام کیا ہے تو آپ کے خلاف گواہی دے گا (ترمذی ۲/۱۷۳، ابواب التفسیر) جس زمانے میں یہ آیتیں اتری تھیں اس وقت یہ چیزیں عجیب سی معلوم ہوتی تھیں لیکن آج جب سائنس نے اتنی ترقیاں کی ہیں تو اب زمین کی گواہی کوئی بعید چیز معلوم نہیں ہوتی ہے۔آج کل تو ٹیپ ریکارڈ اور پتہ نہیں کیا کیا چیزیں ایجاد ہو چکی ہیں اور گناہ کا ثبوت پیش کرنے کے واسطے دیکھنے والے انسان ہی کا ہونا ضروری نہیں۔تو ایک گواہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ قائم کیا جاتا ہے۔

دوسرے گواہ فرشتے ہیں ﴿كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے اعمال لکھنے کے واسطے کچھ باعزت فرشتے ہیں، آدمی کوئی بھی کام کرتا ہے نیکی کا یا برائی کا؛ وہ ان کو معلوم ہے، وہ لکھ لیتے ہیں۔

تیسرا اس کا نامۂ اعمال جو اسی لئے لکھا گیا ہے ﴿وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ﴾ قیامت کے روز جب انسانوں کے اعمال نامے پھیلائے جائیں گے۔بلکہ قرآن پاک میں ہے کہ انسان کو اس کا نامۂ اعمال دے دیا جائے گا کہ تم خود اپنے عمل کو پڑھ لو کہ کیا ہے اور اس وقت جب اپنے نامۂ اعمال کو دیکھے گا تو چھوٹی چھوٹی باتیں جو دنیا میں خود کر کے

بھول گیا تھا؛ اس میں موجود پائے گا، تو کہے گا ﴿مَالِ هٰذَاالْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ کیا بات ہے یہ دستاویز اور ریکارڈ تو عجیب وغریب ہے، ہر چیز اس میں موجود ہے، چھوٹا گناہ کیا تھا؛ وہ بھی اس میں موجود ہے، بڑا گناہ کیا تھا؛ وہ بھی اس میں موجود ہے۔ کوئی چیز اس نے تو چھوڑی ہی نہیں ہے۔ آدمی یہ دیکھ کر پریشان ہو جائے گا۔

اور چوتھا گواہ اس کے اعضاء ہوں گے ﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ﴾ قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کام کاج قانون کے مطابق ہوگا، دنیا میں بھی کوئی کیسا ہی بڑا گنہگار ہو، کھلم کھلا گناہ کیا ہو، ساری دنیا نے اس کو گناہ کرتے ہوئے دیکھا ہو، تب بھی جب معاملہ کورٹ کچہری میں جائے گا؛ تو باقاعدہ کیس چلے گا۔ کام ہوتا ہے پانچ منٹ کا، لیکن گواہی اور ثبوت وغیرہ میں وقت لگ جاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی کام قانون سے ہوگا۔

﴿قیامت کے دن کارروائیاں قانونی ہوں گی﴾

قیامت کے روز تو خود نبیوں کو جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا میں بھیجا تھا کہ لوگوں تک اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچائیں، ان سے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں مطالبہ ہوگا کہ تم نے ہمارا پیغام پہنچایا؟ جلیل القدر انبیاءِ کرام میں سب سے پہلے پیغمبر حضرت نوح جن کے متعلق حدیث میں اوّلُ رسولٍ آیا ہے ان کو بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ ہم نے اپنا پیغام دے کر اپنے بندوں تک پہنچانے کے واسطے بھیجا تھا، رسول بنایا تھا، آپ نے پیغام پہنچایا؟ وہ کہیں گے: ہاں! پہنچایا تھا۔ ان کی امت کو بلائیں گے، ان سے سوال کیا جائے گا کہ ان کو بھیجا تھا، انھوں نے ہمارا پیغام پہنچایا؟ وہ یوں کہیں گے: نہیں! ہمارے پاس

تو کوئی نہیں آیا﴿مَا جَآءَ نَامِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ﴾ ہمارے پاس کوئی آیا ہی نہیں، ڈرانے والا، نہ خوشخبری سنانے والا، یہ کیسی بات کرتے ہیں۔اب حضرت نوح علیہ السلام سے باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا جائے گا: یہ تو یوں کہتے ہیں، تمہارے پاس کوئی گواہ ہیں؟ وہ کہیں گے : ہاں ! ہیں۔ باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا جائے گا : کون ہیں؟ تو حضرت نوح علیہ السلام امتِ محمدیہ کو گواہ میں پیش کریں گے، امتِ محمدیہ کو بلایا جائے گا، وہ گواہی دے گی کہ ہاں! حضرت نوح علیہ السلام نے پیغام پہنچایا تھا۔ گواہ کے اوپر جرح کی جاتی ہے(ઉલટ　તપાસ) کی جاتی ہے، تو امتِ محمدیہ سے کہا جائے گا کہ تم تو بہت دیر بعد دنیا میں آئے تھے؟ حضرت نوح کا زمانہ تو بہت پہلے کا ہے، پھر تم کیسے گواہی دیتے ہو؟ تو امتِ محمدیہ کہے گی کہ باری تعالیٰ! آپ نے اپنی کتاب قرآنِ پاک اپنے آخری نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی اور آپ کے اس کلام میں موجود ہے کہ نوح نے آپ کا پیغام اپنی قوم تک پہنچایا۔ آپ کے کلام ہی سے ہم کو معلوم ہوا، اس لئے ہم گواہی دے رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم امتِ محمدیہ کی تائید فرمائیں گے کہ ہاں! یہ صحیح کہتے ہیں، مَیں تائید کرتا ہوں۔ وہاں کام قانون سے ہوگا، کوئی بھی گنہ گار ہو، اس کے خلاف گواہ قائم کئے جائیں گے۔

حدیث میں آتا ہے کہ یہ کفار جنہوں نے گناہ کے کام کئے تھے اور کفر کیا تھا یا مشرکین جنہوں نے شرک کیا تھا وہ جب دیکھیں گے کہ یہاں تو گواہوں سے کام چلتا ہے تو کہیں گے: اچھا موقعہ ہے، گناہوں سے انکار کردو، چنانچہ وہ کہیں گے:﴿وَاللهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ خدا کی قسم! ہم نے شرک کیا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے یوں کہیں گے، ہم نے کیا ہی نہیں تھا، بالکل صاف مُکَر جائیں گے، صاف انکار کردیں گے۔اب وہ یوں سمجھ

رہے ہیں کہ ہمارے خلاف کون گواہی دے گا؟ باری تعالیٰ ان کی زبانوں اور ہونٹوں کو بند کردیں گے ﴿اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَ تُکَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ﴾ آج ہم ان کی زبانوں پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے اور دوسرے اعضاء گواہی دیں گے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں ران سب سے پہلے بولے گی۔ انسان ان اعضاء سے کہے گا کہ تمہاری خاطر تو مَیں نے یہ سب کچھ کیا تھا، آج تم ہی میرے خلاف گواہی دے رہے ہو؟ اللہ تعالیٰ گویائی کے لئے کسی عضو کا پابند نہیں ہے۔

﴿توبہ کی اسپرٹ﴾

بہرحال! یہ چوتھا گواہ ہے، انسان کے خلاف یہ چار گواہ ہیں، لیکن حدیث میں آتا ہے کہ جب انسان توبہ کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے وہ گناہ فرشتوں کو بھلا دیتے ہیں، زمین کے جس حصے پر وہ گناہ کیا تھا، اس حصے سے وہ علامتیں مٹادی جاتی ہیں، اور اس کے نامۂ اعمال میں سے بھی نکال دئے جاتے ہیں اور اس کے اعضاء سے بھی بھلا دئے جاتے ہیں، چاروں گواہ ختم ہوگئے، معافی لکھ دی گئی۔

﴿حاکمین اور احکم الحاکمین میں فرق﴾

ہمارے اکابرین نے لکھا ہے کہ دنیا میں تو یہ ہے کہ سرکار کی طرف سے اگر کسی کو معاف بھی کردیا جائے تب بھی ایک فائل محفوظ رکھی جاتی ہے، اس کا ریکارڈ محفوظ رکھا جاتا ہے کہ وقت پر کام آئے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کوئی چیز بھی محفوظ نہیں۔ بس بھائی! توبہ کی کہ سارا ریکارڈ بھی ختم ہوگیا۔ وہ غنی ہے، اس کو کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ سارے زمین و

آسمان بھر کر گناہ لے کر جاؤ، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی مغفرت کر دیتے ہیں۔ توبہ تو کرو، اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب گواہوں سے گناہوں کو بھلوا دیتے ہیں۔

﴿سچی توبہ کے بعد اس گناہ کا تذکرہ بھی نہیں کرنا چاہیے﴾

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں ان کا مقولہ پڑھا۔ وہ فرماتے تھے: جب تم نے سچے دل سے توبہ کر لی، تو اب گناہ کو بھول جاؤ اب اس کو بار بار یاد مت کرتے رہو، سچے دل سے توبہ کرنے کے بعد اس گناہ کو یاد کرنا؛ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتِ مغفرت کی ناقدری ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرما دیا: سچے دل سے توبہ کر لو؛ مَیں معاف کر دیتا ہوں۔ اب پھر یاد کر کے گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے گرچہ بھلا دیا، لیکن مَیں تو یاد رکھوں گا۔ یہ کیسی بات ہے؟ شیطان ترقی کو ناپسند کرتا ہے آدمی کو کسی کل چین لینے نہیں دیتا۔ ایک تو وہ آدمی گنہ گار ہے، گناہ سے توبہ کر کے آیا، اب شیطان دل میں وسوسے ڈالتا ہے کہ ارے! اتنے سارے تو گناہ کیے ہیں اب توبہ بھی کی؛ تو کیا ہوگا؟ وہ گناہ یاد دلواتا ہے۔

﴿پلّے باندھنے کی بات﴾

اس لیے کہتے ہیں کہ ماضی کو تو بھول جاؤ۔ توبہ کر لی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی سب معاملہ ختم کر دیا ہے، اب تو آپ کا کام نئے سرے سے چلے گا، حساب کتاب صاف ہو گیا، کلین (clean) ہو گیا۔ ماضی کو بھول جائیے، حال کو دھیان میں رکھئے اور درست کیجئے، مستقبل کا ابھی فکر نہیں کرنا ہے۔ اس وقت گناہوں سے بچیں۔ شیطان ماضی پر افسوس دلا کر اور مستقبل کا فکر ڈال کر حال سے غافل کر دیتا ہے۔ اور اصل تو حال ہے۔ یہ حال ابھی

کچھ دیر کے بعد ماضی بن جائے گا اور آنے والا مستقبل ہے، اس لئے اصلاً ہمیں فکر حال کی کرنی ہے کہ اس وقت جو موجودہ حالت ہے ہمیں اس میں یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے، اس میں کون سی کررہے ہیں اور جس سے منع کیا ہے، اس میں سے کس سے بچ رہے ہیں۔ کوئی گناہ تو اس وقت نہیں ہو رہا ہے۔ دو ہی چیزیں ہیں گناہوں سے بچو اور طاعات اور نیکی کا اہتمام کرو۔ بس! پہنچ گئے۔ حال کو درست کرلیا، سب معاملہ ٹھیک ہوگیا۔ یہ تو شیطان کی ایک چال ہے کہ آپ کو اِدھر اور اُدھر، پیچھے اور آگے میں پھانس کر حال سے غافل کردے۔ وہ تو آپ کو ضائع کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے سچے دل سے توبہ کرلی، اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں بھی آپ کے گناہ معاف کردئے گئے، اب بھول جاؤ۔ اور حال کو درست کرو، مستقبل کی فکر مت کرو۔ یہی حال آگے بڑھتا رہے گا اور مستقبل حال میں تبدیل ہوتا رہے گا اور معاملہ ٹھیک ہوجائے گا۔

توبہ...... راہِ سلوک کا پہلا قدم

بہرحال! یہ توبہ ہی اصل ہے۔ دیکھئے! آدمی جب راہِ سلوک میں قدم رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اہل اللہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرتا ہے؛ تو سب سے پہلے وہ توبہ ہی کراتے ہیں۔ اَوَّلُ اَقْدَامِ المریدین اہلِ ارادت کا اولین قدم توبہ ہے بزرگوں کے پاس جب آپ بیعت ہونے کے لئے جاتے ہیں تاکہ ان کی نگرانی میں، ماتحتی میں اور سرپرستی میں اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کریں، چونکہ وہ اس راہ کو طے کئے ہوئے ہیں، اس راہ کے نشیب وفراز سے واقف ہیں، تو ایک آدمی جو راہ چل چکا ہو، تو نئے لوگ چلے ہوئے کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہیں؛ تاکہ ہمارے لئے آسانی رہے۔ لہٰذا ان کی

نگرانی اور سرپرستی میں جب سلسلہ شروع کیا جاتا ہے تو سلوک کی سب سے پہلی منزل توبہ ہے۔ جب بیعت کرتے ہیں تو کیا کراتے ہیں؟ توبہ ہی کراتے ہیں کہ اب تک جو گناہ ہوئے ہیں، اس سے توبہ کرو اور آئندہ کے لئے پکا عہد کرو کہ اب میں ان گناہوں کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ یہی تکمیلِ توبہ ہے۔ یہ اولین منزل ہے۔ تو اصل توبہ ہے۔ ہم لوگ ابھی توبہ ہی کو مکمل کئے ہوئے نہیں ہوتے ہیں اور معلوم نہیں کون سے بڑے بڑے مقامات کو حاصل کرنے کی حرص رکھتے ہیں۔ ایں خیال است و محال است و جنوں والا معاملہ ہے۔

اجمالی توبہ اور تفصیلی توبہ

دیکھئے! شروع میں جب توبہ کی تفصیل بتلائی تھی تو ایک بات بتلانا بھول گیا تھا۔ وہ بھی بتلا دوں کہ توبہ میں ایک شکل تو یہ ہے کہ جب گناہوں سے مجلس میں بیٹھ کر توبہ کرنا چاہتے ہیں تو گناہوں کو یاد کر کے توبہ کریں، جیسے نمازیں چھوٹی ہیں، قضا ہوئی ہیں، ان سے توبہ کی۔ یہ سب تو اجمالی توبہ ہوئی۔ تفصیلی توبہ یہ ہے کہ ان میں سے جن کی تلافی ممکن ہے؛ ان کی تلافی میں لگ جائیے۔ بھئی! آج تک کی ہماری عمر تیس سال کی ہوئی، آج تک تو نمازیں نہیں پڑھیں، اب اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور توبہ کی اور آئندہ کے لئے پکا ارادہ کر لیا کہ نمازوں کا اہتمام کریں گے، لیکن یہ جو نمازیں چھوٹی ہیں، توبہ کی وجہ سے ان کا گناہ تو معاف ہوگیا، لیکن اس کی تلافی کرنی ہے، نمازیں ادا کرنی ہے۔ تفصیلی توبہ یہ ہے کہ آپ آج ہی اپنی ڈائری میں لکھ لیجئے کہ آج فلاں تاریخ کو میرے اوپر اتنے دنوں کی نمازیں قضا کرنی باقی ہیں، اس طرح حساب لگالو، آدمی بالغ اس وقت ہوتا ہے کہ اس کو احتلام ہوجائے یا لڑکی ہو تو اس کو حیض آجائے یا پندرہ سال کی عمر ہوجائے تو بالغ ہوگیا، وہیں سے

نماز کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اب تیس سال پر جا کر توفیق ہوئی؛ تو پندرہ سال کی نمازوں کی قضا کرنی ہے۔ لہٰذا آج تاریخ لکھ لیجئے کہ آج ۱۹/۱ اکتوبر کو میرے اوپر پندرہ سال کی نمازوں کی قضا واجب ہے، اور مَیں اس کو شروع کر رہا ہوں، اگر اس کے پورا کرنے سے پہلے میری موت آجائے؛ تو میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے مال میں سے اس کا فدیہ ادا کیا جائے۔ یہ اس کے لئے ضروری ہے۔

﴿حقوقِ واجبہ کی وصیت ضروری ہے﴾

دیکھو! حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ وہ آدمی جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کے اوپر دو راتیں ایسی نہیں گذرنی چاہئیں کہ کوئی قابلِ وصیت چیز ہو اور اس کی وصیت لکھی ہوئی موجود نہ ہو (مشکوۃ ص ۲۶۵ باب الوصایا فصل اول از بخاری و مسلم) ہماری نمازیں باقی ہیں، روزے باقی ہیں، بہت سارے حقوق باقی ہیں، اتنی ساری تو وصیت کی چیزیں ہیں اور پھر بھی ہم وصیت تیار نہ رکھیں؟ وصیت تو ہمارے پاس ہر حال میں موجود رہنی چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان باتوں پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے اور سچی پکی توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

۔۔۔دعا۔۔۔

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ لَااِلٰہَ اِلَّااللہ اْلاَحَدُالصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدًا. لَااِلٰہَ اِلَّااللہ اْلحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِیْعُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ ذُوْالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ. اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کُلُّہٗ وَلَکَ الشُّکْرُ کُلُّہٗ وَلَکَ الْمُلْکُ کُلُّہٗ وَاِلَیْکَ یَرْجِعُ الْاَمْرُ کُلُّہٗ. اَللّٰھُمَّ

لَآاُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَاوَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰیٓ اٰلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍصَلٰوۃً تُنَجِّیْنَابِهَا مِنْ جَمِیْعِ الْاَهْوَالِ وَالْاٰفَاتِ وَتَقْضِیْ لَنَا بِهَا جَمِیْعَ الْحَاجَاتِ وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِیْعِ السَّیِّئَاٰتِ وَتَرْفَعُنَابِهَاعِنْدَکَ اَعْلَی الدَّرَجَاتِ وَتُبَلِّغُنَا بِهَآ اَقْصَی الْغَایَاتِ مِنْ جَمِیْعِ الْخَیْرَاتِ فِی الْحَیٰوۃِ وَبَعْدَالْمَمَاتِ. اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر.

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔ اے اللہ! ہم بے حد گنہ گار ہیں۔ گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اے اللہ! تو محض اپنے فضل و کرم سے ہمیں گناہوں کے دلدل میں سے نکال دے۔ اے اللہ! تو ہماری، ہمارے والدین کی، ہمارے اہل وعیال کی، ہمارے بھائی بہنوں کی، ہمارے اعزاء واقارب کی، اساتذہ ومشائخ کی، دوست واحباب کی، محسنین ومتعلقین کی، جنہوں نے ہم کو دعاؤں کے لئے کہا یا لکھا، یا جو ہم سے دعاؤں کی توقع اور امید رکھتے ہیں ان کی اور تمام مؤمنین و مؤمنات، مسلمین ومسلمات پوری امتِ محمدیہ کی مغفرت فرما۔ اے اللہ! تو ہمارے چھوٹے اور بڑے ظاہر و پوشیدہ اگلے اور پچھلے سارے گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری سیئات کو حسنات سے مبدّل فرما۔ اے اللہ! نبی کریم ﷺ کے طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! مجلس میں جتنے بھی موجود ہیں سب کی پورے پوری مغفرت فرما کر بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ اور بھی جن لوگوں نے اپنے بیماروں کی صحت کے لئے دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں اے اللہ! ان تمام کے بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی

ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما۔ جن کی اولاد شادی کی عمر کو پہونچ چکی ہے ان کو صالح جوڑ عطا فرما۔ جن کے لئے شادی کے اسباب نہیں ہیں عافیت کے ساتھ ان کو نکاح کے اسباب مہیا فرما۔ اے اللہ! جو بے اولاد ہیں ان کو اولادِ صالح عطا فرما۔ جن کی اولاد نافرمان ہے ان کو مطیع وفرمانبردار بنادے جو لوگ نرینہ اولاد کے خواہش مند ہیں ان کو نرینہ اولاد عطا فرما۔ اے اللہ! جو لوگ جیلوں میں بند ہیں، ایک مدت سے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ٹاڈا کے نام سے گرفتار ہے؛ اے اللہ! ان تمام کو عافیت کے ساتھ رہائی نصیب فرما۔ اے اللہ! محض اپنے فضل سے سب کے لئے رہائی مقدر فرما، اپنا خصوصی فضل فرما۔ اس امت کے حال پر رحم فرما۔ اے اللہ! جن لوگوں پر مقدمات ہیں عافیت کے ساتھ ان کو بری فرمادے۔ اے اللہ! جن کی جو جو حاجتیں ہیں محض اپنے فضل وکرم سے پوری فرما۔ اس مجلس میں جتنے بھی موجود ہیں سب کے دلوں کے بھید سے اور دلوں کے حال سے تو واقف ہے اور تیرے خزانے بھرے ہوئے ہیں، اے اللہ! سب کی جائز مرادیں محض اپنے فضل سے پوری فرما۔ اے اللہ! حضور اکرم ﷺ نے جتنی خیر وبھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہم کو عطا فرما اور حضور اکرم ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہیں اے اللہ! ان سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہماری دعاؤں کو محض اپنے فضل وکرم سے قبول فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

وَصَلیٰ اللّٰہُ تُعَالیٰ عَلیٰ خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ...

﴿صدائے درد دِل﴾

مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو گناہ اس لئے کرتا ہے کہ میں توبہ کرلوں گا اور توبہ اس لئے نہیں کرتا کہ ابھی زندگی لمبی ہے حالانکہ یہ نہیں جانتا کہ میری زندگی بہت تھوڑی ہے۔امام غزالیؒ ایک کتاب میں فرماتے ہیں۔''

اے دوست! تجھے کیا معلوم! بازار میں وہ کپڑا پہونچ چکا ہو جس سے تیرا کفن بننا ہے''۔یقیناً یہ انسان دھوکہ میں پڑا ہوا ہے۔

غنیمت سمجھ زندگی کی بہار......آنا نہ ہوگا یہاں بار بار

(خطبات ذوالفقار)

دردبھری دعاء

آہ جاتی ہے فلک پہ رحم لانے کے لئے
بادلو! ہٹ جاؤ دیدو راہ جانے کے لئے
اے دعا ! ہاں عرض کر عرش الٰہی تھام کے
اے خدا رخ پھیر دے اب گردش ایام کے
خَلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
خوار ہیں بد کار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں
رحم کر اپنے نہ آئین کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

صبر
مجلس ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. امابعد.

﴿صبر کے کچھ فضائل﴾

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْئٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ (سورۂ بقرۃ ۱۵۵) باری تعالیٰ فرماتے ہیں: کہ ہم تم کو کچھ خوف اور ڈر اور بھوک اور مال وجان اور پھلوں میں کمی کے ذریعہ سے آزمائیں گے، اور اے محمد! آپ صبر کرنے والوں کو بشارت سنا دیجئے۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ أَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (سورۂ زمر ۱۰) جو صبر کرنے والے ہیں ان کو پورے پورا ثواب بغیر حساب کے دیا جائے گا۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ﴾ کہ جو آدمی صبر سے کام لے اور درگزر کرے، اپنے ساتھ زیادتی کرنے والے کو معاف کردے ﴿اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ بیشک یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے (سورۂ شوریٰ ۴۳)

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ (سورۂ بقرۃ ۱۵۳) صبر اور نماز کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کرو، اللہ تبارک وتعالیٰ صبر کرنے

والوں کے ساتھ ہے۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِيْنَ (سورۂ محمد۔۳۱) ہم تم کو برداشت میں آزمائیں گے تاکہ جان لیں کہ تم میں سے کون لوگ جہاد کرنے والے اور صبر کرنے والے ہیں۔

یہ کچھ آیتیں صبر کے سلسلہ میں پیش کیں اور آگے احادیث کو پیش فرمائیں گے۔

﴿صبر کا صحیح مفہوم﴾

ہم لوگ صبر کا ایک مفہوم اپنے ذہنوں میں بٹھائے ہوئے ہیں کہ کسی کے اوپر کوئی مصیبت آجائے اور اس مصیبت میں وہ تحمل سے کام لے یا کسی بیماری میں گرفتار ہوگیا اور اس نے جزع فزع نہیں کیا یا کسی عزیز قریب کا انتقال ہوگیا اور دھاڑیں مار مار کر نہیں رویا تب ہم یوں سمجھتے ہیں کہ اس نے صبر کیا، یہ صحیح ہے، جن چیزوں کو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ صبر ہے، یہ بھی صبر ہے۔لیکن صبر کا مفہوم اور مطلب انہیں چیزوں تک محدود نہیں۔

امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مفردات القرآن'' میں صبر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے ﴿حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰى مَايَقْتَضِيْهِ الشَّرْعُ وَالْعَقْلُ ﴾ کہ شریعت اور عقل جن چیزوں کا تقاضہ کرتی ہے ان کو انجام دینے کے لئے آدمی کا اپنے نفس کو جمانا اور ان کو کرنے کے واسطے اپنے نفس کو ثابت قدم رکھنا۔مثلاً شریعت نے نماز کا حکم دیا، تو یہ نماز کی بجا آوری کوئی آسان کام نہیں ہے، مثلاً فجر کی نماز کے لئے آدمی کو بڑا مجاہدہ کرنا پڑتا ہے کہ آدمی اپنی نیند چھوڑ کر بستر کو خیرباد کہہ کر اُٹھے، سردی کا زمانہ ہے تو پھر وضو کی زحمت بھی برداشت کرے اس کے بعد پھر نماز میں مشغول ہو، نماز کے لئے کھڑا رہنا اور نماز پوری ہونے تک

اس میں متوجہ رہنا، نماز کے تمام ارکان، واجبات اور مستحبات وغیرہ کی ادائیگی کا اہتمام کرنا؛ یہ ساری چیزیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ آدمی خوب صبر اور تحمل سے کام لے۔

﴿جلد بازی سے نماز ناقص رہ جاتی ہے﴾

بہت سے لوگ جلد بازی کے اندر جلدی جلدی ان چیزوں کو انجام دے کر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے نماز ناقص رہ جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ ایک موقعہ پر مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے ایک اعرابی آئے، جلدی جلدی نماز پڑھی اور واپس جاتے ہوئے حضور اکرم ﷺ کو دیکھا تو سلام کیا ﴿السلام علیک یا رسول اللہ﴾ حضور اکرم ﷺ نے جواب دیا ﴿وعلیک السلام﴾ اور یہ بھی فرمایا ﴿اِرْجِعْ فَصَلِّ فَاِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ﴾ متفق علیہ (مشکوۃ ۷۵) کہ واپس جاؤ اور اپنی نماز دوبارہ پڑھو کہ تم نے نماز نہیں پڑھی کیونکہ عجلت سے کام لیا تو بہت ساری چیزیں چھوٹ گئیں، جس اطمینان اور سکون سے نماز کے افعال ادا کرنے چاہئیں؛ وہ آپ نے ادا نہیں کیئے۔

تو ظاہر ہے کہ آدمی کا نفس تو یہ چاہتا ہے کہ جلدی سے بھاگے، لہٰذا نفس کے تقاضے کو دبا کر نماز کی ادائیگی کے لئے جو محنت اور مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے اس کو برداشت کرنا اور اس کی ادائیگی کے لئے اپنے آپ کو جمانا، نفس کو روکنا، اور نفس کے تقاضے کو دبانا، یہی صبر ہے۔

﴿عقل کے تقاضے پر جمے رہنے کی مثال﴾

اسی طرح بعض مرتبہ عقل کا تقاضہ ہوتا ہے مثلاً آدمی بیمار ہے اور بیماری کے اندر کڑوی دوا استعمال کرنا، نفس تو نہیں چاہتا کہ کڑوی دوا کو استعمال کرے لیکن عقل اس کے

خلاف اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ ابھی اس تھوڑی سی کڑواہٹ کو برداشت کر لیجئے اس کے نتیجہ میں جب صحت حاصل ہو جائے گی، اللہ تبارک وتعالیٰ تندرست کر دیں گے اس کے بعد بہت ساری مٹھاسیں استعمال کرنے کے قابل ہو جاؤ گے اور اگر اس کڑواہٹ کو برداشت نہیں کیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیشہ کے واسطے مٹھاس کے استعمال سے محروم ہو جاؤ، تو عقل نے جس کام کا تقاضہ کیا تھا اس کی انجام دہی کے واسطے نفس کو روکا اور جمایا۔

اسی طریقہ سے بعض چیزوں سے شریعت اور عقل رکنے کا تقاضہ کرتی ہے، ان چیزوں سے رکنے کے واسطے نفس کو جمانا، نفس ان چیزوں سے رکنا نہیں چاہتا لیکن مشقت برداشت کر کے تکلیف اٹھا کر نفس کو ان چیزوں سے رکنے کے لئے آمادہ کریں؛ اس کا نام بھی صبر ہے۔

تو مطلب یہ ہے کہ شریعت یا عقل جن کاموں کی انجام دہی کا تقاضہ کرتی ہے ان کی انجام دہی کے لئے یا جن کاموں سے باز رہنے کا تقاضہ کرتی ہے ان کاموں سے باز رہنے کے لئے نفس کو آمادہ کرنا اور نفس کو اس کے اوپر جمانا؛ یہ صبر ہے۔ لہٰذا میں نے صبر کا جو مفہوم آپ کے سامنے پیش کیا اس میں بڑی وسعت ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت افشانی

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آدمی جن حالات سے گذرتا ہے ان کو اگر دیکھا جائے تو وہ دو قسم کے ہیں۔ بعض وہ حالات ہیں جو آدمی کی طبیعت کے موافق ہیں اور بعض حالات وہ ہیں جو آدمی کی طبیعت کے خلاف ہیں، ان دونوں حالات میں صبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔

﴿موافق حالات میں صبر کی زیادہ ضرورت﴾

جو حالات طبیعت کے موافق ہیں مثلاً آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تندرست جسم عطا فرما رکھا ہے، تندرستی ہے، سلامتی ہے، مال ودولت کی کثرت ہے، اولاد کی کثرت ہے، اور اہل خاندان کی کثرت ہے، ماننے والے، محبت رکھنے والے، عقیدت رکھنے والے ان کی بھی تعداد بڑی ہے، عہدہ بھی ہے، منصب بھی ہے، حکومت بھی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ دنیا کے ہر طرح کے اسباب بھی موجود ہیں، کسی چیز کی کوئی کمی نہیں، یہ سارے حالات وہ ہیں جو آدمی کی طبیعت کے موافق ہیں، ان حالات میں بھی صبر کی ضرورت پڑتی ہے۔

بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ طبیعت کے موافق حالات کے اندر صبر کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے اور ان حالات میں آدمی کا صبر سے کام لینا یہ زیادہ سخت ہے اُن حالات کے مقابلہ میں جو طبیعت کے خلاف ہیں۔ اسی لئے احادیث میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ جملہ آتا ہے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا جملہ کتبِ حدیث میں موجود ہے۔ وہ فرماتے ہیں ﴿اُبْتُلِیْنَا بِالضَّرَّآءِ فَصَبَرْنَا وَابْتُلِیْنَا بِالسَّرَّآءِ فَلَمْ نَصْبِرْ﴾ (ترمذی شریف ۴/۶۴۲) کہ ہم تکلیفوں کے ذریعہ سے آزمائے گئے تو ہم نے صبر سے کام لیا اور ہم راحت وآرام اور نعمتوں کے ذریعہ سے آزمائے گئے تو ہم صبر نہیں کر سکے۔ تو آدمی یوں نہ سوچ لے کہ جو حالات طبیعت کے موافق ہیں ان کے اندر صبر کی ضرورت نہیں پڑتی۔

﴿مال میں صبر کی ضرورت﴾

اسی طرح مال موجود ہے تو اس وقت بھی صبر کی ضرورت ہے، اولاد ہے تو اس میں بھی صبر کی ضرورت ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ

وَلَاأَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ ﴾ اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تم کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ کردیں۔ معلوم ہوا کہ مال بھی کبھی آدمی کو اللہ سے ہٹانے کا اور اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر جو سلاطینِ مغلیہ کے سب سے آخری تاجدار ہیں ان کا ایک شعر حضرت قاری طیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی تقاریر میں بار بار سنا:

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے ☆ ہو چاہے جیسا بھی صاحبِ فہم وذکاء
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی ☆ جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

آدمی کیسا ہی سمجھدار، عقل اور ہوشیاری والا ہو لیکن اگر عیش وآرام کے حالات میں اس نے اللہ کو یاد نہیں رکھا، اللہ کو بھول کر حرکتیں کرتا رہا اور غصے اور طیش کی حالت کے اندر اللہ کا ڈر نہ رکھا تو ایسا آدمی آدمی کہلانے کے لائق نہیں۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ﴾ تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں ان سے بچ کر اور ڈر کر رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ اولاد اور ازواج جو آدمی کو اللہ کے حکم پر عمل کرنے سے مانع بن جائیں، رکاوٹ بن جائیں، ظاہر ہے وہ آدمی کے دشمن بنے۔ معلوم ہوا کہ نعمت یعنی وہ حالات جو آدمی کی طبیعت کے موافق ہیں ان میں بھی آدمی مطمئن ہو کر نہ بیٹھے کہ صبر کی ضرورت نہیں، بلکہ اگر کسی آدمی کو خوب پیسہ ملا ہوا ہو؛ تو اسے بہت زیادہ اپنے نفس کو ضبط کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، ایک آدمی بھوکا ہے اور اس کے پاس روٹی بھی موجود نہیں اس کے لئے صبر کرنا آسان ہے لیکن اگر اس کے سامنے لذت بھرے اور بالکل عمدہ

قسم کے کھانے موجود ہیں تو اس حالت میں اس کے لئے صبر کرنا مشکل ہے، اسی طرح آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی طبیعت کے موافق چیزوں سے نواز رکھا ہے، مال و دولت کی ریل پیل ہے، حکومت بھی ہے، منصب بھی ہے، اور بہت کچھ موجود ہے، اولاد بھی ہے، تو اس صورت میں آدمی کے لئے صبر کی ضرورت زیادہ ہے۔

مال میں صبر کیسے حاصل ہو؟

اور وہاں صبر کا مطلب یہ ہوگا کہ ان چیزوں کے جو حقوق ہیں ان کی ادائیگی کا اہتمام کرے اور یوں سمجھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے مال عطا فرمایا، صحت وتندرستی عطا فرمائی، اولاد عطا فرمائی، خوبصورت بیوی عطا فرمائی، منصب اور عہدہ عطا فرمایا، دنیا کی راحت وآرام کے دوسرے اسباب بھی عطا فرمائے، یہ ساری چیزیں جو اللہ نے مجھے دے رکھی ہیں یہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں، اور معلوم نہیں یہ امانت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کب واپس لے لی جائے، جب تک یہ امانت میرے پاس موجود ہے اس کے مالک نے اس میں جتنا اختیار مجھے دے رکھا ہے اسی کے مطابق میں اس کو استعمال کروں اور اس سے زیادہ اس میں مشغول نہ رہوں یہ ہے اس امانت کا تقاضہ اور اس کے حق کی ادائیگی۔

اسراف منع ہے

مال تو بہت سارا ہے لاکھوں روپے اللہ تعالیٰ نے دے رکھے ہیں اب ان لاکھوں روپیوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ ان کو فضول اڑاتے رہیں، بے جا صرف کرتے رہیں، آپ کی کھانے پینے کی ضرورت دس روپے سے پوری ہوجاتی ہے، اور وہاں پر آپ ایک ہزار اور ایک لاکھ روپے خرچ کردیں اس کی اجازت نہیں دی گئی، مال آپ کی ملکیت

ہے اس کے باوجود شریعت نے پابندی رکھی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کچھ حدود قائم کیئے گئے ہیں۔

﴿وضو میں بھی اسراف ہے﴾

شریعت تو عبادتوں کی ادائیگی میں بھی حد سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتی آپ وضو کررہے ہیں، ظاہر ہے کہ وضو جو نماز جیسی بڑی عبادت کا ایک ذریعہ ہے، وہ خود بھی عبادت ہے اگرچہ وہ عبادتِ مقصودہ نہیں غیر مقصودہ ہے لیکن ہے عبادت۔اس وضو کرنے کے دوران ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی احادیث میں آتا ہے نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا وضو میں بھی فضول خرچی ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جی ہاں ﴿وَاِنْ كُنْتَ عَلٰى نَهْرٍ جَارٍ﴾ (رواہ احمد وابن ماجہ، مشکوۃ ۴۷) چاہے بہنے والی نہر پر بیٹھ کر آپ وضو کررہے ہیں تب بھی اگر آپ ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کریں گے تو اس کا نام فضول خرچی ہے۔مثلاً وضو میں تین مرتبہ چہرہ دھونا چاہیے، آپ بجائے تین مرتبہ کے چار مرتبہ دھوئیں گے تو یہ سنت سے تجاوز ہے اور فضول خرچی میں شمار ہے، چار مرتبہ دھونے کی اجازت نہیں۔شریعت نے ایک حد بتلادی اس سے زیادہ آپ استعمال کریں گے تو یہ فضول خرچی میں شمار ہوگا۔تو جو شریعت عبادات تک میں ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے کی اور فضول خرچی کرنے کی اجازت نہیں دیتی وہ مباحات میں اور ہماری جو فطری ضروریات ہیں ان کی ادائیگی اور انجام دہی میں ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے کی کیسے اجازت دے گی۔

﴿خرچ کرنے اور نہ کرنے کا ایک بہترین اصول﴾

صحابۂ کرام ؓ اس گُر کو سمجھے ہوئے تھے، ہمارے حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے بار بار یہ سنا کہ ایک مرتبہ ایک ضرورت مند نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور اپنی ضرورت پیش کی، نبی کریم ﷺ کے پاس اس وقت کچھ تھا نہیں جس سے آپ ﷺ اس کی ضرورت پوری فرما سکتے تو آپ ﷺ نے اس آدمی سے یوں کہا کہ عثمان کے پاس جاؤ اور ان سے کہنا وہ تمہاری ضرورت پوری کریں گے۔ وہ آدمی حضرت عثمان ؓ کے پاس پہنچا، رات کا وقت تھا جب یہ ان کے مکان کے دروازے کے قریب پہنچا تو اس نے سنا کہ حضرت عثمان ؓ خود اپنی اہلیہ سے کوئی بات تنبیہ کے لہجے میں کہہ رہے ہیں، وہ کھڑا رہ گیا اور سنا کہ حضرت عثمان ؓ اپنی اہلیہ کو تاکید کر رہے تھے کہ تم نے چراغ کی لو ذرا تیز کر رکھی ہے اور اس کی وجہ سے تیل زیادہ جل رہا ہے اس کو دھیما کرو، حضرت عثمان ؓ اس طرح ڈانٹ رہے تھے، اس بات پر اپنی اہلیہ کو تنبیہ فرما رہے تھے اور اہلیہ بھی نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی تھیں، اس آدمی نے جب سنا تو سوچا کہ آدمی اپنی بیوی کے لئے تو سب کچھ قربان کرتا ہے اور یہاں یہ تو چراغ کی لو ذرا تیز ہے اس میں بھی بیوی کو ڈانٹ رہے ہیں اور تنبیہ کر رہے ہیں اور بیوی بھی نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی ہیں، بھلا یہ میری ضرورت کیا پوری کریں گے؟ وہ بجائے اس کے کہ ان کے سامنے اپنی بات رکھتا لوٹ آیا، دوسرے موقع پر نبی کریم ﷺ سے اس کی ملاقات ہوئی، حضور ﷺ نے پوچھا: بھئی! کیا ہوا تمہاری ضرورت پوری ہوئی؟ وہ خاموش رہا، پھر حضور ﷺ نے پوچھا: کیا بات ہے؟ اس نے کہا میں گیا تو تھا لیکن ان کے سامنے اپنی بات نہیں رکھی۔ پوچھا: کیوں؟ اس نے وجہ بتائی۔ آپ نے فرمایا:

ایسا نہیں ہے تم جاؤ اور اپنی ضرورت ان کے سامنے رکھو، اب حضور ﷺ نے تاکید کی تو وہ دوبارہ گیا اور بات کی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فوراً اس کو بڑی فراخ دلی کے ساتھ بہت کچھ دیا، جب وہ دے چکے اس کے بعد اس نے کہا: حضرت! میں اس سے پہلے بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا لیکن یہ صورت پیش آئی اس لئے واپس ہوگیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بھائی! تم سمجھے ہی نہیں، ہم کو جہاں خرچ کرنے کے لئے کہا گیا ہے وہاں سب کچھ خرچ کریں گے اور جہاں خرچ نہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے وہاں آدھا پیسہ بھی خرچ کرنے کے لئے ہم تیار نہیں ہیں۔

دیکھئے! کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس مال و دولت کی کمی تھی؟ معلوم ہوا کہ مال اگر میرے پاس ہے، لاکھوں روپے موجود ہیں، میں مالک ہوں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس کو اُڑاؤں۔ میرا نفس تو چاہے گا کہ اُڑاؤ، خوب گل چھرے اُڑاؤ، لباس میں بھی فضول خرچی کرو، کھانے پینے میں بھی کرو، سامان میں بھی کرو، مکان بنانے میں بھی کرو، سب چیزوں میں فضول خرچی سے کام لو۔

چیزوں میں بھی ’’لایعنی‘‘ ہے

آج کل تو ’’لایعنی‘‘ کا باب بہت بڑھ گیا ہے۔ ایک مرتبہ ہمارے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ افریقہ جانا ہوا تھا (آج کل تو مکانوں کے اندر بھی زینت کیلئے بہت کچھ ہوتا ہے) ایک صاحب کے گھر میں ایک بہت بڑا پوٹ (pot) تھا جیسے کہ آج کل گھروں میں ہوتے ہیں، حضرت نے پوچھا: یہ کس کام کا ہے؟ کہا: یہ ایسے ہی رکھا ہے تو حضرت نے کہا: ہاں! جیسے باتوں میں لایعنی ہوتی ہے اسی طریقے سے چیزوں میں بھی لایعنی ہے۔ اب

جوغریب آدمی ہے اس کے یہاں تو ایسا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس کے پاس تو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی پیسہ نہیں لیکن جن کو اللہ تعالیٰ نے دولت سے نواز رکھا ہے تو وہاں ہوتا یہ ہے کہ زینت کے لئے گھر میں یہ چیز لائے وہ چیز لائے، ویسے دیکھا جائے تو اس کے بغیر کوئی کام اٹکا ہوا نہیں۔ حضرت سے کسی نے عرض کیا: حضرت! اب علاج کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا: روزانہ ایک ایک چیز نکالتے رہو تو لایعنی سے نجات مل جائے گی۔

بہرحال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ صبر کے معنی ہیں نفس کو روکنا، ظاہر ہے کہ نفس بے تحاشہ خرچ کرنا چاہتا ہے، اب نفس کو روکنا اسی کا نام صبر ہے۔ دولت کی ریل پیل میں صبر کی ضرورت پیش آئی۔

آپ کے پاس منصب اور عہدہ ہے آپ کا منصب آپ کا عہدہ اور آپ کی کرسی آپ کو کچھ آگے بڑھنے کے لئے کہہ رہی ہے، حدود سے تجاوز کرنے کے لئے کہہ رہی ہے آپ کا نفس تقاضہ کر رہا ہے آپ اس کو دبایئے تو کہا جائے گا کہ آپ نے صبر کیا۔

صبر کی ضرورت ہر جگہ

تو حقیقت یہ ہے کہ صبر کی ضرورت ہر جگہ پڑتی ہے۔ آدمی یوں سمجھتا ہے کہ صبر کی ضرورت صرف ناموافق حالات میں پڑتی ہے؛ ایسا نہیں ہے، موافق حالات میں بھی صبر کی ضرورت پڑتی ہے، پیسہ موجود ہے تو صبر کی ضرورت ہے، اولاد ہے تو صبر کی ضرورت ہے۔

اولاد میں صبر کی ضرورت

اولاد کے متعلق بھی یوں آیا ہے کہ اولاد کہیں آپ کو اللہ سے غافل نہ کردے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿الولدُ مَبْخَلَةٌ مَجْبَنَةٌ او کما قال علیہ الصلوۃ والسلام﴾ کہ اولاد آدمی کو بخیل

بنانے والی ہے، بزدل بنانے والی ہے۔ (رواہ احمد، مشکوۃ ۴۰۳)

آدمی کو جہاں میدانِ جنگ میں بہادری کے جوہر دکھلانے چاہئیں وہاں کبھی آدمی بزدل بن جاتا ہے، کاہے کی وجہ سے؟ یہ سوچ کر کہ میں مرجاؤں گا تو میری اولاد کا کیا ہوگا، اسی کے خیال میں تو بزدلی آتی ہے؟ مال خرچ کرنا ہے لیکن سوچتا ہے کہ میں خرچ کرتا رہوں گا تو اولاد کا کیا ہوگا؟ تو اولاد بزدل بھی بناتی ہے اور بخیل بھی بناتی ہے۔

نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ خطبہ دے رہے تھے، اس دوران آپ نے دیکھا کہ آپ کے نواسے، حضرت فاطمہؓ کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سرخ قمیص پہنے ہوئے اور لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں، خطبہ دیتے دیتے نبی کریم ﷺ نے ان کو اس حالت میں دیکھا، آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں گر نہ جائیں، آپ نیچے اترے اور ان کو اپنے ساتھ اٹھا کر لے آئے، اپنے سامنے بٹھالیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا: ﴿اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (رواہ الترمذی وابوداود والنسائی، مشکوۃ ۵۷۱) اور حضور اکرم ﷺ نے ایک موقع پر وہ جملہ بھی ارشاد فرمایا کہ یہ اولاد آدمی کو بخیل بنانے والی، بزدل بنانے والی ہے۔

﴿تندرستی کا صحیح استعمال﴾

بہرحال! نعمت والی حالت میں بھی صبر کی ضرورت پڑتی ہے، اللہ تعالیٰ نے تندرستی اور صحت عطا فرمارکھی ہے تو اس تندرستی اور صحت میں آدمی معلوم نہیں کیا کیا کرنا چاہتا ہے، اس وقت اپنی اس تندرستی کو اللہ کی مخلوق کی خدمت کے لئے استعمال کرنے والا بنے کہ میں اپنی اس صحت کے ذریعہ سے اپنے اس بدن کے ذریعہ سے کسی کو اگر فائدہ پہونچا سکتا ہوں کسی کی خدمت کرسکتا ہوں تو مجھے کرنی چاہیئے، دنیا میں بہت سارے کمزور ایسے ہیں جو

خدمت کے محتاج ہیں، میں ان کی جتنی بھی ہو سکے خدمت کروں، تو اپنے بدن کی صحت کو اور تندرستی کو مخلوق کی خدمت کے لئے استعمال کرنا چاہیے۔

﴿مال کا صحیح استعمال﴾

مال ہے تو اس مال کے حقوق کو ادا کرنے کا اہتمام کرنا، اسی طریقہ سے اگر اولاد ہے تو ان کے حقوق پورے کرنا، اوران کے ذریعہ سے بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہونے کی نوبت نہ آئے اس کا اہتمام کرنا یا اللہ تعالیٰ نے حکومت کے عہدہ اور منصب سے نواز رکھا ہے یا اور کچھ دنیوی اسباب آپ کے پاس موجود ہیں تو ان تمام چیزوں میں صبر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اس میں آدمی بے قابو ہو جاتا ہے۔ان ساری چیزوں میں آدمی یوں سمجھے کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی میرے پاس امانت ہے کسی نے آپ کو پیسے دے رکھے ہیں اور ساتھ ہی اجازت بھی دے رکھی ہے کہ تمہیں ضرورت ہو تو ضرورت کے مطابق استعمال کرنا۔ چاہے ہمارے پاس لاکھوں روپے موجود ہوں لیکن یہ اللہ کی امانت ہیں اور ہمیں تو اس میں سے ضرورت کے مطابق ہی استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، ضرورت سے زیادہ استعمال کریں گے اسی کا نام فضول خرچی ہے اور فضول خرچی کے متعلق قرآن وحدیث میں ممانعت آئی ہے ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیَاطِیْن﴾ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، میں ابھی بتلا چکا کہ عبادات کی ادائیگی میں بھی قرآن وشریعت نے فضول خرچی کی اجازت نہیں دی تو پھر ہماری دوسری چیزوں میں یعنی طبعی اور فطری ضروریات کی ادائیگی میں کیسے فضول خرچی کی اجازت ہوگی؟

﴿حساب کیوں؟﴾

معلوم ہوا کہ ہم اگر یوں سمجھیں کہ یہ پیسہ میرا ہے میں جس طرح چاہوں استعمال کروں؛ یہ صحیح نہیں ہے، کل کو اللہ میاں کے یہاں حساب دینا ہوگا، یہ امانت تھی تب ہی تو حساب دینا ہے ورنہ حساب کی کیا ضرورت پیش آئی؟

حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿لَاتَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ﴾ کہ انسان کے قدم اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے سے قیامت کے روز ہٹ نہیں سکتے یہاں تک کہ پانچ چیزوں کے متعلق اس کو سوال نہ کیا جائے ﴿عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا أَفْنَاهُ﴾ ایک تو عمر کے متعلق کہ عمر کو کہاں خرچ کیا؟ ﴿وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا أَبْلَاهُ﴾ جوانی کو کہاں لگایا، جوانی کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا، معلوم ہوا کہ صحت جوانی تندرستی یہ اللہ کی نعمت ہے ﴿وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ أَيْنَ اِكْتَسَبَهُ وَ فِيْمَا أَنْفَقَهُ﴾ اور مال کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ ﴿وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ﴾ اور جو علم اللہ نے دیا تھا اس پر کتنا عمل کیا۔ یہ پانچ چیزیں ہیں۔ لہٰذا مال کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں سوال ہوگا۔ (رواہ الترمذی، مشکوۃ ۴۴۳)

﴿حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حساب کتاب﴾

نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فرمایا: میں نے دیکھا کہ وہاں تم بہت دیر میں میرے پاس پہنچے، میں تو تمہارے متعلق ذرا اندیشہ میں پڑ گیا تھا اور خطرہ محسوس کر رہا تھا لیکن دیر میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مال کا حساب وکتاب دینے میں لگے تھے۔ تو آدمی طبیعت کے موافق حالات میں بھی صبر کا محتاج ہے۔

اوران حقوق کی ادائیگی کا نام ہی شکر ہے اوران حقوق کی ادائیگی کے لئے صبر کی ضرورت ہے، تو شکراور صبر دونوں ساتھ ہی لگے ہوئے ہیں۔

﴿مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی حقوق ہیں﴾

مال میں صرف زکوٰۃ کی ادائیگی سے کام نہیں چلتا اگرچہ زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہے لیکن حدیث پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ اشادفرماتے ہیں ﴿اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوٰی الزَّکوٰةِ﴾ (مشکوٰۃ ۱۶۹) کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور حقوق بھی ہیں جواللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں یہ زکوٰۃ تو فرض ہے لیکن اگر کوئی غریب کوئی محتاج آگیا، آپ نے دیکھا کہ فوری طور پر اس کی امداد کی ضرورت ہے، امداد کردی، آپ کے پاس سواری ہے، کوئی آدمی اچانک کسی سے ٹکرا گیا اور ایکسیڈنٹ ہوگیا اب اس کو ہسپتال پہنچانا ہے، آپ اپنی سواری کے ذریعہ جلدی سے پہنچادیجئے۔ تو مطلب یہ ہے کہ موافق حالات میں بھی آدمی کو صبر کی ضرورت ہے۔ نفس تو بہت کچھ حدود سے تجاوز کرنا چاہے گا، لذتوں میں مشغول ہونا چاہے گا، آگے بڑھنا چاہے گا، لیکن آپ اس کو ایسا کرنے نہ دیں۔

﴿صبر کی قسمیں﴾

اسی لئے صبر کے بھی مختلف حالات میں مختلف نام رکھے گئے ہیں۔ مثلاً مالداری کے اندر یہ نفس جو فضول خرچی کر کے آگے بڑھنا چاہتا ہے اس کو روکنا؛ اسی کا نام ''ضبط النفس'' ہے، اس صبر کو ''ضبطِ نفس'' سے تعبیر کیا اور اگر کوئی اس طرح نہ روکے بلکہ اتراہٹ اور فضول خرچی میں مبتلا ہوجائے تو اس کو ''بطر'' سے تعبیر کیا ہے۔ قرآنِ پاک میں ہے:

﴿وَلَاتَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْامِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًاوَّرِئَآءَ النَّاسِ﴾

ترجمہ:- اورتم ان لوگوں جیسے نہ بنو جو اپنے گھروں سے نکلے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لئے۔

﴿ناموافق حالات کی تین قسمیں﴾

ناموافق کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی طبیعت کے خلاف اوراس کی پسند کے خلاف جوحالات پیش آتے ہیں، ان کی تین قسمیں کردی ہیں ایک تو وہ جوآدمی کے اختیار میں ہے یعنی آدمی اپنے اختیار سے اس کوانجام دیتا ہے۔اوردوسرے وہ جس کا آنا تو اختیار میں نہیں لیکن دفاع آدمی کے اختیار میں ہے۔اورتیسری وہ صورت کہ جس کا آنا بھی آدمی کے اختیار میں نہیں اور دفاع بھی آدمی کے اختیار میں نہیں۔

آنا بھی آدمی کے اختیار میں نہیں اوردفاع بھی آدمی کے اختیار میں نہیں جیسے ''مصائب''۔کوئی مصیبت آگئی تو مصیبت کا آنا بھی ہمارے اختیار میں نہیں اوراس کا ہم سے دورہونا بھی ہمارے اختیار میں نہیں۔

''بیماری ہے'' اب بیماری اللہ تعالیٰ نے دے دی تو آئی۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ تندرستی عطا فرمائیں گے تب جائے گی۔اس کا آنا بھی ہمارے اختیار میں نہیں اور جانا بھی ہمارے اختیار میں نہیں۔

اور مثلاً اعضاء کے اندرکوئی فساداور بگاڑ پیدا ہوگیا وہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ مال کے اندرکوئی دوسری مصیبت آگئی وہ بھی اسی قبیل سے ہے۔تو یہ سارے حالات جن کا آنا بھی ہمارے اختیار میں نہیں اور جانا بھی ہمارے اختیار میں نہیں۔ بلکہ بعض مرتبہ تو آتی ہے پھر جانے کا نام نہیں لیتی ،مثلاً کسی عزیز قریب کا انتقال ہوگیا، بیٹا تھا وہ مرگیا، یہ ایک مصیبت ہے،اب دوبارہ تو وہ آنے والا نہیں، وہ تو گیا،اسی طریقہ سے مثلاً کسی کی بینائی چھن گئی کوئی عضو ہی کٹ گیا یا ایسی کوئی مصیبت آگئی جس میں دوبارہ تندرستی کا کوئی سوال

ہی نہیں پیدا ہوتا؛ تو اس میں بھی آدمی کو صبر سے کام لینا چاہیے، مشقتوں کو برداشت کرنا چاہیے؛ یہ بھی صبر ہے۔ عام طور پر لوگ جو صبر کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ انہیں معنوں کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ ان حالات میں صبر کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

دوسری قسم

دوسری قسم وہ حالات جو آدمی کو غیر اختیاری طور پر پیش آتے ہیں، لیکن ان کا دور کرنا آدمی کے اختیار میں ہے، وہاں پر آدمی اپنے نفس کو قابو میں کرے۔ مثلاً کسی آدمی نے آپ کے ساتھ کوئی طبیعت کے خلاف بات کردی اس نے آپ کو گالی دے دی، تھپڑ مار دیا آپ کو جانی نقصان پہنچایا، مالی نقصان پہنچایا، یا آپ کے ساتھ کوئی اور نامناسب حرکت کردی؛ وہاں پر آپ اپنے انتقامی جذبے کو کام میں لاکر اس کا جواب دینے کی اگر طاقت رکھتے ہیں، تو اس کو دور بھی کر سکتے ہیں، وہاں پر بھی صبر کرنے کی تاکید ہے، آپ صبر سے کام لیجئے اور اس سے انتقام لے کر اپنے نفس کو تشفی نہ دیجئے۔

حضور ﷺ کے صبر کا انداز

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ روایت پیش کریں گے، بخاری شریف میں بھی موجود ہے۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے پاس خمس کا کوئی مال آیا تھا، غنیمت میں سے پانچواں حصہ بیت المال کے لئے نکالا جاتا ہے وہ پانچواں حصہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا گیا آپ نے وہ چند ایسے لوگوں میں جو نئے نئے اسلام لائے تھے اور ان کی دلجوئی کی ضرورت تھی؛ تقسیم کردیا، اس تقسیم پر ایک صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے یوں کہا کہ یہ ایک ایسی تقسیم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے جب یہ جملہ سنا تو کہا: میں حضور ﷺ کو اس کی اطلاع کروں گا، چنانچہ انہوں نے آکر نبی کریم ﷺ کو اطلاع دی، تو آپ کو یہ بات ناگوار ہوئی لیکن پھر فرمایا: حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس سے بھی زیادہ ایذاء پہنچائی گئی لیکن انھوں نے صبر سے کام لیا (بخاری ۴/۱۵۷۶) پھر حضور ﷺ نے بھی اس پر کوئی کارروائی نہیں فرمائی، آپ پر اس کا کوئی ری ایکشن (ردعمل) نہیں ہوا، آپ نے صبر سے کام لیا اور برداشت کیا۔

﴿صبر سے اوپر کا درجہ﴾

صبر سے اوپر کا درجہ یہ ہے کہ جس نے آپ کے ساتھ آپ کی طبیعت کے خلاف معاملہ کیا ہے اس کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کیا جائے مثلاً کوئی رشتہ دار ہے اس نے آپ کے ساتھ کوئی برا سلوک کیا تو یہ نہیں کہ آپ صرف برداشت ہی کرلیں بلکہ برداشت کرنے کے بعد آپ اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آیئے، شریعت یہ تعلیم دیتی ہے ﴿صِلْ مَنْ قَطَعَکَ﴾ (مجمع الزوائد ۸/۱۸۸) کہ جو رشتہ دار آپ کے ساتھ رشتہ داری قطع کرے، رشتہ داری کے تقاضہ کے خلاف کوئی کام کرے، آپ کو تکلیف پہنچائی، آپ کو گالی دی اور مالی جانی نقصان پہنچایا آپ اس سے صلہ رحمی کا معاملہ کیجئے یعنی آپ اس کے ساتھ احسان کا سلوک کیجئے۔ اسی لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ﴿لَیْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُکَافِیْ (رواہ البخاری، مشکوٰۃ ۴۱۹)﴾ کہ جو آدمی برابر کا بدلہ دے وہ کوئی صلہ رحمی کرنے والا نہیں۔

﴿عام مزاج﴾

ہم لوگوں کا مزاج یہ بنا ہوا ہے کہ بھائی نے اگر ہمارے ساتھ کوئی اچھا سلوک کیا

تو ہم بھی بھائی کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔نہیں کیا تو نہیں کریں گے۔اگر یہی بات ہے تو پھر بھائی ہونے والے رشتے کا آپ نے کیا لحاظ کیا؟ اچھا سلوک تو کوئی پرایا آدمی کرے گا؛ تب بھی ہمارا جی یہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں،اس میں بھائی کی کیا خصوصیت رہی۔بھائی کا مطلب تو یہ تھا کہ وہ چاہے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے بلکہ برا سلوک کرے لیکن چونکہ وہ بھائی ہے،اس کے ساتھ رشتہ داری ہے،نسبی تعلق ہے اس کا تقاضہ ہے کہ آپ معاف کرکے اس کے ساتھ اچھا معاملہ کیجئے؛ تب ﴿صِلْ مَنْ قَطَعَکَ﴾ پر عمل ہوا۔یہاں یوں کہا گیا کہ بجائے اس کے کہ آپ بدلہ لیں احسان کیجئے۔

﴿حسن سلوک کا اثر......آج نہیں تو کل﴾

آج کل تو بدلہ لینے کا معاملہ بہت آگے بڑھ گیا۔جہاں دیکھو! ذرا ذرا سی بات کے اندر آدمی بدلہ کو سوچا کرتا ہے،حالانکہ بدلہ لینے سے یہ معاملہ اور یہ حساب کتاب بیباق نہیں ہوتا،کھاتہ بند نہیں ہوتا بلکہ یوں سمجھئے گویا آپ نے بدلہ لے کر مستقل ایک الگ چوپڑا ہی قائم کردیا،اس لئے کہ اگر آپ نے بدلہ لیا تو اب وہ بھی بدلے کی کوئی کاروائی کرے گا پھر آپ کریں گے،گویا ایک سلسلہ شروع ہوگیا اس کی کوئی انتہاء نہیں،اب کچھ مدت کے بعد آپس کی اس عداوت اور دشمنی کے نتیجہ میں جب دونوں پریشان ہوں گے اس کے بعد اپنی اس پریشانی کو دور کرنے کے لئے معاملہ ختم کریں گے۔تو جو چیز اتنے سارے بگاڑ کے بعد آپ کرنے والے ہیں؛ اگر پہلے روز کرلی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا:-

آں چہ کند دانا کند ناداں ☆ لیک بعد از خرابیٔ بسیار

کہ عقلمند آدمی جو کام کرتا ہے بیوقوف بھی وہ کام کرتا ہے لیکن بہت خرابی کے بعد یعنی بہت

معاملہ بگڑ گیا آخر میں پھر اس کو بھی عقل میں آتی ہے، اس کی کھوپڑی اور سمجھ میں بھی آتی ہے کہ یہ جھگڑے والا مسئلہ ٹھیک نہیں، چلو صلح کرلو۔ کب صلح کر رہے ہیں؟ اس وقت کر رہے ہیں کہ یہ بھی برباد ہو گیا وہ بھی برباد ہو گیا، اس کے بعد اب صلح کی نوبت آئی۔ ارے بھائی! پہلے سے معافی تلافی کا معاملہ کرلیا ہوتا اور اس نے چاہے آپ کے ساتھ برا معاملہ کیا، اگر آپ حسنِ سلوک سے پیش آئے ہوتے تو یہ ساری نوبت ہی نہ آئی ہوتی، چاہے نفس پر ذرا بھاری تو معلوم ہوتا ہے لیکن کل ایک وقت آئے گا کہ آپ جب اس کے ساتھ ﴿أَحْسِنُ اِلیٰ مَنْ أَسَآءَ اِلَیْکَ﴾ (جو تمہارے ساتھ برائی کرے آپ اس کے ساتھ اچھائی کا معاملہ اور احسان کا سلوک کیجئے) پر عمل کرتے رہیں گے تو آخر کب تک؟

ع... دل ہی تو ہے؛ نہ ہے سنگ وخشت

آدمی کا دل ہے، انسان کا دل ہے، اثر تو قبول کرتا ہی ہے، آج نہیں تو کل، وہ بہر حال ایک دن سوچنے پر مجبور ہو گا کہ میری طرف سے برابر اس کے ساتھ زیادتیاں ہو رہی ہیں اور یہ میرے ساتھ بھلائی اور احسان کا سلوک کر رہا ہے، تو آخر وہ بھی شرمائے گا اور پچھتائے گا؛ پھر آپ کے لئے پچھتانے کی نوبت نہیں آئے گی، ندامت کا جذبہ اس میں پیدا ہو گا، الحمدللہ آپ کا ہاتھ تو اوپر رہے گا۔

بہر حال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ جتنی قسمیں ہیں اس میں مصیبت تو غیر اختیاری طور پر آئی، تکلیف پہنچانے والے نے آپ کو تکلیف پہنچائی اس میں آپ کے اختیار کو دخل نہیں تھا، لیکن آپ جواب میں اپنے نفس کے جذبے کو تشفی دینے کے واسطے کوئی کاروائی نہیں کر رہے ہیں؛ یہ بھی صبر ہے۔ یہ دوسری قسم ہے۔

﴿تیسری قسم ''صبر علیٰ الطاعات''﴾

اور تیسری قسم بتلائی تھی وہ کام جس میں آدمی کے اختیار کو دخل ہے آدمی اپنے اختیار سے جن کاموں کو انجام دیتا ہے، وہ بھی دو قسم کے ہیں:-

(۱) ایک تو طاعات عبادات اور نیکیوں کے قبیل سے ہے۔

(۲) دوسرے معاصی، نافرمانیاں اور گناہوں کے قبیل سے ہے۔

تو طاعات یعنی نیکی کے کام کی انجام دہی کے اندر بھی آدمی کو صبر سے کام لینا پڑتا ہے، آدمی روزہ دار ویسے تو نہیں ہوتا، روزہ رکھنے کے واسطے آدمی کو کتنا تحمل اور صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ نماز کے متعلق جیسا میں شروع میں عرض کر چکا کہ جو آدمی نمازوں کا اہتمام کرتا ہے اس کو بڑے صبر سے کام لینا پڑتا ہے، نفس کے تقاضوں کو دبانا پڑتا ہے، مثلاً نماز کا وقت آ گیا، ادھر خوب گاہک دکان کے اندر موجود ہیں، لیکن آپ یوں سوچ کر کہ میں جماعت کا ثواب لینے کے لئے جاؤں گا، چاہے گاہک چلے جائیں، گاہک بعد میں آنے والے ہوں گے تو آئیں گے، آپ ان کو چھوڑ کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے نکل پڑے، یہ مجاہدہ نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ کو صبر سے کام لینا پڑا۔

زکوٰۃ کی ادائیگی میں بھی یہی بات ہے۔ نفس کو تو مال کی محبت لگی ہوئی ہے، وہ مال نکالنا نہیں چاہتا لیکن آپ اس کے باوجود بخل کے تقاضے کو دبا کر مال خرچ کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجا لا رہے ہیں تو یہ عبادات کی ادائیگی کے اندر جو مشقت ہوتی ہے اس کو آدمی جو برداشت کرتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ وہی ﴿**حبس النفس علیٰ مایقتضیه العقل أو الشرع**﴾ شریعت جس بات کا تقاضہ کرتی ہے اس کو انجام دینے کے واسطے ہم نے اپنے

نفس کے تقاضوں کو دبایا اور ختم کیا اور نفس کو اس کے اوپر آمادہ کیا، ثابت قدم رکھا، اس کو صبر علی الطاعات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

﴿نفس کی فطرت میں ربوبیت﴾

بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ آدمی کے نفس میں فطری طور پر عبودیت اور بندگی مفقود ہے یعنی آدمی کے نفس کی طبیعت کے اندر بندگی اور عبدیت نہیں ہے بلکہ اس کی طبیعت کے اندر ربوبیت ہے یعنی وہ اپنے آپ کو بڑا بنانا چاہتا ہے۔ بعض عارفین فرماتے ہیں: فرعون نے دعویٰ کیا تھا ﴿أنا ربكم الاعلىٰ﴾ اس نے تو اس کو اپنی زبان سے ظاہر کیا تھا لیکن ہر انسان کا نفس اس دعویٰ کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، فرعون کے پاس اسباب مہیا تھے، اس کے پاس موقع محل تھا، اس کی قوم اس کے سامنے سپر ڈالے ہوئی تھی اور مقابلہ نہیں کر رہی تھی؛ تو اس نے تو اپنے اس دعویٰ کا اظہار کر دیا۔ لیکن ہر آدمی کا نفس یہی دعویٰ کر رہا ہے اور اپنے اس دعویٰ کو چھپائے ہوئے ہے۔

﴿ربوبیت کا ظہور﴾

چنانچہ جو اس کے ماتحت ہوتے ہیں، اس کے محبین، اس کے خادم، اس کے غلام، اس کے نوکر چاکر، ان کے ساتھ اس کا معاملہ کیا ہوتا ہے؟ اگر خدانخواستہ ان کی طرف سے ذرا سی بات طبیعت کے خلاف پیش آجائے تو دیکھ لو حضرت کا مزاج کیسا ہوتا ہے؟ وہی ''انا ربكم الاعلىٰ'' کا ظہور ہو جاتا ہے۔

تو فرماتے ہیں کہ یہ صبر علیٰ الطاعات یعنی نیکی کے کاموں کے لئے آدمی کو مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے، یہ بھی صبر ہے اور اس کی بھی بڑی فضیلت آئی ہے اور جہاد کے

اندر جو صبر کیا جاتا ہے، نماز کی ادائیگی میں کیا جاتا ہے؛ یہ بھی صبر کی ہی قسم ہے۔

﴿صبر عن المعاصی﴾

دوسری قسم کہ جس میں آدمی کے اختیار کو دخل ہے وہ ''صبر عن المعاصی'' ہے۔ یعنی گناہ کا کام کرنے کو آدمی کا جی چاہتا ہے، نفس تو زنا کے لئے بہت تقاضہ کرتا ہے، چوری کیلئے آمادہ ہے، شراب نوشی کے لئے آمادہ ہے، کسی کو گالی دینے کے لئے آمادہ ہے، کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے آمادہ ہے، لیکن آپ اس کو روکیں، اس کے تقاضہ کو دباویں؛ تو یہ بھی صبر ہے۔ یہ صبر ''صبر عن المعاصی'' ہوا۔

تو جتنے بھی گناہ کے کام ہیں ان تمام کاموں کے کرنے کے لئے آدمی کا نفس تقاضہ کرتا ہے، آدمی اپنے نفس کے ان تقاضوں کو دباوے اور اس میں جو مشقت اور محنت برداشت کرنی پڑتی ہے اس محنت اور مشقت کو جھیلے؛ اسی کا نام ہے ''صبر عن المعاصی'' یعنی گناہوں کے مقابلہ میں صبر سے کام لینا۔

اب اس میں بھی وہ گناہ جس کا آدمی عادی بن چکا ہے اس میں صبر کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے۔ اس لئے کہ ایک تو عادت کی وجہ سے اس کا ایک فطری سا تقاضہ ہو گیا اور نفس کی شہوت تو تھی ہی؟ لہٰذا عادت اور شہوت نے مل کر اس شراب کو دو آتشہ بنا دیا اور اب تو ایسا شدید تقاضہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت صبر کرنا آدمی کے لئے بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

﴿غیبت آسان گناہ ہے لیکن......تباہ کن﴾

پھر خاص کر وہ گناہ کے کام جن میں کوئی زیادہ مشقت بھی برداشت نہیں کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً ''غیبت'' کہ اگر اس کی عادت پڑ گئی ہے۔

غیبت کس کو کہتے ہیں؟ کسی کی غیر حاضری میں اس کے متعلق ایسی بات کہنا جس سے اس کی تنقیص ہو، اس پر عیب لگتا ہو، اس کی ذات پر، اس کے متعلقات پر، اس کی بیوی، اس کے بچے، یا اس کی چیزوں کی کوئی برائی بیان کرنا کہ اگر وہ سن لے تو اس کو ناگوار معلوم ہو، یہ غیبت ہے۔ اب اس میں آدمی کو کیا مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ ہر گناہ کے لئے کچھ نہ کچھ محنت مجاہدہ کرنا پڑے گا، زنا کے لئے بھی کچھ اسباب اختیار کرنے پڑیں گے، سامنے والے فریق کو راضی کرنے کے لئے معلوم نہیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ لیکن غیبت کرنے کے لئے کیا ہے؟ دو چھدام کی زبان ہے اس کو ہلا دی اور جو چاہا بول دیا۔

''جھوٹ بولنا'' کہ اگر اس کی عادت ہے تو یہ گناہ بھی بڑا آسان ہے۔ اسی طریقہ سے جھگڑا کرنے کی عادت ہے۔ بعض لوگوں کو اپنی بڑائی اور اپنی تعریفیں کرنے کی عادت ہوتی ہے، جب آپ ان کے پاس بیٹھیں گے تو وہ اپنا ہی تذکرہ کرتے رہیں گے اور اپنی ہی ہانکتے رہیں گے۔ اب یہ گناہ بھی ایسا ہے کہ جس میں کوئی زحمت نہیں بلکہ بس بک بک کئے جاتا ہے اور پھولا نہیں سماتا، اس کے اندر کیا مشقت ہے؟ حالانکہ یہ بھی گناہ ہے۔

بدنگاہی آسان لیکن...... بڑی خطرناک

مثلاً ''بدنگاہی'' نامحرم کو دیکھنا، ایسی عورتیں جن کے ساتھ نکاح کرنا شریعت نے جائز رکھا ہے اور وہ آپ کے نکاح میں نہیں ہیں؛ وہ نامحرم کہلائیں گی، اب ایسی عورتوں کو دیکھنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی، اور اس گناہ میں کون سی تکلیف ہے؟ بلکہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: یہ تو ایسا گناہ ہے کہ مولوی صاحب مولوی صاحب

رہے، قاری صاحب قاری صاحب رہے، مبلغ صاحب مبلغ صاحب اور متقی صاحب متقی رہے، اور کوئی زد پڑتی ہی نہیں، لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلتا یعنی اگر آپ بدنگاہی کرلیں گے تو کون دیکھنے آئے گا؟ کس کو پتہ چلے گا؟ لیکن اللہ تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں، ہماری نگاہیں کسی اور کو دیکھ رہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہماری نگاہ کو دیکھ رہے ہیں، اگر یہ تصور ہو تو بدنگاہی کی نوبت نہیں آئے گی، لیکن یہ بدنگاہی والا گناہ ایسا ہے کہ اگر اس کی عادت پڑگئی ہے تو ایک تو یہ کہ اس میں کوئی زحمت بھی نہیں، بڑا آسان ہے اور پھر کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

لیکن علماء نے لکھا ہے کہ نگاہ کا تیر جب نکلتا ہے تو سامنے والے کو تو بعد میں زخمی کرے گا تیر والے کو پہلے زخمی کرتا ہے، اور آدمی یوں سمجھتا ہے کہ میں دیکھوں گا تو دیکھنے کی وجہ سے پیاس بجھے گی، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ دیکھنے کی وجہ سے پیاس اور بڑھتی ہے اور دوبارہ سہ بارہ دیکھنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور اس میں کوئی نوجوانوں کی ہی خصوصیت نہیں، نوجوان ہوں، ادھیڑ ہوں، بوڑھے ہوں؛ سب برابر ہیں۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: اس میں تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا، اس لئے کسی کی کوئی قید ہی نہیں، بوڑھے بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ گناہ ایسا خطرناک ہے۔

تو عرض یہ کر رہا تھا کہ اگر گناہ اور وہ بھی ایسا کہ جس کی عادت پڑی ہوئی ہو اور وہ بھی پھر ایسا کہ بہت آسان ہو، اس کے کرنے میں بالکل تکلیف نہ ہو؛ تو اس سے تو بچنا اور صبر کرنا بڑا سخت اور بڑا خطرناک ہے۔ اور ایسے گناہوں سے بچنے کے لئے آدمی کو زحمت برداشت کرنا پڑتی ہے۔

﴿بدنگاہی سے کیسے بچا جائے؟﴾

حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ کے ایک مرید تھے انھوں نے حضرت کولکھا کہ حضرت! مَیں نگاہ کوروک نہیں سکتا اور بدنگاہی سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا۔تو حضرت نے فرمایا: کہ بھائی دیکھو! جب تم کر سکتے ہوتو رُک بھی سکتے ہو،اس لئے کہ فلسفہ کا قاعدہ ہے کہ آدمی کی جوقدرت ہوتی ہے وہ دونوں چیزوں سے متعلق ہے،یعنی جوآدمی کسی کام کے کرنے کی طاقت رکھتا ہےتواس سے رُکنے اور بچنے کی بھی طاقت رکھتا ہے،کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو بچنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا، جوکام اس سے غیر اختیاری طور پر سرزد ہوتا ہے وہاں بچنے کا سوال نہیں۔جیسے یہ انگلی مَیں اپنے اختیار سے ہلا رہا ہوں تو اپنے اختیار سے روک بھی سکتا ہوں،اور اگر کسی آدمی کو بیماری ہے اور ہاتھ خود بخود ہل رہا ہے وہ اپنے ارادہ سے ہلا نہیں رہا ہے؛ تو وہ روک بھی نہیں سکتا۔تو حضرت نے فرمایا کہ یہ کہنا کہ مَیں اپنی نگاہ کو روکنے پر قادر نہیں ہوں؛ یہ غلط ہے۔ پھرانہوں نے لکھا کہ حضرت! جب نہیں دیکھتا ہوں تو دل میں عجیب سی بے چینی پیدا ہوتی ہے،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل بے چینی کی وجہ سے ختم ہو جائے گا اور موت آجائے گی،دل میں یوں آتا ہے کہ معلوم نہیں کیسی حسین صورت ہوگی جو دیکھنے سے رہ گئی،اگر دیکھ لیا ہوتا تو اچھا ہوتا،ایسی بے چینی رہتی ہے کہ جس کو بیان نہیں کرسکتا۔تو حضرت نے فرمایا: اچھا بتاؤ! یہ بے چینی کتنی دیر رہتی ہے؟ تو کہا: تین چار منٹ حضرت نے فرمایا: اچھا! اگر دیکھ لیتے ہوتو؟اس صورت میں بھی بے چینی ہوتی ہے نا؟ جواب دیا کہ ہاں!اس صورت میں بھی بعد میں بے چینی تو ہوتی ہے۔پوچھا: وہ کتنی دیر؟ جواب دیا: وہ تو تین دن تک رہتی ہے۔حضرت نے فرمایا: دیکھو! اگر بہتر (۷۲) گھنٹے کی بے چینی دو تین منٹ کی بے چینی سے دور ہوتی ہے؛ تو سودا سستا ہے۔

بہرحال کہنے کی بات یہ ہے کہ دیکھئے! بدنگاہی سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اور اپنے نفس کو روکنے کے لئے کتنی زحمت برداشت کرنی پڑتی ہے۔

﴿حقیقی بہادر﴾

ایک بہادر آدمی بڑے بڑے بہادری کے کام کر لیتا ہے، لیکن یہاں وہ بھی پھسل جاتا ہے، اس کی بہادری کام نہیں آتی۔ ہے یا نہیں؟ دیکھئے! یہ ہے اصل بہادری، بہادری اسی کا تو نام ہے۔ بھائی! کسی نے آپ کو گالی دی، اب گالی دی تو اس کا جواب آپ طمانچے سے دے سکتے ہیں، لیکن آپ ضبط کر گئے اور برداشت کر گئے۔

اسی کو نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام سے پوچھا: تم پہلوان کس کو سمجھتے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم تو پہلوان اس کو سمجھتے ہیں کہ جو کسی کو کشتی کے اندر پچھاڑ دے یا میدانِ جنگ میں سامنے والے کو چت کر دے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نہیں! بلکہ پہلوان وہ ہے جو اپنے غصہ پر قابو پالے۔ دوسرے کو پچھاڑنے کی بات تو بعد کی ہے، اپنے آپ کو پچھاڑو۔ ضرورت اس کی ہے۔ نفس ہمارا دشمن ہے ﴿اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّکَ نَفْسُکَ الَّتِی بَیْنَ جَنْبَیْکَ﴾ (ذکرہ الغزالی فی الاحیاء ۳/۵، قال العراقی فی ہامشہ حدیث اعدیٰ عدوک الخ اخرجہ البیہقی فی کتاب الزہد من حدیث ابن عباس وفیہ محمد بن عبد الرحمٰن بن غزوان احد الوضاعین) کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن وہ نفس ہے جو تمہارے اندر ہے، اصل میں تو پچھاڑنے کی ضرورت اس کو ہے، اگر اس کو ہم نے پچھاڑ دیا تو ہمارے لئے کامیابی ہی کامیابی ہے۔

بہرحال! یہ جو اپنے آپ کو گناہوں کے انجام دینے اور گناہوں کے کرنے سے روکنا ہے، اس میں بھی کتنی مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے، یہ بھی صبر ہے، اس کے اوپر بھی

بے انتہا اجر ملے گا، جولوگ گناہوں سے اپنے آپ کو روکتے ہیں تو وہ ﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ أَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ کی بشارت میں شامل ہونے کی وجہ سے اجر کے مستحق ہیں

﴿صبر؛ ایک عجیب وصف﴾

خلاصہ یہ کہ اگر آپ دیکھیں تو صبر کا دائرہ پوری شریعت تک پھیلا ہوا ہے، اب کون سی چیز باقی رہ گئی۔ آپ عبادتیں انجام دے رہے ہیں، جو کرنے کے کام ہیں وہ کررہے ہیں؛ اس میں صبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جو رُکنے کے کام ہیں ان سے رُک رہے ہیں؛ ان میں بھی صبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بلکہ جو کام ہمارے ارادے اور اختیار میں نہیں ہیں؛ وہاں بھی صبر کی ضرورت ہے جیسا کہ پیچھے معلوم ہوا۔ حالانکہ شریعت کا دائرہ تو فقط ارادے اور اختیار کے کاموں تک محدود ہے۔ لہٰذا اگر دیکھا جائے تو یہ صبر درحقیقت ایک ایسا عجیب وصف ہے کہ ہر جگہ اس کی ضرورت پیش آتی ہے، اسی لئے اگر کسی آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ وصف عطا فرمایا؛ تو سمجھ جاؤ کہ وہ کامیاب ہے۔

﴿مقامِ رضا﴾

اب اس کے بعد اس سے بھی اعلیٰ ایک درجہ ''رضا'' کا ہے، اور اس سے بھی اعلیٰ درجہ ''محبت'' کا ہے۔ مصیبت آئی تو اس کو برداشت کرلیا یہ تو صبر ہوا۔ اس سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مصیبت بھیجی تو اس پر خوش ہیں کہ محبوب کی بھیجی ہوئی چیز ہے، یہ صبر سے بھی اعلیٰ درجہ ہے کہ صرف برداشت ہی نہیں کیا بلکہ اس مصیبت پر آپ خوش ہیں کہ مصیبت کس نے بھیجی؟ کس نے یاد کیا؟ اللہ تعالیٰ نے یاد کیا۔ تو یہ رضا ہے، اور پھر اس کو چاہیں تو یہ اس سے اعلیٰ مقام ہے۔ بہرحال! یہ صبر بھی بہت اونچا مقام ہے۔ اسی لئے اس پر بشارت

ہے﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ کہ جولوگ صبر کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جو اجر و ثواب دیا جاتا ہے وہ بے حساب ہے۔ اور واقعتاً جس آدمی کو صبر دیا گیا یوں سمجھئے اس کو سب کچھ مل گیا۔ اسی لئے فرمایا ہے﴿اِنَّ اللہَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ﴾ صبر کے نتیجہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے۔

﴿حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کا خلاصہ﴾

دیکھئے! حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا قصہ سب جانتے ہیں کیسا آزمائش کا ہے، آخر میں ان کے سارے قصے کا خلاصہ قرآن میں مذکور ہے کہ ان کے بھائی ان کے پاس پہنچے اور بھائیوں نے بھی محسوس کیا کہ یہ یوسف ہیں تو بھائیوں نے پوچھا: کیا آپ ہی یوسف ہیں؟ حضرت یوسف نے کہا: ﴿أَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَا أَخِيْ قَدْ مَنَّ اللہُ عَلَيْنَا﴾ ہاں! میں ہی یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی بنیامین ہے، اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا احسان کیا۔ اور آگے کیا فرماتے ہیں﴿اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللہَ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ جو آدمی تقویٰ کے کام کرے اور صبر اختیار کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نیکوکار کے اجر کو ضائع نہیں کرتا تو حضرت یوسف علیہ السلام کے سارے قصہ کا خلاصہ دو چیزیں نکلیں ''تقویٰ اور صبر''۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر عظیم چیز ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرما رکھی ہے۔

﴿صبر روشنی ہے﴾

عن أبی مالک الحارث بن عاصم الأشعری رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ أَوْ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَالصَّلٰوةُ نُوْرٌ، وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ، وَالصَّبْرُ ضِيَآءٌ، وَالْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَكَ أَوْ عَلَيْكَ، كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ، فَمُعْتِقُهَا أَوْ مُوْبِقُهَا.

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پا کی آدھا ایمان ہے اب اس کی بہت ساری تفصیل محدثین اور حدیث کے شراح نے بیان کی ہیں ﴿وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَأُ الْمِیْزَانَ﴾ اور الحمد للہ میزانِ عمل کو بھر دیتا ہے حالانکہ الحمد للہ کہنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟

ہم یوں ہی بیٹھے بیٹھے اپنا وقت برباد کر دیتے ہیں، بہت سی مرتبہ تو بے کار بیٹھے رہتے ہیں یعنی ہماری خاموشی بھی غفلت ہوتی ہے، بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوں ویسے ہی بے کار بیٹھے رہتے ہیں، حالانکہ آدمی بیٹھے بیٹھے ذکر کرتا رہے تو بہت کچھ فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ سبحان اللہ اور الحمد للہ یہ دونوں زمین وآسمان کے درمیان کے حصے کو بھر دیتے ہیں اور نماز نور اور روشنی ہے۔ صدقہ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ صدقہ کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت ہے، مال سے محبت نہیں ہے۔ اور صبر بھی روشنی ہے۔ بس! یہ روایت یہاں اسی لئے لائے ہیں ﴿اَلصَّبْرُ ضِیَآءٌ﴾ مخصوص قسم کی روشنی کے لئے لفظ ''ضیاء'' استعمال کیا جاتا ہے۔ قرآن میں سورج کو ''ضیاء'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور چاند کو ''نور'' سے تعبیر کیا گیا ہے ﴿وَالْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَکَ أَوْعَلَیْکَ﴾ اور قرآن آپ کے حق میں دلیل بن سکتا ہے یا آپ کے خلاف یعنی قرآنِ پاک پر اگر آپ نے عمل کیا تو کل کو قیامت میں وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سفارش کرے گا اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کی تو آپ کے خلاف دعویٰ دائر کرے گا۔ اور تمام لوگ صبح کو جب چلتے ہیں تو گویا وہ اپنی جان کو بیچ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ سے جان کا سودا کر رہے ہیں اب یا تو وہ نیکی کے کام کر کے اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے چھڑالیں، یا گناہ کے کام کر کے اور گناہ کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالیں۔

۔۔۔اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو صحیح توفیق عطا فرمائے۔۔۔

درد بھری دعاء

آہ جاتی ہے فلک پہ رحم لانے کے لئے

بادلو! ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لئے

اے دعا ! ہاں عرض کر عرش الٰہی تھام کے

اے خدا! رخ پھیر دے اب گردشِ ایام کے

خلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے

آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے

خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں

کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں

رحم کر اپنے نہ آئین کرم کو بھول جا

ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں

طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

صبر
مجلس ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً ۔ اما بعد ۔

﴿ اچھے اوصاف حاصل کرنے کا طریقہ ﴾

عن ابی سعید سعد بن مالک بن سنان الخدری رضی اللہ عنہ اَنَّ نَاسًامِنَ الْأَنْصَارِسَأَلُوْارَسُولَ اللّٰہِ ﷺ فَأَعْطَاھُمْ ثُمَّ سَأَلُوْہُ فَأَعْطَاھُمْ حَتّٰی نَفِدَمَاعِنْدَہٗ فَقَالَ لَھُمْ حِیْنَ أَنْفَقَ کُلَّ شَیْئٍ بِیَدِہٖ:مَایَکُنْ عِنْدِیْ مِنْ خَیْرٍفَلَنْ أَدَّخِرَہُ عَنْکُمْ،وَمَنْ یَّسْتَعْفِفْ یُعِفَّہُ اللّٰہُ وَمَنْ یَّسْتَغْنِ یُغْنِہِ اللّٰہُ وَمَنْ یَّتَصَبَّرْ یُصَبِّرْہُ اللّٰہُ وَمَاأُعْطِیَ أَحَدٌعَطَاءً خَیْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ۔

پچھلی مجلس میں صبر کی حقیقت اور اس کی قسمیں تفصیل سے بتلا چکا ہوں۔

یہاں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نبی کریم ﷺ کے ارشادات پیش کئے ہیں ان میں سے ایک روایت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ہے کہ انصار کے کچھ لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے کچھ مال طلب کیا، حضور ﷺ نے ان کو عطا فرمایا پھر دوسری مرتبہ انھوں نے مانگا، نبی کریم ﷺ نے ان کو دیا، یہاں تک کہ آپ کے پاس جو مال تھا وہ سب ختم ہوگیا، جب آپ نے اپنے پاس جو کچھ تھا وہ سب خرچ کردیا تو ان حضرات سے آپ نے یہ ارشاد فرمایا:

کہ میرے پاس جو مال ہے میں تم سے اس کو روک کر نہیں رکھوں گا یعنی میرے پاس مال ہو اور آپ لوگ مطالبہ کریں تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں نہ دوں، بلکہ ضرور دوں گا، اب تو میرے پاس مال رہا نہیں، ختم ہوگیا اس لئے نہیں دے رہا ہوں، لیکن ایک بات خاص طور پر یاد رکھیے کہ جو آدمی اپنے آپ کو سوال سے بچائے گا، عفت اختیار کرے گا (عفت کہتے ہیں پاکدامنی کو۔ اور پاکدامنی کا اطلاق یہاں پر اپنے آپ کو سوال سے بچانے پر کیا گیا ہے) کہ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے گا اور اپنے آپ کو پاکدامن بنائے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو عفت عطا فرمائیں گے یعنی اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ سوال سے بچائیں گے۔ جو آدمی خود بچنے کی کوشش کرے گا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد کی جائے گی اور اللہ تعالیٰ بھی اس کو بچائیں گے۔ اور جو اپنے آپ کو مستغنی اور لوگوں سے اپنے آپ کو بے نیاز بنائے گا یعنی لوگوں کے سامنے اپنی ضرورتوں کے لئے ہاتھ نہیں پھیلائے گا، اپنے آپ کو بے نیاز رکھے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو غنی بنائیں گے، دل کا غنیٰ عطا فرمائیں گے اور جو آدمی صبر اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ بھی اس کو صبر عطا فرمائیں گے۔

نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد میں ہمارے لئے ایک بہت بڑی تعلیم ہے، عام طور پر جب ہم سے کسی اچھے وصف کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو اس وقت ہم یہ عذر کر دیتے ہیں کہ ہم سے یہ نہیں ہو پاتا۔ یہاں نبی کریم ﷺ نے اس سلسلے میں قدرت کا جو قانون ہے اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ جو معاملہ ہے اس کو ارشاد فرما کر ہمارے لئے اچھے اوصاف کو حاصل کرنے کا ایک بہت بڑا دروازہ کھول دیا۔

مثلاً ایک آدمی ہے جو اپنے آپ کو گناہ سے بچانا چاہتا ہے لیکن کوشش نہیں کرتا، دل

میں ارادہ تو ہے اور اس کی تمنا اور خواہش بھی ہے کہ میں اپنے آپ کو گناہ سے بچالوں مثلاً بدنگاہی ہے، بدنظری سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے، عفت اختیار کرنا چاہتا ہے، پاک رہنا چاہتا ہے، سمجھتا ہے کہ یہ ایک بہت اچھا وصف ہے، اپنے آپ کو اس چیز سے بچانا چاہیے لیکن پھر وہ یوں سمجھتا ہے کہ میرے لئے تو بچنا بہت مشکل ہے، ناممکن ہے، مَیں بالکل بے اختیار ہو جاتا ہوں، بے قابو ہو جاتا ہوں، مجھ سے یہ ہو ہی نہیں سکتا، حالانکہ اس سلسلے میں جو محنت اور کوشش کرنی چاہیے، اس کے لئے قدم آگے نہیں بڑھاتا، تمنا اور ارادے کی حد تک تو ہے، آگے ہمت کرکے جب عملی اقدام کرنے کا وقت آتا ہے، تو وہ پہلے ہی اپنے متعلق یوں سوچ لیتا ہے کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا، اور ہمت ہار جاتا ہے۔ یہاں نبی کریم ﷺ اس ارشاد میں فرماتے ہیں ﴿مَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ﴾ جو آدمی پاکدامنی اختیار کرنے کی کوشش کرے گا، قدم آگے بڑھائے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ بھی اس کو عفت عطا فرمائے گا۔ گویا آپ ﷺ کی طرف سے ہمیں یہ تعلیم دی گئی کہ جب آپ کسی اچھے وصف کو اختیار کرنا چاہیں تو صرف ارادے اور تمنا پر اکتفاء نہ کریں بلکہ عملی اقدام کرتے ہوئے اور قدم آگے بڑھاتے ہوئے کوشش شروع کر دیجئے۔ پہلے سے اپنے متعلق یہ سوچ لینا کہ یہ تو مجھ سے ہو ہی نہیں سکتا میرے لئے ناممکن ہے، مجھ سے یہ کام بالکل مشکل ہو جائے گا؛ صحیح نہیں۔ اپنے متعلق اتنا زیادہ بدگمان ہونے کی یا اپنے متعلق اتنی ہمت ہار جانے کی ضرورت نہیں۔

دنیوی اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ بڑے بڑے کام کے لئے قدم بڑھاتے ہیں، وہاں تو ہمت نہیں ہارتے، اور یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر مدد کا وعدہ ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ کہ جو لوگ ہمارے راستے میں محنت

کریں گے،قدم آگے بڑھائیں گے؛ ہم اپنے راستے کے لئے ان کو ہدایت کریں گے یعنی ان کو راستہ بتلائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی راہنمائی کی جائے گی، ان کی مدد کی جائے گی۔ اصل تو یہ ہے کہ ہماری طرف سے قدم اٹھنا چاہیے۔

اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے ایک بچہ کھڑا ہے، وہ ابھی چلنا پھرنا نہیں سیکھا، اب اس کو کھڑا کر کے باپ کہتا ہے کہ آؤ بیٹا آؤ! اب وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہے گا تو نہیں بڑھ سکے گا، وہ جب ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو وہ ابھی آدھا قدم آگے بڑھائے اس سے پہلے باپ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے لیکن ضرورت اس کی ہے کہ وہ کم سے کم آدھا قدم آگے تو بڑھائے وہ اگر آدھا قدم آگے نہیں بڑھائے گا تو بات نہیں بنے گی۔ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے، جتنے بھی اوصاف اور خوبیوں کی چیزیں ہیں چاہے وہ پاک دامنی ہو، چاہے وہ غناءِ باطن ہو، چاہے وہ صبر ہو؛ یہ جتنے بھی اوصاف شریعت کے اندر مطلوب ہیں، ان کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں کوشش کرنی چاہیے، ہماری طرف سے کوشش میں کمی نہ ہو، جہاں ہم نے قدم آگے بڑھایا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری مدد کی جائے گی۔

حضرت مولانا ابرارالحق صاحب دامت برکاتہم (نوراللہ مرقدہ) بڑی اچھی مثال دیتے ہیں کہ بھائی: آپ ایر پورٹ پر جاتے ہیں، آج کل تو بہت سے دفاتر میں بھی ایسا ہوتا ہے، سامنے دروازہ بند ہے، اب ایک آدمی سوچے کہ دروازہ بند ہے، میں کیسے جاؤں اور آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے تو کبھی بھی دروازہ نہیں کھلے گا، لیکن ایک آدمی آگے بڑھتا ہے، جب پہنچا خود ہی دروازہ کھل گیا، آپ ہی آپ آٹو میٹک (autometic) دروازہ کھلتا ہے۔ لیکن یہ آٹو میٹک بھی کب کھلے گا؟ جب آپ اس کے سامنے جائیں گے، قدم آگے بڑھائیں

گے؛ تب وہ کھلے گا۔ گویا آج کل کی ایجادنے تو ہمارے لئے یہ مسئلہ سمجھنا بہت آسان کر دیا کہ آپ قدم تو آگے بڑھایئے پھر دیکھئے کہ آپ کے لئے راستہ کھلتا ہے یا نہیں؟

آپ سفر کرتے ہیں اور جو بڑی سڑک ہوتی ہے وہاں آپ نے دیکھا ہوگا کہ سڑک کے دونوں طرف درخت لگے ہوتے ہیں اور درختوں کا یہ سلسلہ آگے جا کر آپس میں ملا ہوا نظر آتا ہے، اب ایک آدمی یوں سوچے کہ ہماری نگاہ جہاں پہنچ رہی ہے وہاں سڑک ختم ہو رہی ہے، اگر یوں سوچے کہ سڑک ختم ہوگئی اور یہیں بیٹھا رہے تو کبھی اس کا سفر پورا نہیں ہوگا، کبھی وہ اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچے گا۔ وہ آگے بڑھتا رہے گا تو آگے سڑک نظر آتی رہے گی، راستہ کھلتا رہے گا اور پوری دنیا کا سفر کر لے تب بھی کبھی راستہ بند نظر نہیں آئے گا۔ لہٰذا جو نہ چلنے والے ہیں ان کے لئے یہ بہانے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد میں ہم لوگوں کے لئے بڑی ہمت کی بات اور بڑی کام کی بات ہے یعنی گویا ہم ناکاروں کے لئے حضور ﷺ نے بہت عمدہ راستہ بتلا دیا، ہمارے لئے راہ کھول دی ﴿مَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ﴾ کہ جو آدمی عفت اختیار کرے گا، اپنے آپ کو بچائے گا، یہاں تو حضور ﷺ نے سوال سے بچانے کے متعلق کہا، لیکن عفت و پاکدامنی کا تعلق صرف سوال سے نہیں ہے بلکہ گناہوں سے بچانے کے اوپر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے کہ جو آدمی اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے گا اور گناہوں سے بچنے کی کوشش کرے گا؛ تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو عفت عطا فرمائیں گے۔ اس لئے گویا ہم سے یہ مطالبہ ہے کہ آپ بچنے کی کوشش تو کیجئے پھر دیکھئے اللہ کی طرف سے کیسی مدد ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کچھ دنوں تک تو یہ کام ہمیں بتکلف کرنا پڑے گا، جب تک کہ کچھ دنوں تک بتکلف نہیں کریں

گے؛ تب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی عادت نہیں پڑے گی۔

میں کہا کرتا ہوں کہ دیکھو! یہ شراب پینے والے شراب کے کیسے عادی ہیں کہ اس کے بغیر چین نہیں اور شراب میں ان کو کیسی لذت آتی ہے، حالانکہ شراب کوئی لذیذ چیز نہیں ہے یعنی جو آدمی شراب کا عادی نہ ہو، آپ اس کو ذرا چکھا دیجئے، گرچہ ہم نے تو نہیں چکھی، لیکن کہتے ہیں کہ بہت خطرناک ہے یعنی اس کا مزہ بڑا بُرا ہے، بدبودار اتنی ہوتی ہے کہ جب کوئی پیا ہوا قریب آکر بیٹھ جائے تو جو استعمال نہیں کرتے وہ اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتے، اور کہتے ہیں کہ یہ کیسے پیتا ہے جس کی بدبو ہم برداشت بھی نہیں کر سکتے، اس کا مزہ بھی بڑا خطرناک ہے، لیکن اس کو کیسا لطف آتا ہے، کیونکہ اس نے اپنے آپ کو اس کا عادی بنایا ہے۔

جو لوگ تمبا کو کھاتے ہیں ان کو تمبا کو کھانے میں کیسا لطف آتا ہے، حالانکہ جو عادی نہیں اگر اس کے منھ میں ذرا سا ڈال دیا جائے تو چکرا جائیں گے اور زمین پر گر جائے گا۔ تو حقیقت تو یہ ہے کہ کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے اس کی مشقت کو برداشت کرتے ہوئے کچھ تو اپنے آپ کو اس کے اندر ڈالنا پڑے گا۔

نمازوں کی لذت حاصل کرنے کے لئے، عبادات کا مزہ حاصل کرنے کے لئے اور ان اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے بھی شروع میں تو بتکلف ہمارا جی چاہے یا نہ چاہے، ہم اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کریں جتنا بچائیں گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوگی؟ اسی کو کہتے ہیں ﴿وَمَن يَتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللهُ﴾ جو آدمی بتکلف صبر اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو صبر عطا فرمائیں گے۔ گویا صابر بننے کے لئے کچھ دنوں تک بتکلف یعنی

زبردستی، جی نہیں چاہتا، ہماری طبیعت آمادہ نہیں ہے؛ تب بھی اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرنا پڑے گا۔ کچھ دن ایسا کریں گے تو آپ ہی آپ یہ وصف پیدا ہو جائے گا۔ یہ ہر چیز میں ہے، اس کو آپ نوٹ کر لیجئے۔ اگر اس کو آپ گرہ میں باندھ لیں گے تو ان شاء اللہ شریعت پر عمل سے متعلق جتنی بھی مشکلات ہیں؛ وہ ساری آسان ہو جائیں گی، سب مشکلات دور ہو جائیں گی۔ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد میں اسی کو بتلایا گیا۔

اور فرماتے ہیں ﴿وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو صبر سے اچھا اور صبر سے کشادہ عطیہ نہیں عطا کیا گیا یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر کسی کو صبر کی نعمت دی جائے تو بس یوں سمجھئے کہ اس کو سب کچھ مل گیا۔ صبر ایک ایسی چیز ہے کہ اب اس کے لئے پھر کوئی تکلیف رہے گی ہی نہیں، اس لئے کہ اصل مسئلہ اسی کا ہے۔ مصائب آتے ہیں تو صبر سے کام لے گا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں جو مشقتیں اس کو اٹھانی پڑتی ہیں اس پر صبر سے کام لے گا۔ گناہوں سے بچنے میں جو مشقت ہوتی ہے اس میں صبر سے کام لے گا۔ گویا شریعت کے ہر ہر حکم پر عمل کرنا اس کے لئے آسان ہے۔ روزی کے معاملے میں اپنے معاملات میں اپنی اور چیزوں میں بھی اگر صبر و قناعت اختیار کرے گا؛ تو فائدہ محسوس کرے گا۔

﴿قناعت کا نمک﴾

ایک صاحب تھے ان کو کھانا کھانے کے معاملے میں کوئی شکایت نہیں تھی۔ پوچھا: کیوں؟ تو کہا: میں قناعت کا نمک استعمال کرتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیز مجھے مل جاتی ہے اس پر میں قانع ہو جاتا ہوں۔ قناعت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو جو مل جائے اسی کے

اوپر وہ اکتفا کرلے کہ بس میرے لئے کافی ہے، اپنے اندر آگے کی طلب باقی نہ رکھے پھر اس صورت میں جو بھی چیز ہوگی اس کے لئے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ مسئلہ بہت آسان ہوجائے گا۔ بہرحال نبی کریم ﷺ نے صبر حاصل کرنے کا طریقہ بتایا کہ صبر اس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے۔

﴿ مؤمن کے دونوں ہاتھ میں لڈو ﴾

وعن أبی یحیٰ صهيب بن سنان رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: عَجَباً لِأَمْرِالْمُؤْمِنِ اِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌوَلَيْسَ ذٰلِکَ لِأَحَدٍاِلَّالِلْمُؤْمِنِ،اِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَكَرَ،فَكَانَ خَيْراًلَهُ وَاِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ،فَكَانَ خَيْراًلَهُ.

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مومن کا معاملہ بڑا تعجب خیز ہے کیونکہ اس کی ہر چیز میں خیر ہی خیر اور بھلائی ہے اور یہ بات مومن کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں ہے یعنی جو صاحبِ ایمان ہے اسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ چیز دی گئی ہے۔ گویا یوں کہئے کہ اس کے دونوں ہاتھ میں لڈو ہیں ﴿اِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْراًلَهُ ﴾ اگر اس کو کوئی سکھ اور راحت کی چیز پہنچتی ہے، خوش حالی آتی ہے؛ تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے تو اس میں اس کے لئے خیر ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ ﴾ اگر تم شکر کروگے تو میں اپنی نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔ تو گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر نعمت ملی تو اس پر شکر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے ﴿وَاِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ،فَكَانَ خَيْراًلَهُ ﴾ اور اگر اس کو دکھ پہنچتا ہے، تنگ حالی سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ صبر سے کام لیتا ہے؛ اس میں بھی اس کے لئے بھلائی ہے، گویا

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے لئے دونوں راستے کھلے ہوئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ نعمتیں ملی تب ہی وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرسکتا ہے، بلکہ اگر مصیبتیں اس پر آتی ہیں تو ان مصیبتوں پر صبر کر کے وہ اللہ کی رضاء اور خوشنودی حاصل کر کے اپنے لئے کامیابی کی راہ ہموار کرلیتا ہے۔ اور اگر نعمتیں حاصل ہوتی ہیں تو ان نعمتوں پر شکر کر کے وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضاء حاصل کر کے اپنے لئے کامیابی کا راستہ ہموار کرلیتا ہے گویا اس کے لئے دونوں حالتوں میں کامیابی ہی کامیابی ہے۔ مصیبت ہو تو بھی اور نعمت ہو تو بھی، خوشی ہو تو بھی اور پریشانی ہو تو بھی؛ کسی صورت میں اس کے لئے کوئی معاملہ مشکل نہیں، ہر حال میں وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرسکتا ہے۔ شریعت کی تعلیم یہی ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے اس حال سے متعلق شریعت کا جو حکم ہے؛ وہ بجالائے۔

ہر حالت سے متعلق ہم کو شریعت نے ایک حکم دے رکھا ہے۔ مثلاً اگر اس کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تو شریعت نے حکم دیا کہ بیٹے کی پیدائش پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اس کا عقیقہ کرو اور اس کے لئے اولاد کے متعلق جو دوسری ہدایتیں دی گئی ہیں؛ اس کو انجام دو۔ لہٰذا جہاں خوشی کا موقع آیا تو شریعت نے خوشی کے اظہار کے طریقے بھی بتلادئے۔

اور اگر کسی کے بیٹے کا انتقال ہوجائے تو اس موقع پر شریعت نے اس کے متعلق کی بھی ہدایت فرمادی ہے کہ صبر سے کام لو، اس کے لئے دعاءِ مغفرت کرو، جنازہ کی نماز پڑھو، اس کو دفن کرو، اس کے جو طریقے ہیں وہ بھی بتلادئے۔

ہر حالت میں مؤمن کو کس طرح رہنا چاہیے، خوشی کی حالت کیسے گذارنی چاہیے؛ وہ بھی شریعت نے بتلادی، غمی کی حالت کیسے گذارنی چاہیے؛ وہ بھی شریعت نے بتلادی۔

شریعت کے بتلائے ہوئے طریقے پر جب ہم عمل کریں گے تو اللہ تعالیٰ راضی رہیں گے، چاہے جو بھی حالت ہو۔اسی کو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مؤمن کے لئے ہر حالت میں خیر ہی خیر ہے، گویا اس کی ہر حالت اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والی ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: ایک بنئے کا قول ہے کہ مسلمانوں کے لئے تو خیر ہی خیر ہے، بھلائی ہی بھلائی ہے کہ وہ مرے تو شہید اور زندہ رہے تو غازی۔ایسا معاملہ ہے۔تو مسلمانوں کے لئے ہر حالت نعمت ہے، نعمت ملے تو شکرادا کر کے اللہ تعالیٰ کو خوش کرے گا۔اور مصیبت آجائے تو صبر کر کے اللہ تعالیٰ کو خوش کرے گا۔ایسا نہیں کہ جس پر مصیبت آئی وہ یوں سوچے کہ میں اللہ تعالیٰ کو کس طرح خوش کروں، مجھ سے اللہ تعالیٰ کس طرح راضی ہوں گے، میرے پاس اللہ تعالیٰ کو خوش اور راضی کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟ ایسا نہیں! وہ بھی شریعت نے بتلا دیا۔مؤمن کی حالت دو حال سے خالی نہیں، دونوں حالتوں کی تقسیم شریعت نے بتلا دی۔اس روایت میں صبر کا تذکرہ ہے؛ اس لئے لائے ہیں۔

آپ ﷺ کی بیماری اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بے چینی

وعن أنس رضي الله عنه قَالَ لَمَّاثَقُلَ النَّبِيُّ ﷺ جَعَلَ يَتَغَشَّاهُ الْكَرْبُ،فَقَالَتْ فَاطِمَةُ رضي الله عنها وَاكَرْبَ أَبَتَاهُ.فَقَالَ:لَيْسَ عَلىٰ أَبِيْكِ كَرْبٌ بَعْدَالْيَوْمِ.فَلَمَّامَاتَ قَالَتْ: يَاأَبَتَاهُ أَجَابَ رَبًا دَعَاهُ. يَاأَبَتَاهُ!جَنَّةُ الْفِرْدَوْسِ مَأْوَاهُ.يَاأَبَتَاهُ!إِلىٰ جِبْرِيْلَ نَنْعَاهُ.فَلَمَّادُفِنَ قَالَتْ فَاطِمَةُ أَطَابَتْ أَنْفُسُكُمْ أَنْ تَحْثُوْاعَلىٰ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ التُّرَابَ؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر بیماری سخت ہوئی یعنی جس بیماری

میں آپ کی وفات ہوئی اس مرض الوفات میں جب بیماری کا حملہ تیز اور شدید ہوا تو آپ پر بے ہوشی طاری ہونے لگی، آپ پر تکلیف کی شدت بڑھ گئی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم ﷺ کی اس تکلیف کو دیکھ کر رہا نہ گیا۔ وہ کہنے لگیں: ہائے میرے ابا کی تکلیف۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کو بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بہت زیادہ محبت تھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بھی نبی کریم ﷺ سے بہت زیادہ محبت تھی۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ جب بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے پاس تشریف لاتی تھیں تو حضور ﷺ ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے تھے یہاں تک کہ اس مرض الوفات میں جس میں نبی کریم ﷺ کی وفات ہوئی آپ پر تکلیف کی شدت تھی اس وقت بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں تو ان کو دیکھ کر حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿مَرْحَباً بِابْنَتِیْ﴾ کہ میری بیٹی آؤ، خوش آمدید، تمہارا آنا مبارک ہو۔ اسی لئے ایک روایت میں آتا ہے ﴿فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِّنِّیْ﴾ فاطمہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے جو اس کو تکلیف پہنچائے گا وہ مجھے تکلیف پہنچائے گا۔ بہر حال! حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نبی کریم ﷺ کو اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نبی کریم ﷺ سے بہت زیادہ محبت تھی لہٰذا حضور ﷺ کی اس بیماری کی تکلیف دیکھ کر بے چین ہو کر وہ بول پڑیں ﴿وَاکَرْبَ أَبَتَاهُ﴾ ہائے میرے ابا کی تکلیف کہ مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تمہارے ابا پر آج کے بعد کوئی تکلیف نہیں آئے گی، گویا حضور ﷺ کا اشارہ یہ تھا کہ یہ موت کی آخری تکلیف ہے۔ بس! اس کے بعد کوئی اور تکلیف تمہارے ابا پر آنے والی نہیں ہے، موت پر تکلیفوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پھر جب نبی کریم ﷺ کا انتقال ہو گیا تو اس پر

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بولنے لگیں: ہائے میرے ابا! انھوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہہ دیا یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو اپنے پاس بلا لیا تو حضور ﷺ وہاں تشریف لے گئے گویا انتقال فرما گئے ﴿ یَا أَبَتَاهُ! جَنَّةُ الْفِرْدَوْسِ مَأْوَاهُ ﴾ ہائے میرے ابا! کہ جنت الفردوس ان کا ٹھکانا ہے ﴿ یَا أَبَتَاهُ! اِلیٰ جِبْرِیْلَ نَنْعَاهُ ﴾ ہائے میرے ابا! ہم جبرئیل کو ان کی موت کی خبر دیتے ہیں۔

﴿ طبعی تکلیف اور بناوٹی تکلیف ﴾

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جو باتیں فرمائی ہیں یہ نوحہ کے قبیل سے نہیں ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں نوحہ کا ایک طریقہ تھا یعنی کسی کے انتقال کے اوپر نوحہ کرنا اور بین کر کے رونا۔ دیہاتوں کے اندر یا ایسی جگہوں پر جہاں پرانا رسم ورواج ہوتا ہے وہاں دیکھا ہوگا کہ عورتیں اپنے چہرے کو نوچتی ہیں، سینہ کوٹتی ہیں اور بہت سی عورتیں ایک ساتھ مل کر خوب آواز کھینچ کر کے روتی ہیں جس کو نوحہ کہا جاتا ہے، اس کو تو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی کسی کے انتقال کے بعد اس کی وہ خوبیاں جو اس کے اندر موجود تھیں، ان واقعی اوصاف اور خوبیوں کو بیان کرنے میں کوئی مبالغہ سے کام نہ لیتے ہوئے اس کی واقعی خوبیوں کو بیان کرتا ہے تو شرع میں اس کی ممانعت نہیں ہے، اور اس پر اگر آنسو آ جائیں یا رونے کے اندر آواز ذرا بلند ہوگئی لیکن بین کے طور پر نہیں ہے، غیر اختیاری طور پر تو اس کی ممانعت نہیں ہے، اس کی اجازت ہے، نوحہ کرنا یعنی با قاعدہ یوں سمجھئے کہ پروفیشنل طریقہ سے رونا اس کی ممانعت ہے۔ جو نوحہ کیا جاتا ہے اس میں تو با قاعدہ ایک خاص انداز ہوتا ہے، اس میں کوئی طبعی تکلیف نہیں ہوتی ہے۔ آدمی کو فطری غم ہو اور اس غم کا اظہار

غیر اختیاری طور پر زبان سے یا آنکھ سے ہوگیا اس کی ممانعت نہیں ہے۔ اور ایک ہوتا ہے کہ غم تو کچھ بھی نہیں ہے، صرف زبان سے اظہار کیا جاتا ہے۔ رونے والی جو عورتیں ہوتی ہیں اور جنھوں نے ان کو دیکھا ہے ان کو معلوم ہے کہ جس کے یہاں رونے جارہی ہیں وہاں بس میں سے اتریں، آپس میں باتیں کرتی کرتی جارہی ہیں اور جہاں اس کا مکان قریب آیا کہ ایک ساتھ رونا شروع کردیں گی، بچے بھی ساتھ ہوتے ہیں وہ بھی گھبرا جاتے ہیں کہ یہ کیا ہوگیا، ایک دم کون سی مصیبت آگئی؟ جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ اس چیز کو خوب جانتے ہیں۔ یہ رونا تو حقیقت میں بناوٹ ہے۔ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، اس کو حرام قرار دیا اور گناہِ کبیرہ کہا ہے۔

نبی کریم ﷺ جب عورتوں سے بیعت لیتے تھے تو جن چیزوں سے منع فرماتے تھے اس میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ نوحہ نہیں کریں گی۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ ہوتا تھا کہ مرنے والا بھی باقاعدہ وصیت کر کے مرتا تھا کہ میرے مرنے کے بعد خوب رونا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ بڑا آدمی تھا۔ اس لئے حدیث میں آتا ہے کہ رونے والوں کے رونے کی وجہ سے مرنے والے کو عذاب ہوتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے اس کا تذکرہ آیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ یہاں رونے والے رو رہے ہیں اس میں مرنے والے کا کیا قصور ہے؟ اس کو کیوں عذاب ہوتا ہے؟

اس پر علماء نے لکھا ہے کہ رونے والوں کے رونے کی وجہ سے مرنے والے کو عذاب اس وقت ہوگا جب کہ مرنے والے نے رونے کی وصیت کی ہو کہ میرے مرنے کے

بعد رونا، تب تو گویا ان کے رونے میں اس کا دخل ہے، اس لئے اس گناہ میں وہ بھی شریک ہوا تو اس کو عذاب ہوگا۔ یا یہ ہے کہ اس کو معلوم تھا کہ میرے مرنے کے بعد باقاعدہ نوحہ کریں گے، روئیں گے اور اس کے باوجود اس نے نہیں روکا، تو اس صورت میں بھی وہ گنہ گار ہوگا۔ اگر ان دو باتوں میں سے کوئی نہیں ہے تو پھر مرنے کے بعد کسی کے رونے کی وجہ سے مرنے والے کو کوئی عذاب نہیں ہوسکتا۔

باقی اگر کوئی آدمی غیر اختیاری طور پر روئے، مرنے والے کے ساتھ طبعی محبت تھی اس محبت کی وجہ سے غیر اختیاری طور پر آنسو بہہ رہے ہیں، یا غیر اختیاری طور پر منھ سے ہچکیاں نکل رہی ہیں تو اس پر کوئی ممانعت نہیں ہے، اس پر شریعت پابندی نہیں لگاتی ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا یہاں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو بیان کرنا بھی اسی قبیل سے ہے۔

﴿فَلَمَّا دُفِنَ قَالَتْ فَاطِمَةُ رضی اللہ عنہا أَطَابَتْ أَنْفُسُكُمْ أَنْ تَحْثُوا عَلَىٰ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ التُّرَابَ؟﴾

جب حضور اکرم ﷺ کو دفن کر کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو خطاب کر کے کہا: تمھارے دلوں نے اور تمہارے جی نے کیا اس کو پسند کیا کہ تم نبی کریم ﷺ کے جسدِ اطہر کے اوپر مٹی ڈالو؟ یعنی حضور کو تم دفن کر کے آئے؟ تمھارے دلوں نے کیسے گوارا کیا کہ تم حضور ﷺ کو مٹی میں رکھو، آپ ﷺ کے جسدِ اطہر کے اوپر تم مٹی ڈالو؟ خیر! یہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی شدتِ محبت کی وجہ سے کہا تھا، ورنہ آپ کو دفن کرنا بھی آپ ہی کے حکم سے تھا اور شریعت ہی کا ایک حکم ہے۔

یہاں اس روایت کو لانے کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ اس طرح غیر اختیاری طور پر شدتِ محبت کی وجہ سے ایسی چیز اگر زبان سے نکل گئی تو اس کی وجہ سے صبر پر کوئی زد

نہیں پڑتی ہے،اور یہ صبر کے منافی نہیں ہے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

عن أبی زید أسامة بن زید بن حارثة مولیٰ رسول اللہ ﷺ وَحِبّہٖ وابْنُ حِبّہٖ رضی اللہ عنہ قال: اَرْسَلَتْ بِنْتُ النَّبِیِّ ﷺ اِنَّ ابْنِیْ قَدِاحْتُضِرَفَاشْھَدْنَافَاَرْسَلَ یُقْرِئُ السَّلَامَ وَیَقُوْلُ اِنَّ لِلّٰہِ مَااَخَذَ وَلَہٗ مَاأَعْطٰی وَکُلُّ شَیْئٍ عِنْدَہٗ بِأَجَلٍ مُّسَمًّی فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ. فَاَرْسَلَتْ اِلَیْہِ تُقْسِمُ عَلَیْہِ لَیَأْتِیَنَّھَا. فَقَامَ وَمَعَہٗ سَعْدُ بْنُ عُبَادَۃَ وَمُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ وَاُبَیُّ بْنُ کَعْبٍ وَزَیْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَرِجَالٌ رضی اللہ عنہم. فَرُفِعَ اِلیٰ رَسُوْلِ اللہِ ﷺ الصَّبِیُّ، فَاَقْعَدَہٗ فِیْ حِجْرِہٖ وَنَفَسُہٗ تَقَعْقَعُ، فَفَاضَتْ عَیْنَاہُ، فَقَالَ سَعْدٌ: یَارَسُوْلَ اللہِ! مَاھٰذَا؟ فَقَالَ: ھٰذِہٖ رَحْمَۃٌ جَعَلَھَا اللہُ تَعَالیٰ فِیْ قُلُوْبِ عِبَادِہٖ. وفی روایۃ: فِیْ قُلُوْبِ مَنْ شَآءَ مِنْ عِبَادِہٖ. وَاِنَّمَا یَرْحَمُ اللہُ مِنْ عِبَادِہٖ الرُّحَمَاءَ.

آپ نے سنا ہوگا نبی کریم ﷺ کے اوپر سب سے پہلے جو لوگ ایمان لائے ان میں غلاموں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے یہی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں، یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے غلام تھے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کے حوالے کر دیا تھا پھر حضور ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا۔ اصل تو یہ شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے خاندان کے اوپر دشمنوں نے چھاپہ مارا اور جن کو قید پکڑ لیا ان میں یہ بھی تھے، اور پھر وہ قبیلے والے ان کو لا کر مکہ مکرمہ میں فروخت کر گئے، یہ اس وقت بچے تھے، ان کے والد با قاعدہ اسی جستجو اور تلاش میں رہے کہ میرا بیٹا کہاں ہے، جب نبی کریم ﷺ کے پاس وہ رہے تو کسی نے ان کو دیکھا اور ان کے والد کو جا کر اطلاع دی کہ تمہارا بیٹا تو وہاں ہے،

چنانچہ ان کے والد اور ان کے چچا ان کو لینے کے واسطے آئے اور ان سے کہا کہ آپ کو لینے آئے ہیں، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ہمارا بیٹا آپ کے پاس ہے آپ جو قیمت بتائیں گے ہم دینے کے لئے تیار ہیں ان کو ہمارے حوالے کریں۔ نبی کریم ﷺ نے کہا: اگر وہ آنے کے لئے تیار ہوں تو ایک پیسے کی بھی ضرورت نہیں ہے، لے جایئے، مگر آنے کے لئے وہ تیار ہوں، اور اگر وہ تیار نہیں ہیں تو میں کیسے بھیجوں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ ان کو پہچانتے ہو؟ ان کے والد کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ کہا: یہ میرے والد ہیں، اور ان کے چچا کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ کہا: یہ میرے چچا ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تم کو لینے کے واسطے آئے ہیں اگر تم جانا چاہو تو میری طرف سے اجازت ہے اور اگر تم میرے پاس رہنا چاہو تو بھی اختیار ہے، انھوں نے کہا: یارسول اللہ! مَیں تو آپ کے پاس رہوں گا، ان کے والد نے کہا: ارے تم ان کے پاس غلامی والی زندگی گذارنا چاہتے ہو؟ لیکن انہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ جب انھوں نے جانے سے انکار کر دیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم گواہ رہو، مَیں ان کو اپنا بیٹا بناتا ہوں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ان کو اپنا منھ بولا بیٹا بنالیا۔ اور اسی لئے بعد میں ان کو زید بن محمد کے نام سے پکارا جاتا تھا پھر قرآنِ پاک میں جب یہ حکم آیا ﴿أُدْعُوهُمْ لِآبَآئِهِمْ﴾ کہ جن کو تم اپنا منھ بولا بیٹا بناتے ہو وہ تمہارے سگے بیٹے نہیں ہیں ان کی نسبت ان کے باپ ہی کی طرف کرو، اپنی طرف مت کرو، اس کے بعد پھر ان کو زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔ تو بہر حال! یہ حضرت زید رضی اللہ عنہ ہیں، اور ان کے صاحبزادے ہیں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ۔

﴿حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے کچھ مناقب﴾

بخاری شریف میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک ران پر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو بٹھایا اور دوسری ران پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بٹھایا اور دعا فرمائی: اے اللہ! مَیں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت کر، اور جو ان دونوں سے محبت کرے ان سے بھی تو محبت کر (بخاری ۵/ ۲۲۳۶) حضورِ اکرم ﷺ نے یہ دعا فرمائی۔ یہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ حضورِ اکرم ﷺ کے بڑے محبوب تھے۔

بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر قبیلۂ بنومخزوم کی ایک عورت فاطمہ مخزومیہ نے چوری کی تھی اور وہ چوری ثابت ہوگئی تو نبی کریم ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ فرمایا، بنومخزوم قبیلہ بہت بڑا قبیلہ تھا، عرب کا بڑا اشریف قبیلہ سمجھا جاتا تھا، ابوجہل وغیرہ اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے تو قریش کا اتنا اونچا قبیلہ اور اس قبیلے کی عورت کا ہاتھ کاٹا جائے یہ تو قبیلے کے لئے بڑی سخت بات ہوجاتی تو لوگوں میں اس کا بڑا چرچا ہوا کہ کوئی شکل ہونی چاہیے، حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں سفارش بھیجی جائے اور یہ ہاتھ کاٹنے کا سلسلہ رکوایا جائے۔ لیکن کہے کون؟ سب نے مشورہ کرکے کہہ دیا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے محبوب اور آپ کے منھ لگے ہیں، اگر کوئی کہہ سکتا ہے اور سفارش کرسکتا ہے تو یہ کرسکتے ہیں۔ چنانچہ سب بڑوں نے ان کو کہا کہ آپ کہہ دو۔ انھوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ اونچے خاندان اور اونچے گھرانے کی عورت ہے، اس کا ہاتھ کٹے گا تو پورے خاندان کے لئے بدنامی ہے۔ اُس پر حضور ﷺ اتنا غصہ ہوئے کہ کبھی اتنا غصے نہیں ہوئے تھے اور آپ نے فرمایا: ﴿أَتَشْفَعُ فِيْ

حَدٍّمِنْ حُدُوْدِاللهِ ﴾ اے اسامہ! کیا تم اللہ کے حدود اور اللہ کا حکم جاری کرنے کے معاملہ میں سفارش کرتے ہو؟ اگلی امتیں اسی لئے ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں کا کوئی کم درجے کا آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو سزا دی جاتی تھی، اور بڑے گھرانے کا کوئی آدمی جرم کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اور پھر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری بیٹی فاطمہ بنت محمد (اعاذھا اللہ منھا) اگر چوری کرے گی تو اس کا بھی مَیں ہاتھ کاٹوں گا۔ (بخاری ۴/۱۵۶۶) بہرحال! حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے محبوب تھے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ چادریں آئیں، کچھ کپڑے آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو عمدہ قسم کا کپڑا دیا جس کا مطالبہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے۔ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے تھے۔ بھی کیا تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو دینے کے بجائے اِن کو دیا۔ تو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے امیر المومنین! یہ کوئی مجھ سے بڑھ کر تو ہیں نہیں؟ آپ نے ان کو کیوں دیا؟ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ حضور ﷺ کے محبوب ہیں اور تم میرے محبوب ہو، لیکن مَیں حضور کے محبوب کو اپنے محبوب پر ترجیح دیتا ہوں۔ (رواہ الترمذی، مشکوۃ ۵۷۱)

بہرحال! یہاں جو لفظ حِبٌّ آیا۔ حضور ﷺ کے محبوب اور محبوب کے بیٹے۔ اس لئے یہ وضاحت کردی۔

﴿ حضور ﷺ کا صاحبزادی کے نام تعزیت کا پیغام ﴾

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کی ایک صاحبزادی کا بیٹا بیمار تھا، یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہیں۔ بعض روایتوں میں بیٹی کا بھی تذکرہ ہے۔ اور بالکل جاں کنی یعنی روح قبض ہونے کی

حالت تھی تو انھوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس آدمی بھیجا کہ یارسول اللہ! میرا بیٹا بالکل آخری حالت میں ہے آپ تشریف لائیے۔ یہ اس لئے کہلوایا تھا کہ آپ کے آنے کی وجہ سے تسلی بھی ہوگی، پھر حضور ﷺ دعا فرمائیں گے تو اس کی وجہ سے کچھ تخفیف اور آسانی بھی ہو جائے گی، دونوں مقصد تھے چونکہ آپ ﷺ کی طبیعت میں شفقت اور رحمت کا جذبہ بہت زیادہ تھا تو آپ اس منظر کو دیکھنے سے کترانا چاہتے تھے اس لئے اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے ان کے اوپر دوبارہ پیغام بھیجا کہ دیکھو! ﴿اِنَّ لِلّٰہِ مَا أَخَذَ وَلَہٗ مَا أَعْطیٰ﴾ جو لے لیا؛ وہ بھی اللہ کا، اور جو دیا ہے؛ وہ بھی اللہ کا ہے۔ یعنی اس بچے کی جاں کنی کی حالت ہے اور بالکل آخری حالت ہے تو اس کی وجہ سے غمگین ہونے کی ضرورت نہیں، یہ اللہ کی دی ہوئی نعمت تھی، اس نے دی تھی اب وہی لے رہا ہے، اس لئے اس پر آپ پریشان نہ ہوں بلکہ یہ تو جس کی چیز تھی اس نے لے لی ﴿وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِأَجَلٍ مُّسَمًّی﴾ اور ہر چیز کی اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک مدت اور وقت مقرر ہے، تمہارے بچے کے لئے بھی ایک وقت مقرر تھا، اب وہ وقت مقررہ پورا ہوا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وہ واپس لیا جارہا ہے، لہٰذا تم کو چاہیے کہ صبر سے کام لو اور اس صبر پر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھو۔

﴿عادت اور عبادت میں فرق﴾

دیکھو! ہر نیکی کے کام کو انجام دیتے وقت یہ خیال بھی ہونا چاہیے کہ مَیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر رہا ہوں یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم بجالا رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے اس کا اجر اور ثواب بھی ملے گا۔ اسی کو شریعت کی اصطلاح میں ''احتساب'' کہتے ہیں یعنی نیکی کا کام کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھنا۔ یہی چیز ہے جو عبادت کو عبادت بناتی ہے

ورنہ اگر طبیعت میں یہ خیال نہ رہے تو پھر وہ عبادت نہیں رہے گی بلکہ عادت بن جائے گی یعنی آدمی عادت کے طور پر اس کام کو کرنے لگے گا۔ عبادت والا احساس باقی نہیں رہتا بہر حال! حضور ﷺ نے جانے کے بجائے یہ پیغام ان کو کہلوا دیا کہ صبر سے کام لو اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھو، جس کا جو وقت مقرر ہے اس پر وہ جاتا ہے، لہٰذا پریشان نہ ہو۔

﴿جوابی پیغام ...... صاحبزادی کا اصرار﴾

اس کے جواب میں آپ کی ان صاحبزادی نے قسم دے کر دوبارہ پیغام بھیجا کہ نہیں! آپ کو آنا ہی پڑے گا کہ میں آپ کو قسم دیتی ہوں کہ آپ ضرور تشریف لائیں۔ جب انھوں نے قسم دی اور دوبارہ اس طرح تاکیدی پیغام بھیجا تو نبی کریم ﷺ ان کے پاس جانے کے لئے اٹھے، جس وقت آپ اپنی ان صاحبزادی کے یہاں تشریف لے جانے لگے اس وقت آپ کے ساتھ حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور دوسرے کچھ انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم تھے۔ یہ سب بڑے بڑے صحابہ ہیں۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ یہ حضرات بھی ساتھ میں ہو لئے۔ جب اپنی صاحبزادی کے پاس آپ پہنچے تو اس چھوٹے بچہ کو۔ جس کی جاں کنی کی حالت تھی۔ اٹھا کر آپ کے ہاتھ میں دیا گیا، آپ کے ہاتھوں میں اس بچے کو رکھا گیا۔ آپ ﷺ نے اس بچے کو اپنی گود میں لیا اس وقت اس کی جان بے چین تھی، سانس بہت تیزی سے چل رہی تھی، جس آدمی کی روح نکل رہی ہو اس وقت اس کی سانس تیزی سے چلتی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر نبی کریم ﷺ کی مبارک آنکھوں میں آنسو آ گئے، آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بول پڑے: اے اللہ کے رسول! یہ کیا؟ گویا نبی کریم ﷺ کی

مبارک آنکھوں میں آنسو آنے کو انہوں نے بظاہر نبی کریم ﷺ کی شان کے خلاف سمجھا کہ آپ کی آنکھوں میں آنسو کیسے؟ اس لئے انھوں نے سوال کیا: ﴿مـا هـذا؟﴾ اے اللہ کے رسول! یہ کیا؟ یعنی آپ تو اللہ کے پیغمبر ہیں، اللہ کے رسول ہیں، آپ کی آنکھوں میں آنسو؟ گویا وہ یوں سمجھے کہ یہ چیز شانِ پیغمبری کے خلاف ہے اس لئے انہوں نے سوال کیا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿هٰـذِهٖ رَحْـمَةٌ جَعَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی فِیْ قُلُوْبِ عِبَادِهٖ﴾ اے سعد! یہ تو جذبۂ رحمت ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ودیعت فرمایا ہے یعنی آنکھوں کے اندر اس طرح آنسو کا آنا یہ کوئی شانِ رسالت اور شانِ پیغمبری کے خلاف نہیں ہے، یہ تو عین تقاضہ ہے اس جذبۂ رحمت کا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھا ہے۔ بھائی! ہر آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ نے وہ جذبۂ رحمت رکھا ہے کہ اس کی وجہ سے جب کسی تکلیف زدہ کو دیکھتا ہے تو اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی اور اس کی تکلیف کی وجہ سے اس کی طبیعت پر بھی اثر ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس بچے کی جان نکل رہی تھی اور وہ بچہ تکلیف میں تھا لہٰذا اس کی اس تکلیف کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ کی مبارک آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور آنکھوں کے اندر آنسوؤں کا آنا یہ برا نہیں ہے۔ بلکہ ایک دوسری روایت میں یہ ہے ﴿فِیْ قُـلُـوْبِ مَـنْ شَآءَ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے دل میں چاہتے ہیں یہ جذبہ ودیعت فرماتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس جذبہ سے محروم ہوتے ہیں۔

﴿وَاِنَّـمَا یَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَآءُ﴾ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے اس پر رحمت کا معاملہ کرتے ہیں جو دوسروں پر رحم کرنے والے ہوتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی

طرف سے اسی کے ساتھ رحمت کا معاملہ کیا جاتا ہے جو دوسروں کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرتا ہے۔اسی لئے نبی کریم ﷺ کا ایک اورارشاد ہے: ﴿اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمُکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ﴾ محدثین کے یہاں یہ روایت مسلسل بالاولیت کہلاتی ہے۔

﴿ دین دارلڑکے کی کرامت اوراس کی عجیب قربانی ﴾

ایک طویل روایت ہے اس لئے صرف ترجمہ کردیتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: پہلی امتوں میں ایک بادشاہ تھا،اس کے پاس ایک جادوگر تھا،اس زمانے میں بادشاہ اپنے پاس جادوگروں کو بھی رکھتے تھے تاکہ ان کے ذریعہ لوگوں کے اوپر اپنا تسلط جمائے رکھیں، جب وہ جادوگر بوڑھا ہوا تو اس نے بادشاہ سے کہا: میں تو بوڑھا ہوگیا ہوں کوئی نوعمر بچہ میرے حوالے کروتا کہ میں اس کو اپنا جادو کا یہ فن سکھادوں۔ چنانچہ بادشاہ نے شاہی خاندان کے ایک بچے کو اس کے حوالے کیا تاکہ وہ اس کو اپنا جادو کا یہ فن سکھادے۔وہ بچہ اس جادوگر کے پاس جادو سیکھنے کے لئے روزانہ آنے جانے لگا،جس راستے سے وہ آتا جاتا تھا اس راستے میں ایک راہب بھی رہتا تھا ''راہب''یعنی اللہ کا عبادت گذار بندہ۔ عیسائیوں میں جب تک کہ عیسائی مذہب کے اندرابھی تحریف نہیں ہوئی تھی اورانجیل اپنی اسی اصلی حالت پر تھی جو حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئی تھی تو اس وقت ان کے یہاں یہ رہبانیت کا سلسلہ بھی تھا،اس زمانے میں عیسائیوں کے ساتھ یہودیوں نے اور بت پرستوں نے بھی بڑے مظالم کئے۔یہ ایک بت پرست بادشاہ تھا جو یمن کے علاقہ نجران میں تھا(آج کل یہ نجران سعودیہ میں ہے) ''ذونواس'' اس کا لقب تھا،یہ

’’ذونواس‘‘ اُس زمانے کے جو اہل ایمان تھے ان پر بہت زیادتیاں کرتا تھا۔ بہرحال! اس راستے میں ایک راہب تھا جو اپنی ذات کو چھپائے ہوئے تھا، وہ بچہ جب جادوگر کے پاس آتا جاتا تھا تو راہب کے پاس سے گذرتا تھا، ایک روز ایسا ہوا کہ وہ بچہ اس راہب اور عابد کے پاس بیٹھا جو اللہ کا نیک بندہ تھا، اس کی باتیں اس کو بھلی معلوم ہوئیں کہ یہ اچھی باتیں ہیں، اللہ کی باتیں کرتا ہے، لہٰذا اب اس کی عادت یہ ہوگئی کہ جب بھی وہ جادوگر کے پاس جاتا، راستے میں راہب آتا تو وہ اس کے پاس بیٹھ جاتا، اور جب وہ جادوگر کے پاس پہنچتا تو لیٹ ہو جاتا، تو اس لیٹ ہونے پر وہ اس کی پٹائی کرتا کہ تو کیوں لیٹ آیا؟ اس نے ایک روز اس راہب سے شکایت کی کہ میں آپ کے پاس بیٹھتا ہوں، آپ کی باتیں سنتا ہوں تو اس کی وجہ سے وہاں جہاں مجھے بھیجا جاتا ہے؛ لیٹ ہو جاتا ہوں، اور اس لیٹ ہونے پر وہ میری پٹائی کرتا ہے، اب آپ اس سے بچنے کی کوئی تدبیر بتایئے۔ اس پر اس راہب نے اس سے یوں کہا: دیکھو! جب تم اس کے پاس لیٹ پہنچو اور تمہیں یہ خطرہ ہو کہ وہ تمہاری پٹائی کرے گا تو تم یوں کہہ دینا: ﴿حَبَسَنِیْ أَھْلِیْ﴾ میرے گھر والوں نے مجھے روک لیا تھا، تم یہ بہانہ کر دینا تا کہ وہ تمہاری پٹائی نہ کرے، اور گھر دیر سے پہنچو تو گھر والوں کو یوں کہنا: جادوگر اور استاد جی نے مجھے روک لیا تھا۔ دونوں طرف اس طرح بہانہ کر لینا۔ چنانچہ اس کے بعد پھر یہی تدبیر اختیار کی اور پٹائی سے اپنے آپ کو بچالیا۔ اب وہ برابر جادوگر کے پاس بھی جاتا تھا لیکن راستے میں اس عابد کے پاس ہمیشہ ٹھیرتا تھا اور اس سے اللہ کی سب باتیں سیکھ رہا تھا۔

اسی حالت پر تھا کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک بہت خطرناک اور بڑے اژدہے

نے لوگوں کا راستہ روک لیا، اس کے ڈر کی وجہ سے لوگ آنے جانے سے رُک گئے اور کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اس کو چھیڑے یا مارے۔ یہ بچہ وہاں سے گذرنے لگا تو اس نے دیکھا کہ یہاں ایک بہت بڑا اژدہا ہے جس نے لوگوں کا راستہ روک رکھا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے جی میں کہا ﴿اَلْیَوْمَ أَعْلَمُ اَلسَّاحِرُ أَفْضَلُ أَمِ الرَّاهِبُ أَفْضَلُ ؟﴾ آج مجھے پتہ چل جائے گا کہ ساحر یعنی یہ جادوگر بہتر ہے اور اللہ کے یہاں مقبول ہے یا یہ راہب اللہ کے یہاں مقبول ہے؟ آج میرے لئے اس کا امتحان کرنے کا وقت آ گیا۔ چنانچہ اس نے یہ کیا کہ ایک پتھر لے کر یوں کہا: اے اللہ! اگر یہ راہب تیرے نزدیک اس جادوگر کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہے؛ تو اس پتھر کے ذریعہ سے تو اس اژدہے کو ختم کر دے۔ یہ کہہ کر وہ پتھر مارا اور وہ مر گیا۔ بس! لوگوں کا راستہ کھل گیا۔ اس کے بعد وہ راہب کے پاس آ گیا تو اس پر راہب نے کہا: بیٹے! تو تو آج اللہ کے قرب میں مجھ سے بھی بڑھ گیا، تیرے ہاتھ پر یہ کرامت ظاہر ہوئی اور تیرا معاملہ لوگوں کے سامنے بھی آ گیا، اب اندیشہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیری آزمائش ہوگی اور کہیں ایسا نہ ہو کہ بادشاہ تجھے ایذائیں پہنچائے۔ اگر بادشاہ کی طرف سے ایذائیں پہنچنے کا وقت آ جائے؛ تو میرا نام مت لینا یعنی بادشاہ اگر تجھ سے پوچھے کہ یہ ساری باتیں تجھے کس نے سکھائیں تو میرا حوالہ مت دینا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔

اس کے بعد تو معاملہ اتنا آگے بڑھ گیا کہ کوئی مادرزاد اندھا ہوتا یعنی ماں کے پیٹ سے اندھا پیدا ہوتا اور یہ بچہ اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتا؛ تو وہ بینا ہو جاتا، اس کی بینائی ٹھیک ہو جاتی۔ کوئی کوڑھی ہوتا اور اس پر ہاتھ پھیر دیتا تو اس کی بیماری دور ہو جاتی اور جس کو جو بیماری ہوتی، بیمار لوگ اس کے پاس آتے تھے، یہ ہاتھ پھیر دیتا تھا؛ وہ ٹھیک ہو جاتے تھے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ بادشاہ کے وزیروں میں سے ایک وزیر اندھا ہوگیا، اس کو کسی نے بتلایا کہ فلاں صاحب ہیں جو ہاتھ پھیر دیتے ہیں تو بیمار ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ وہ بہت بڑے ہدیے لے کر اس کے پاس پہنچا اور کہا: اگر تو مجھے ٹھیک کردے تو یہ سب ہدیے تیرے لئے ہیں۔ اس نے کہا: مَیں تو کسی کو ٹھیک نہیں کرتا، شفا میرے ہاتھ میں نہیں، شفا دینے والے تو اللہ تعالیٰ ہیں، اس لڑکے کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی بیمار کسی بیماری سے شفاء کی دعا کے لئے اس کے پاس آتا تو اس کے ساتھ شرط کرلیتا تھا کہ تو اللہ پر ایمان لائے تو تیرے لئے دعا کروں گا اور تو ٹھیک ہوجائے گا۔ اس طرح سے بہت سارے لوگ ایمان لے آئے۔ لہٰذا اس کے ساتھ بھی شرط کی کہ اگر تو اللہ پر ایمان لے آئے تو مَیں تیرے لئے اللہ سے دعا کروں گا؛ تو اللہ تعالیٰ تجھے تندرستی دے دیں گے چنانچہ وہ اللہ پر ایمان لے آیا اور ٹھیک ہوگیا، بینا ہوگیا۔

پھر جب وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے پوچھا: تیری یہ بینائی کیسے ٹھیک ہوگئی؟ تو تو اندھا ہوگیا تھا؟ کس نے تجھے ٹھیک کیا؟ تو اس نے کہا؛ میرے پروردگار نے اچھا کیا بادشاہ نے کہا: میرے علاوہ بھی تیرا کوئی پروردگار ہے؟ تیرا پروردگار تو میں ہوں، اس نے کہا: نہیں! تیرا اور میرا دونوں کا پروردگار اللہ ہے۔ وزیر نے جب یہ کہا تو بادشاہ نے اس کو پکڑ کر ایذائیں دینا شروع کیں اور پوچھا کہ اس نے یہ کہاں سے سیکھا۔ اس نے پتہ دے دیا کہ فلاں لڑکے نے مجھے یہ سکھایا ہے۔ اب بادشاہ نے لڑکے کو بلوایا اور اس سے پوچھا کہ تیرا جادو تو بہت آگے نکل چکا ہے تو نابینا کو بینا کردیتا ہے، اس نے کہا: مَیں کسی کو تندرست نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ تندرست کردیتا ہے۔ بادشاہ نے اس کو بھی سزائیں

دینا اور تکلیف پہنچانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے اس راہب کا حوالہ دے دیا۔ حالانکہ وعدہ کر چکا تھا اور راہب نے اس کو کہا تھا کہ میرا نام مت لینا، لیکن راہب کا نام لے لیا۔

چنانچہ بادشاہ نے اس راہب کو پکڑ کر بلوایا اور اس سے یوں کہا کہ تو اپنا دین چھوڑ دے، وہ بادشاہ بت پرست تھا اور یہ راہب عیسائی تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ میں نہیں چھوڑ سکتا تو بادشاہ نے آرہ منگوایا اور زمین کے اندر اس آدمی کو ذرا سا گاڑ کر اس کے سر پر آرہ رکھ کر اس کے پورے دو ٹکڑے کر دئے اور اس کو چیر دیا۔ اس کے بعد وزیر کو بلایا اور اس کو بھی کہا کہ تو اپنا یہ دین چھوڑ دے۔ اس نے جواب دیا کہ میں نہیں چھوڑ سکتا، اس کے اوپر بھی آرہ رکھا اور اس کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے اس کے بعد پھر لڑکے کو بلایا اور کہا کہ تو اپنے دین سے باز آجا اور چھوڑ دے۔ اس نے بھی انکار کیا تو اس کو آرہ سے چیرنے کے بجائے بادشاہ نے اپنے کچھ آدمیوں کے حوالے کیا اور کہا کہ اس کو پہاڑ پر لے جاؤ اور بالکل چوٹی پر لے جا کر اس سے پوچھ لینا کہ اپنے دین سے باز آتا ہے اور اس کو چھوڑتا ہے، اگر باز آجائے اور چھوڑ دے تب تو ٹھیک ہے، اگر باز نہ آئے اور نہ چھوڑے تو پھر اس کو وہاں سے گرا دینا تا کہ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ چنانچہ وہ لوگ اس کو لے گئے، اب اس نے وہاں جا کر دعا کی: اے اللہ! تو جس طرح چاہے میری طرف سے ان کو کافی ہو جا یعنی ان کا شر اور ان کی طرف سے جو ایذا مجھے پہنچ سکتی ہے تو جس طرح چاہے دور کر دے۔ چنانچہ پہاڑ میں ایک دم سے جھرجھری سی آئی اور جو لوگ اس کو لے کر گئے تھے؛ وہ سب چوٹی پر سے نیچے گر گئے اور مر گئے اور یہ لڑکا سلامت رہا اور چل کر بادشاہ کے پاس آیا۔ بادشاہ نے پوچھا: وہ لوگ کیا ہوئے؟ اس نے

کہا: اللہ تعالیٰ نے ان کو ختم کردیا۔

پھر بادشاہ نے اس کو کچھ اور لوگوں کے حوالے کیا کہ اس کو کشتی میں لے جاؤ اور سمندر کے بیچ میں لے جانے کے بعد اس سے پوچھو اگر وہ اپنے دین سے باز آجائے تب تو ٹھیک ہے واپس لے آنا؛ ورنہ تو سمندر میں ڈال دینا۔ وہ اس کو کشتی میں لے گئے، وہاں پہنچنے کے بعد اس نے پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اس کی دعا کے نتیجے میں کشتی ڈوبی تو وہ سب ڈوب گئے اور یہ بچ کر پھر بادشاہ کے پاس آگیا۔ بادشاہ نے پوچھا: کیا ہوا؟ اس نے کہا: ان سب لوگوں کو اللہ تعالیٰ میری طرف سے کافی ہوگیا، وہ سب ڈوب گئے۔

اب اس نے بادشاہ سے کہا: ﴿اِنَّکَ لَسْتَ بِقَاتِلِی حَتّٰی تَفْعَلَ مَا آمُرُکَ بِهٖ﴾ دیکھو! تم مجھے مار نہیں سکتے ہو، ہاں! مَیں ایک تدبیر بتلاتا ہوں اس تدبیر پر اگر تم عمل کرو؛ تو مَیں مروں گا، اس کے بغیر تم مجھے مار نہیں سکتے۔ بادشاہ نے پوچھا: وہ تدبیر کیا ہے؟ کہا: پہلا کام تو یہ کرو کہ ایک میدان میں تمام لوگوں کو جمع کرو، اس کے بعد مجھے درخت کے تنے کے اوپر لٹکاؤ، اس کے بعد میرے ترکش میں سے ایک تیر نکالو اور اس کو کمان کے بیچ میں رکھ کر کہو: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ رَبِّ الْغُلَامِ﴾ پھر مجھے وہ تیر مارو، جب تم اس طرح کروگے تو ہی مجھے مار پاؤ گے۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا جیسا اس لڑکے نے کہا۔ اور تیر مارا تو وہ تیر اس کی کنپٹی میں لگا اور اس کا وہیں انتقال ہوگیا۔ اب جب یہ ہوا تو جتنے بھی لوگ تھے؛ وہ سب کہنے لگے کہ ہم اس لڑکے کا جو رب ہے اس پر ایمان لاتے ہیں گویا وہ سب بادشاہ سے ہٹ گئے اور ان کی سمجھ میں آگیا کہ جو آدمی اس لڑکے کو قتل کرنے میں بھی محتاج ہے، جب تک کہ اُس نے اِس لڑکے کے رب کا نام نہیں لیا اُس وقت تک یہ بچہ اور لڑکا اُس سے نہیں مرا؛ تو اُس

کے ہاتھ میں ہے کیا؟ چنانچہ سب لوگ اللہ پر ایمان لے آئے۔اسی لئے اس نے یہ تدبیر اختیار کی تھی۔ گویا اپنے آپ کو قربان کیا اور تمام لوگوں کو ایمان کی دولت سے مالا مال کرایا۔

اب بادشاہ کے جو مشیر لوگ تھے انھوں نے کہا: دیکھو! تم کو جو ڈر تھا؛ وہی ہوا۔ اس بچے کو تم اسی لئے قتل کرواتے تھے تاکہ اس کو دیکھ کر لوگوں کا دین خراب نہ ہو، عقیدہ نہ بگڑے۔لیکن اس نے مر کے سب کو مسلمان بنایا ہے۔ بادشاہ نے کہا: دیکھو! ہر گلی اور ہر محلے کے کنارے پر خندقیں کھودو۔

چنانچہ اس کے حکم پر پوری بستی کے اندر ہر گلی اور ہر محلے کے اوپر خندقیں کھودی گئیں اور اس کے اندر آگ جلائی گئی، جب آگ آسمان کو چھونے لگی، تو پھر لوگوں کو پکڑ کر لایا جاتا تھا کہ اپنے دین سے باز آتے ہو یا اندر ڈالیں، لیکن کوئی بھی باز نہیں آیا، سب کہتے تھے کہ ہم تو باز نہیں آتے، ان کو ڈال دیا جاتا تھا، اسی طرح سب کو ختم کیا گیا۔

یہاں تک کہ ایک عورت کو لایا گیا اس کے ساتھ اس کا ایک چھوٹا بچہ تھا، اپنے بچے کی محبت کی وجہ سے اس عورت کو کچھ جھجھک ہوئی تو بچہ اس کو کہنے لگا، چھوٹا سا دودھ پیتا بچہ تھا، اس نے اپنی ماں سے کہا: ماں کوئی بات نہیں، تو حق پر ہے، مر جا، اپنے آپ کو قربانی کے واسطے پیش کر دے چنانچہ ماں کی جو جھجھک تھی؛ وہ ختم ہوگئی، اور اس نے بھی انکار کیا کہ میں بھی اپنے دین کو نہیں چھوڑ سکتی، اور اس کو بھی ڈال دیا گیا۔قرآنِ پاک میں سورۃ البروج میں ہے ﴿قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ﴾ وہ یہی اصحاب الاخدود کا قصہ ہے۔

بہرحال! اُس بچے کا اور ان لوگوں کا جو صبر تھا کہ اس مصیبت پر اور بادشاہ کے مظالم پر صبر کیا لیکن اپنے دین کو نہیں چھوڑا اور ایمان پر قائم رہے، اسی بات کو بتلانے کیلئے اس روایت کو یہاں لائے۔

اقتبــــــــــــاس

ان احادیث سے ایک بہت بڑا سبق ہمیں یہ بھی ملتا ہے
کہ کسی بھی چیز کے ہمارے ہاتھ سے نکل جانے پر ہمیں ایک تو
صبر سے کام لینا چاہیے اور یوں سوچنا چاہیے کہ یہ نعمت جو میرے ہاتھ
سے لے لی گئی ہے، اس کو لے کر مجھے آزمایا جارہا ہے، اور اس آزمائش میں اگر
مَیں کامیاب ہو گیا اور مَیں نے صبر سے کام لیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے ثواب
کی امید رکھی؛ تو یہ جو لیا گیا اس سے کئی گنا زیادہ اور اس سے کئی گنا اچھا بدلہ مجھے
اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دیا جائے گا۔ اس لئے جو بھی چیزیں ہمارے
ہاتھ سے جاتی ہیں؛ ان تمام چیزوں کے متعلق ہمیں ایک مؤمن ہونے کی
حیثیت سے یہ تصور رکھنا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کی ہمیں یہ تعلیم اور ہدایت ہے کہ
ہمارے ہاتھ سے کوئی چیز چلی جائے تو اس پر یوں سوچنا چاہیے کہ:-

''گیا کیا اور ملا کیا؟''

صبر
مجلس ۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً . اما بعد .

﴿صبر کا صحیح وقت﴾

عن انس رضی اللہ عنہ قَالَ مَرَّالنَّبِیُّ ﷺ بِامْرَأَۃٍ تَبْکِیْ عِنْدَقَبْرٍفَقَالَ:اِتَّقِی اللّٰہَ وَاصْبِرِیْ فَقَالَتْ:اِلَیْکَ عَنِّیْ فَاِنَّکَ لَمْ تُصَبْ بِمُصِیْبَتِیْ.وَلَمْ تَعْرِفْہُ.فَقِیْلَ لَھَا اِنَّہُ النَّبِیُّ ﷺ.فَاَتَتْ بَابَ النَّبِیِّ ﷺ فَلَمْ تَجِدْعِنْدَہٗ بَوَّابِیْنَ.فَقَالَتْ:لَمْ اَعْرِفْکَ. فَقَالَ:اِنَّمَاالصَّبْرُعِنْدَالصَّدْمَۃِ الْاُوْلیٰ.(متفق علیہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کا گذر ایک عورت کے پاس سے ہوا جو ایک قبر کے پاس بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم کی روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کا بیٹا انتقال کر گیا تھا اور وہ قبر اس کے بیٹے کی تھی اسی کے غم میں وہاں پر وہ رو رہی تھی، نبی کریم ﷺ نے جب اس کو روتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ﴿اِتَّقِی اللّٰہَ وَاصْبِرِیْ﴾ کہ اللہ سے ڈر اور صبر سے کام لے۔

پچھلی مجلس میں بتلا چکا ہوں کہ غیر اختیاری طور پر کسی مصیبت کی وجہ سے اگر آنسو نکل آویں، آواز بھی نکل جائے اور رونا ہو تو اس پر کوئی پکڑ نہیں لیکن آدمی قصداً نوحہ والی شکل

اختیار کرے جیسا کہ میں نے تفصیل پہلے بتلا دی تھی تو شریعت نے اس کو منع کیا ہے اور نبی کریم ﷺ عورتوں سے جب بیعت لیتے تھے تو باقاعدہ توبہ میں اس کو بھی شریک فرماتے تھے اوران سے یہ وعدہ لیتے تھے کہ نوحہ نہیں کریں گی۔ یہ عورت جو اپنے بیٹے کی قبر کے پاس رورہی تھی، ہوسکتا ہے کہ اس کا رونا اسی قبیل سے ہو، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے اس کو صبر کی تلقین فرمائی اور فرمایا: اللہ سے ڈر اور صبر سے کام لے، اس طرح رونے دھونے سے کوئی فرق پڑتا نہیں۔ اس عورت نے نبی کریم ﷺ کو پہچانا نہیں اس لئے اس نے جواب میں حضوراکرم ﷺ سے یوں کہا: ﴿اِلَیْکَ عَنِّیْ﴾ ہٹو یہاں سے! آپ پر وہ مصیبت نہیں پڑی ہے؛ جو مجھ پر پڑی ہے۔ اس نے یہ نہیں پہچانا کہ یہ کہنے والے نبی کریم ﷺ ہیں، اس نے یوں سمجھا کہ کوئی عامی آدمی ہے اور مجھے کسی بات کی نصیحت کررہا ہے، اس لئے اس نے اس طرح کا جواب دیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شان میں جس ادب کی رعایت کرنی چاہیے تھی؛ ناواقفیت کی وجہ سے وہ نہیں کرپائی۔ بہرحال! اس نے جواب میں بجائے اس کے کہ اس نصیحت پر عمل کرتی اور اس کو قبول کرتی حضوراکرم ﷺ کو یوں کہا: آپ یہاں سے چلے جایئے، آپ پر وہ مصیبت نہیں پڑی ہے؛ جو مجھ پر پڑی ہے ﴿وَلَمْ تَعْرِفْهُ﴾ روایت کے الفاظ ہیں کہ وہ عورت حضور ﷺ کو پہچان نہیں پائی۔ اب حضور ﷺ تو اس کو نصیحت فرمانے کے بعد وہاں سے تشریف لے گئے، آپ کے وہاں سے تشریف لے جانے کے بعد لوگوں نے اس عورت کو بتلایا کہ پگلی! تجھے معلوم نہیں کہ تو نے یہ جواب کس کو دیا؟ یہ حضوراکرم ﷺ تھے اور تو نے ان کو یہ جواب دیا ہے کہ آپ یہاں سے چلے جایئے آپ پر وہ مصیبت نہیں آئی ہے جو مجھ پر آئی ہے۔ جب اس نے یہ سنا کہ یہ نبی کریم ﷺ تھے تو بہت

سٹپٹائی اور اس کو بڑا خوف لاحق ہوا کہ اب کیا ہوگا چنانچہ معافی مانگنے کی غرض سے آپ ﷺ کے دولت کدے پر حاضر ہوئی۔ جب حضور ﷺ کے مکان پر پہنچی تو دیکھا کہ وہاں کوئی دربان نہیں ہے جیسے بڑے آدمیوں، بادشاہوں، سلاطین، حاکموں کے مکان پر دربان ہوا کرتے ہیں؛ وہاں ایسا کوئی دربان نہیں ہے۔ اس پر اس کو بڑا تعجب ہوا۔ پھر حضور اکرم ﷺ کے سامنے آئی اور معذرت کرتے ہوئے یوں کہا: ﴿لَمْ اَعْرِفْکَ ﴾ اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ گویا وہ اپنے جواب پر معذرت طلب کر رہی تھی کہ میں نے آپ کو جو جواب دیا وہ اس لئے تھا کہ میں آپ کو پہچان نہیں پائی۔

نبی کریم ﷺ نے اس کی اس بات سے صرف نظر کرتے ہوئے جو حقیقت تھی وہ بیان فرمائی: ﴿اِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰی ﴾ دیکھو! صبر تو حقیقت میں وہی ہوتا ہے کہ آدمی پر مصیبت پڑے اس وقت صبر سے کام لے یعنی جس وقت ابتداءً آدمی کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے، آفت اور بلا میں گرفتار ہوتا ہے، شروع میں جب وہ آفت آتی ہے؛ تب اس کو جو صدمہ پہنچتا ہے؛ اگر اس وقت آدمی صبر سے کام لے تو وہ ہے صبر۔ باقی مدت گذر جانے کے بعد تو جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے ''وقت بہت بڑا مرہم ہے'' بڑے سے بڑا غم اور بڑے سے بڑا زخم بھی آدمی بھلا دیا کرتا ہے اور اس کو صبر آہی جاتا ہے، وہ صبر کافی نہیں ہے۔ اور اس صبر پر وہ وعدے نہیں ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے صبر پر کئے گئے ہیں۔ وعدہ اس صبر کے اوپر ہے کہ آدمی کو اولاً مصیبت لاحق ہوئی یعنی شروع میں مصیبت پڑی اسی وقت وہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے اجر اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے صبر سے کام لے، اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو نوازا جاتا ہے

اور وہی حقیقی معنی میں صبر ہے۔ ورنہ زمانہ گذرنے کے بعد آدمی ٹھنڈا ہو جائے اور پھر ضبط اور صبر سے کام لے؛ تو ہر ایک کو یہ چیز حاصل ہو ہی جاتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں جو مطلوب ہے وہ یہ ہے۔ گویا حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تیرے اوپر وہ مصیبت آئی تھی اور میں نے تجھ سے کہا تھا اس وقت اگر تو صبر سے کام لیتی تو وہ فضیلت حاصل ہوتی، اب وہ فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔

اس روایت کو لا کر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ صبر کا محل اور موقع کیا ہے اس کو بتلانا چاہتے ہیں۔ گویا جہاں اول وہلہ میں مصیبت آدمی کو پہنچتی ہے مثلاً کسی کا انتقال ہو گیا کوئی اور حادثہ پیش آیا کوئی مالی نقصان ہوا تو اسی وقت آدمی اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کی امید رکھتے ہوئے صبر سے کام لے؛ تو یہ ہے صبر۔ باقی اس وقت تو آہ واویلا کرتا رہا، چیختا چلاتا رہا، لوگوں کے سامنے شکوے اور شکایتیں کرتا رہا اور بعد میں پھر دھیرے دھیرے زمانہ گذرتا گیا اور آپ ہی آپ اس کو ذرا سکون حاصل ہوتا گیا تو اس کے بعد جو صبر آئے گا وہ کسی کام کا نہیں، اس سے وہ فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔

محبوب کے انتقال پر صبر کی فضیلت

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: يَقُوْلُ اللّٰہُ تَعَالىٰ: مَالِعَبْدِیْ الْمُؤْمِنِ عِنْدِیْ جَزَآءٌ اِذَاقَبَضْتُ صَفِيَّهُ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَاثُمَّ أَحْتَسَبَهُ اِلَّاالْجَنَّة. (رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ باری تعالیٰ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں۔ پہلے بھی میں بتلا چکا ہوں کہ حدیثِ پاک میں جب نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل فرمائیں تو وہ حدیثِ قدسی کہلاتی ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

میرے مؤمن بندے کے لئے اس چیز کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں ہے جب میں اس کے کسی محبوب کی روح قبض کرلوں، دنیا والوں میں سے اس کا محبوب اس سے لے لوں اور پھر وہ اس پر صبر کرتے ہوئے مجھ سے ثواب کی امید رکھے۔یعنی اگر کسی کے محبوب کا انتقال ہو جائے چاہے اس کا بیٹا ہو، باپ ہو، کوئی بھی عزیز ہو جس کے ساتھ اس کو محبت تھی، جتنی جتنی محبت جس درجے کی ہوگی اسی درجے کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو اجر دیا جائے گا۔تو اگر کسی کا محبوب ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے محبوب کو لے لیں یعنی اس کے محبوب کا انتقال ہو جائے بیٹے کا انتقال ہو جائے یا اور کسی قریبی عزیز، رشتہ دار کا انتقال ہو جائے جو اس کے نزدیک بہت زیادہ محبوب تھا اور اس کے انتقال پر اگر وہ صبر سے کام لیتا ہے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے یہاں اس کا سوائے جنت کے کوئی بدلہ نہیں ہے۔

یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اکرام ہے۔اس لئے کہ وہ اس کا محبوب تھا اور اللہ نے لیا، حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اللہ ہی کی ملک تھی اللہ تعالیٰ کی چیز تھی اللہ تعالیٰ نے لے لی، لیکن اس کے باوجود بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ انعام کیا، اگر اس لینے پر بندے نے صبر، تحمل اور بردباری سے کام لیا، آہ وواویلا نہیں کیا، شکوے شکایتیں نہیں کیں، رویا دھویا نہیں تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو بدلے کے طور پر جنت دی جاتی ہے۔

لہٰذا جس وقت کسی کے کسی محبوب کا انتقال ہو تو تصور کرے کہ میں اگر صبر سے کام لوں گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مجھے اس پر اجر اور ثواب دیا جائے گا۔ ﴿احتسبه﴾ کا یہی مطلب ہے۔

﴿ہر نیک عمل میں حصولِ ثواب کا استحضار ضروری ہے﴾

میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں ہر کام میں آدمی یہ تصور کرے کہ میں جو کر رہا ہوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے اس پر ثواب ملے گا یعنی اس کام کو اللہ کے واسطے ثواب حاصل کرنے کی نیت سے کرے۔ یہ تصور ہو تو اس صورت میں اس کام پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو ثواب ملے گا اور اجر دیا جائے گا۔اور اگر یہ تصور نہیں ہے تو پھر وہ فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔نماز بھی ویسے ہی بغیر احتساب کے پڑھ لی تو فریضہ تو ادا ہو جائے گا یعنی نماز جو اس کے ذمہ تھی وہ ذمہ پورا ہو جائے گا لیکن نماز پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو ثواب ملا کرتا ہے؛ وہ حاصل نہیں ہوگا۔

حدیث میں آتا ہے﴿مَن صَامَ رَمَضَانَ اِیۡمَانًاوَّاِحۡتِسَابًاغُفِرَ لَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡبِهٖ،مَنۡ قَامَ لَیۡلَةَالۡقَدۡرِاِیۡمَانًاوَّاحۡتِسَابًا﴾جس نے ایمان کی حالت میں ثواب کی امید سے رمضان کے روزے رکھے اس کے اگلے گناہ بخش دئے جائیں گے،جس نے شبِ قدر میں ایمان کی حالت میں ثواب کی نیت سے عبادت کی،اس کے اگلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔تو دونوں جگہ پر قید لگائی گئی ہے ’’رمضان کے روزے یا لیلۃ القدر کی عبادت ایمان کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی امید رکھتے ہوئے انجام دیں‘‘۔تو آدمی کوئی بھی کام کرے اس کے پیشِ نظر اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہونی چاہیے۔

شروع میں جہاں اخلاص کا تذکرہ آیا تھا وہاں بتلایا تھا کہ ہر کام میں یہاں تک کہ جو ہمارے طبعی کام ہیں اور ہم اپنے طبیعت کے تقاضے سے انجام دیتے ہیں ان میں بھی اگر احتساب ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی امید رکھتے ہوئے ہم اس کام کو انجام

دیں گے تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم کو اجر و ثواب ملے گا۔

ہم رات کو اس لئے سوئیں کہ سونے سے ہم کو سکون ملے گا اور ہمارے بدن کو راحت پہنچ جائے گی اور ہم دوبارہ اس قابل ہو جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اس کے احکام کو بجالائیں، گویا اپنے اس جسم کو آرام اس لئے دے رہے ہیں کہ دوبارہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے جسم کو استعمال کر سکیں۔ یہ مشین تھوڑی دیر کے لئے اس لئے بند رکھی ہے کہ دوبارہ چل سکے تو اس صورت میں یہ سونا بھی عبادت کہلائے گا اور اس پر بھی ثواب ملے گا۔

کھانا اس لئے کھا رہے ہیں کہ اس کھانے کے ذریعہ سے جو قوت حاصل ہو گی اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں استعمال کریں گے تو اس صورت میں یہ کھانا بھی عبادت میں شمار ہو گا۔

ہر کام میں احتساب ضروری ہے یہاں پر بھی جو قید لگائی ہے کہ اپنے محبوب کے انتقال پر اگر صبر سے کام لیتے ہوئے اللہ سے اجر و ثواب کی امید رکھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو جنت سے کم کچھ نہیں دیں گے یعنی جنت جیسا بدلہ ملے گا۔ جنت بہت بڑی چیز ہے، بہت بڑا بدلہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو دیا گیا ہے۔

طاعون کافر کے لئے عذاب...... مومن کے لئے رحمت

عن عائشة رضی اللہ عنہا اَنَّهَا سَأَلَتْ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ عَنِ الطَّاعُوْنِ، فَاَخْبَرَهَا اَنَّهُ كَانَ عَذَابًا يَّبْعَثُهُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ، فَجَعَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى رَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ، فَلَيْسَ مِنْ عَبْدٍ يَقَعُ فِي الطَّاعُوْنِ فَيَمْكُثُ فِيْ بَلَدِهٖ صَابِرًا مُّحْتَسِبًا يَعْلَمُ اَنَّهُ لَا يُصِيْبُهُ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِثْلُ أَجْرِ الشَّهِيْدِ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ سے طاعون (plague) کے متعلق پوچھا۔ طاعون ایک بیماری ہے اس وقت اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہر شخص واقف ہے (کیوں کہ سورت شہر قریبی زمانہ میں اس کی زد میں آیا تھا۔م) ایک مخصوص قسم کا وبائی مرض ہے جس میں آدمی کے کسی جوڑ میں بغل میں یا اور کسی جوڑ کے اندر گلٹی اور گانٹھ ہو جاتی ہے اور اس کے بعد جسم میں کچھ حرارت اور بخار سا ہوتا ہے، قے ہوتی ہے اور تھوڑے سے وقت کے بعد آدمی مر جاتا ہے اور یہ بہت خطرناک وبائی مرض ہے، جب پھیلتا ہے تو بہت بڑی مقدار میں آدمی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔

آپ ﷺ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کے متعلق دریافت کیا، حضور ﷺ نے فرمایا: دراصل اس کی ابتداء تو اس طرح ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس کو اگلے لوگوں میں سے بعض کے گناہوں کی سزا کے طور پر عذاب دینے کے واسطے اتارا تھا لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہلِ ایمان کے واسطے اس کو رحمت بنا دیا یعنی آج بھی اگر کوئی مؤمن اس بیماری کے اندر مبتلا ہو تو اس صورت میں اس کے حق میں وہ عذاب نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے۔ اسی لئے فرماتے ہیں ﴿فجعلهُ الله تعالیٰ رحمةً للمؤمنین﴾

﴿طاعون مؤمنین کے لئے رحمت کب بنتا ہے﴾

اہل ایمان کے واسطے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو رحمت کیسے بنایا؟ حضور ﷺ اس کی وضاحت فرماتے ہیں کہ جو بندہ طاعون میں مبتلا ہو یعنی کسی شہر میں طاعون ہو گیا اور وہ آدمی اس شہر میں رہتا ہے اور طاعون پھیل جانے کے بعد بھی وہ اس شہر کو یہ سمجھ کر چھوڑ کر نہیں جا رہا ہے کہ میرے واسطے اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں جو مقدر رہے وہ تو ہو کر رہے گا۔

اور اگر وہ یوں سوچے کہ میں شہر چھوڑ کر چلا جاؤں گا تو بچ جاؤں گا تو اس کا یہ سمجھنا غلط ہے، صحیح نہیں ہے۔اس لئے کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کی قسمت میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ طاعون کی اسی بیماری سے موت پاوے تو اس صورت میں اس شہر میں رہے تب بھی موت آئے گی اور کہیں دوسری جگہ چلا جائے تب بھی اس کو موت آ کر کے رہے گی۔تو ایمان والوں کا ایمان ان سے اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ وہ یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جو مصیبت لکھ دی ہے وہ ہی مجھے پہنچے گی اس کے علاوہ اور کوئی مصیبت پہنچنے والی نہیں ہے ﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے لئے تقدیر میں جو لکھ دیا ہے وہ ہی ہم کو پہنچے گا اس کے علاوہ اور کوئی چیز ہم کو پہنچنے والی نہیں۔ یہ سمجھ کر اور اللہ سے اجر وثواب کی امید رکھتے ہوئے صبر سے کام لیتے ہوئے تحمل کرتے ہوئے وہ اسی شہر میں ٹھیرا رہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہید کا ثواب ملتا ہے۔کیوں؟ اس لئے کہ وہاں جب موت اتنی عام ہوگئی ہے جہاں اس کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ ہوسکتا ہے کہ موت آجائے، اس صورت میں بھی اگر وہ صبر وضبط سے کام لیتے ہوئے اور ایمان کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے یوں سمجھ کر کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جو طے فرما دیا ہے وہی ہو کر رہے گا اس میں ذرہ برابر بھی کوئی فرق آنے والا نہیں ہے؛ اسی جگہ رہتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو شہید کا ثواب ملے گا۔

طاعون زدہ علاقہ کے بارے میں شرعی حکم اور اس کی حکمت

لہٰذا جس بستی کے اندر طاعون پھیلا ہو، اس کا یہی حکم ہے کہ جو آدمی جس بستی میں رہتا ہوا اس کو چھوڑ کر چلا نہ جائے۔اور اس میں کئی مصلحتیں بھی ہیں، ایک تو یہ کہ اس طرح

تندرست لوگ۔ جوابھی بیماری میں مبتلانہیں ہوئے ہیں۔ شہر کو چھوڑ کر چلے جائیں گے تو جو بیمار ہیں ان کی تیمارداری کون کرے گا۔اسی طرح اس بیماری کی وجہ سے جولوگ موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں ان کی تجہیز وتدفین وغیرہ کا انتظام کون کرے گا۔اس لئے شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی۔اور جولوگ وہاں نہیں ہیں دوسری جگہ رہتے ہیں ان کو بھی یہ حکم دیا کہ اب وہ اس بستی میں نہ آویں اوراس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ اگر وہ اس بستی میں آیااور اس کو بیماری لاحق ہوئی اور انتقال کر گیا تو حقیقت تو یہ ہے کہ وہ نہ آتا تب بھی یہ مصیبت اس کولاحق ہونے ہی والی تھی لیکن یہاں آنے کے بعد لاحق ہوئی تو شاید وہ یہ سمجھے کہ میرے یہاں آنے کی وجہ سے میں اس بیماری میں مبتلا ہوا، اگر نہ آتا تو مبتلا نہ ہوتا گویا یہ عقیدہ خراب کرنے والی چیز ہے۔اس لئے شریعت نے اس سے منع کیا کہ جہاں اس طرح کی وبائی بیماری پھیل چکی ہواور وہاں اگر آپ نہیں ہیں تو نہ جائیں، اور ہیں تو وہاں سے ہٹنے کی بھی اجازت نہیں دی۔اس میں اور بھی بڑی بڑی مصلحتیں ہیں اور ہمارا یہ شہر (سورت) اس سے گذر چکا ہے اور یہ دونوں مصلحتوں سے بھی ہم ماشاءاللہ خوب واقف ہو چکے ہیں۔جو گئے ان کو جانے کی وجہ سے کیا کیا مصیبتیں آئیں اور کیا کیا بھگتنا پڑا وہ بھی سب کو معلوم ہے اور جو یہیں رہے اس کی وجہ سے کیا آسانیاں ہوئیں وہ بھی مخفی نہیں۔

بینائی نہ ہونے یا ختم ہوجانے کی فضیلت

عن انس رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: ان اللہ عزوجل قال: اِذَا ابْتَلَيْتُ عَبْدِیْ بِحَبِيْبَتَيْهِ، فَصَبَرَ، عَوَّضْتُهُ مِنْهُمَا الْجَنَّةَ. يُرِيْدُ عَيْنَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے

فرمایا: (یہ بھی حدیثِ قدسی ہے) جب میں اپنے بندے کو اس کی دو محبوب چیزوں کے ذریعہ سے آزماتا ہوں اور اس پر وہ صبر سے کام لیتا ہے تو میں اس کو اس کے بدلے میں جنت دیتا ہوں۔ دو محبوب چیزیں یعنی دو آنکھیں۔ یعنی اگر کسی آدمی کی بینائی چھن جائے یا یہ ہے کہ شروع سے بینائی ہے ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کو بینائی دی ہی نہیں، مادرزاد اندھا پیدا ہوا یا پیدا ہوا تب دیکھتا تھا لیکن بعد میں کسی بیماری کی وجہ سے اس کی آنکھیں نہیں رہیں اور دیکھنے کی صلاحیت ختم ہوگئی اور اس پر اس نے صبر سے کام لیا؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے بدلے میں اس کو جنت عطا فرمائیں گے۔ دیکھئے! اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب یہ چیز لے لی گئی تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے جنت عطا فرمائی۔ اس لئے آدمی کو یوں سوچنا چاہیے کہ کوئی بھی چیز جب ہمارے پاس سے جائے، کوئی چھوٹی سی نعمت چھن جائے تو اس کے جانے پر پریشان نہ ہوں۔

﴿یہ نہ دیکھئے کہ کیا گیا، یہ دیکھئے کہ کیا ملا﴾

یہاں ہمیں یہ سبق دیا جارہا ہے کہ مصیبت پر ہمیں پریشان یا دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھئے! یہاں آنکھیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے لے لیں، آنکھیں بہت عظیم نعمت ہیں لیکن بہرحال! آپ اس سے جنت کا مقابلہ تو نہیں کرسکتے، اس لئے کہ دنیا میں جو آنکھیں آپ کو حاصل ہوں گی وہ کب تک کام دیں گی؟ موت آئے گی تب تک۔ تو گویا یہ آنکھیں بھی فانی ہی ہیں، اس کے لئے تو ایک فانی چیز تھی اگرچہ اپنی جگہ پر بہت اہمیت کی حامل تھیں اور بہت عظیم چیز تھی لیکن تھی فانی، تو اس کو لے لینے کے بدلے میں جب اس نے صبر سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت عطا فرمائی۔

ان احادیث سے ایک بہت بڑا سبق ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ کسی بھی چیز کے ہمارے ہاتھ سے نکل جانے پر ہمیں ایک تو صبر سے کام لینا چاہیے اور یوں سوچنا چاہیے کہ یہ نعمت جو میرے ہاتھ سے لے لی گئی ہے اس کو لے کر مجھے آزمایا جارہا ہے اور اس آزمائش میں اگر مَیں کامیاب ہوگیا اور مَیں نے صبر سے کام لیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے ثواب کی امید رکھی تو یہ جو لیا گیا اس سے کئی گنا زیادہ اور اس سے کئی گنا اچھا بدلہ مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دیا جائے گا، اس لئے کہ آنکھوں ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اور بھی جو چیزیں ہمارے ہاتھ سے جاتی ہیں ان تمام چیزوں کے متعلق ہمیں ایک مؤمن ہونے کی حیثیت سے یہ تصور رکھنا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کی ہمیں یہ تعلیم اور ہدایت ہے کہ ہمارے ہاتھ سے کوئی چیز چلی جائے تو اس پر یوں سوچنا چاہیے کہ ''گیا کیا اور ملا کیا؟''

بھائی! کوئی بچہ ہے اس کا دو روپے والا ایک قلم گم ہوگیا، اب اس نے ابّا سے کہا کہ ابّا قلم گم ہوگیا، باپ نے لاکر اس کو دس روپے والا قلم دے دیا تو اب وہ یوں کہہ سکتا ہے کہ میں تو کچھ کھوٹ اور نقصان میں نہیں رہا بلکہ فائدے میں رہا کہ جو چیز گئی اس سے اچھی چیز مجھ کو ملی۔ ایسے ہی ہمارے پاس سے جو چیز جارہی ہے تو یہ نہ دیکھئے کہ کیا گیا، بلکہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس کے اس جانے پر اگر میں صبر سے کام لوں گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟ اگر ہم یہ سوچیں گے اور یہ تصور کریں گے تو ان شاء اللہ اس جانے والی چیز پر ہمیں کوئی غم اور افسوس نہیں ہوگا، بلکہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں جو ہدایت فرمائی ہے اور جو تعلیم دی ہے اس کے مطابق ہم صبر سے کام لیں گے۔

حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کی سوچ

عن عطاء بن أبی رباح قال قال لی ابن عباس رضی اللہ عنہ: أَلاأُرِیکَ امْرَأَۃً مِنْ أَھْلِ الْجَنَّۃِ؟فَقُلْتُ بَلیٰ .قَالَ:ھَذِہِ الْمَرْأَۃُ السَّوْدَاءُ.اَتَتِ النَّبِیَّ ﷺ فَقَالَتْ:اِنِّیْ أُصْرَعُ وَاِنِّی أَتَکَشَّفُ فَادْعُ اللّٰہَ تَعَالیٰ لِیْ قَالَ.اِنْ شِئْتِ صَبَرْتِ وَلَکِ الْجَنَّۃُ.وَاِنْ شِئْتِ دَعَوْتُ اللّٰہَ تَعَالیٰ اَنْ یُّعَافِیَکِ.فَقَالَتْ:أَصْبِرُ.فَقَالَتْ:اِنِّیْ أَتَکَشَّفُ فَادْعُ اللّٰہَ اَنْ لَاأَتَکَشَّفَ.فَدَعَالَھَا.

حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ بڑے جلیل القدر تابعی ہیں، کہتے ہیں کہ یہ بڑے بدصورت ،سیاہ فام تھے،ان کے جسم کے کسی عضو کے اندر کوئی خوبی نہیں تھی یعنی ہر اعتبار سے رنگت کے اعتبار سے چہرے اور اعضاء کی ساخت اور بناوٹ کے اعتبار سے بڑے بدصورت تھے لیکن انہوں نے یوں سوچا کہ مَیں اپنی اس جسمانی کمی کو علم حاصل کر کے اور اچھے اخلاق اوراوصاف اپنے اندر پیدا کر کے پورا کرسکتا ہوں۔

ظاہری بدصورتی کی تلافی

آدمی میں دو چیزیں ہیں ایک تو باطنی اوصاف واخلاق اوردوسری چیز ظاہری خوبصورتی۔تو ظاہری خوبصورتی کسی کام کی نہیں، ویسے اس کی وجہ سے دنیوی اعتبار سے کہیں بڑا فائدہ ہوسکتا ہے لیکن اخروی اعتبار سے اس پر نجات نہیں۔ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ بہت سے کافر ومشرک بھی بڑے حسین وجمیل ہوا کرتے ہیں۔لیکن آدمی کو چاہیے کہ اپنے اندر باطنی اخلاق، باطنی اوصاف پیدا کرنے کا اہتمام کرے۔لہٰذا جولوگ ایسے ہیں کہ جن کو قدرت کی طرف سے ایسا کوئی ظاہری حسن نہیں دیا گیا ہے ان کے لئے تو اور زیادہ

موقع ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان باطنی اوصاف اور اچھے اخلاق سے اور عملی اعتبار سے بھی مزین کرنے کی کوشش کریں تا کہ یہ ساری کمی پوری ہوجائے۔ چنانچہ حضرت عطاءؒ اپنے زمانے میں اہلِ مکہ کے سردار کہلاتے تھے، حالانکہ وہ سیاہ فام آزادشدہ غلام تھے لیکن وہ اپنے اس علم اور عمل، اخلاق اور اوصاف کی وجہ سے اہلِ مکہ کے سردار تھے۔

ایک صحابیہ سے مرگی میں صبر کرنے پر جنت کا وعدہ

حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا: میں ایک جنتی عورت تمہیں نہ بتلاؤں؟ میں نے کہا: ضرور بتلایئے، انہوں نے ایک سیاہ فام، کالے رنگ کی حبشی عورت کی طرف اشارہ کرکے بتلایا کہ یہ جنتی عورت ہے۔ وہ کیوں جنتی ہے اس کی وجہ بتلائی کہ ایک مرتبہ یہ عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آکر عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے مرگی کی بیماری ہے۔ ''مرگی'' وہ مرض ہے کہ جس میں آدمی پر ایک دم سے دورہ پڑتا ہے، اور آدمی بے ہوش ہوجاتا ہے، منہ میں سے جھاگ نکلنے لگتی ہے۔ یہ بیماری اس عورت کو تھی۔ اور اس نے بتلایا کہ جس وقت مجھ پر یہ دورہ پڑتا ہے اور میں بے ہوش ہوکر کے گر جاتی ہوں تو میرا ستر بھی کھل جاتا ہے۔ اصل اس عورت کو یہ فکر لاحق تھا کہ اس بیماری کے نتیجے میں گویا غیر اختیاری طور پر ایک بری چیز میں مبتلا ہوجاتی ہوں کہ میرا ستر کھل جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کرنے کا مقصد یہ تھا کہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کریں تا کہ اس بیماری سے اللہ تعالیٰ نجات عطا فرمائیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دیکھو! تمہیں اختیار ہے اگر تم چاہو تو اس بیماری پر صبر سے کام لو، اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو جنت ملے گی، اور اگر تم چاہو تو میں

دعا کردیتا ہوں اور بیماری اچھی ہوجائے گی۔ بولو کیا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ ایک صحابیہ تھیں، ان کے سامنے جب یہ دونوں صورتیں آئیں تو آخر کس کو اختیار کرتیں؟ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں صبر سے کام لوں گی۔

بس! یہاں بھی ایک تعلیم یہی دی کہ اگر کسی آدمی کو کوئی خطرناک سے خطرناک بیماری لاحق ہے تو اس کی وجہ سے دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یوں سمجھے کہ یہ بیماری اللہ تبارک وتعالیٰ نے دی ہے اس پر میں صبر کروں گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے اس صبر کے بدلے میں جنت ملے گی۔ اس حدیث میں حضور ﷺ کی تعلیم یہی ہے۔

اس لئے کیسی ہی بیماری ہو اس میں صبر کرے، ویسے اس بیماری کے علاج کے طور پر کچھ تدبیریں کرنا چاہے تو کرسکتا ہے لیکن ان تدبیروں کے باوجود اگر اس بیماری میں کوئی فرق ظاہر نہ ہو، بیماری ٹھیک نہ ہو تو پھر اس کی وجہ سے لوگوں کے سامنے شکوے شکایات یا پریشان اور دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صبر سے کام لے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیماری بھیجی ہے میں اس پر صبر کروں گا۔

چنانچہ جب نبی کریم ﷺ نے اس عورت کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار دیا تو کہنے لگی کہ میں صبر کروں گی۔ گویا مجھے اس بیماری کے اچھا ہونے کے مقابلہ میں صبر کر کے جنت لینا منظور ہے۔ باقی یہ ہے کہ آدمی اپنی کمزوری کی وجہ سے برداشت نہ کرسکے؛ تو وہ دوسری بات ہے۔

ایک بیمار حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں

حضرت سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے سلسلے کے تمام

بزرگوں کے شیخ ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنی مجلس میں بیماری کے سلسلے میں ذرا تفصیل سے بیان کیا اور فرمایا کہ بیماری بھی اللہ کی نعمت ہے اور پھر اس بیماری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عنایتیں کس کس حیثیت سے آدمی پر آتی ہیں وہ پورا تفصیل سے بتلایا۔ اس مجلس کے بعد ایک آدمی نے آکر عرض کیا: حضرت! مجھے فلانی بیماری ہے، دعا کیجئے۔ لوگ سوچنے لگے کہ ابھی تو انھوں نے پورا بیان کیا تھا اب دیکھیں کیا دعا کرتے ہیں؟ حضرت نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! بیماری بھی تیری نعمت ہے اور تندرستی بھی نعمت ہے، تو اپنی اس بیماری والی نعمت کو تندرستی والی نعمت سے بدل دے۔ اے اللہ! ہم کمزور ہونے کی وجہ سے اس پر صبر کی طاقت نہیں رکھتے تو اب ہمیں تندرستی والی نعمت عطا فرما کر اس پر شکر کرنے کی توفیق عطا فرما۔

بہر حال! اس عورت نے یہ منظور کرلیا کہ میں صبر کروں گی لیکن اس بے ہوشی کی حالت میں چونکہ ستر کھل جاتا تھا اس کا بھی اس عورت کو فکر لاحق تھا اس لئے اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ میرا ستر نہ کھلے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس کے لئے دعا کروں گا کہ اے اللہ! اس کے ستر کے کھلنے کی نوبت نہ آئے، جب بیماری کا دورہ پڑے، بے ہوش ہو تو اس وقت ستر نہ کھلے۔ بہر حال! اس نے اس بیماری سے اچھا ہونے کے مقابلہ میں بیماری میں مبتلا رہ کر صبر سے کام لے کر جنت کو منظور فرمالیا۔

علاج کے سلسلہ میں ایک ہدایت

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اس حدیث سے بھی یہی سبق دینا مقصود ہے کہ کیسی ہی خطرناک سے خطرناک بیماری آدمی کو لاحق ہو اس پر آدمی صبر سے کام لے، اپنے طور پر جو تدبیریں ہو سکتی ہیں ان تدبیروں کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ویسے آج کل جو تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں اس میں بھی بڑے غلو سے کام لیا جاتا ہے۔ دیکھو! نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿یا عباداللہ تداووا. (سنن ترمذی ۴/۳۸۳)﴾ اے اللہ کے بندو! دوا اور علاج کرو، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر بیماری کی دوا ضرور پیدا فرمائی ہے لیکن اس کے معاملہ میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ شفا دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اگر کوئی آدمی یوں سمجھتا ہے کہ تندرستی دوا کی وجہ سے یا ڈاکٹر کی وجہ سے ہے؛ تو یہ غلط ہے۔ جیسے لوگ کہتے ہیں کہ فلاں ڈاکٹر کے پاس فلاں فلاں گئے تو وہ سب اچھے ہوگئے، گویا آپ بھی جائیں گے تو آپ کو بھی وہ اچھا کر ہی ڈالے گا۔ اور میں یوں کہا کرتا ہوں کہ بڑے ماہر ڈاکٹر کے مقابلے میں کم ماہر ڈاکٹر کے پاس جانے میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد زیادہ رہے گا، بڑے ماہر کے پاس جانے میں اعتماد اس پر ہوجائے گا اور کم ماہر کے پاس جائیں گے تو اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس ڈاکٹر کے مقابلے میں زیادہ رہے گا۔ اور علاج بحیثیت سنت کے جو کر رہے ہیں؛ وہ مقصد بھی حاصل ہوجائے گا۔

خیر! یہ تو میں اپنی ایک بات بطور نکتہ کے عرض کرتا ہوں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ماہرین کو آپ چھوڑ دیں، ماہرین سے ضرور خدمات حاصل کریں۔ ڈاکٹر صاحب یہاں بیٹھے ہوں گے تو کہیں گے کہ بھائی کیا ہے؟ بہرحال! ماہرین سے آپ ضرور خدمات لیں، لیکن یہ ہے کہ ہمارا ایمان اور اعتماد اللہ کی ذات پر ہو۔

﴿توکل کی حقیقت کیا ہے؟﴾

توکل کس کو کہتے ہیں؟ توکل کی حقیقت یہ ہے کہ اسباب اختیار کرنے کے بعد اسباب پر بھروسہ کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرے؛ اس کا نام ''توکل''

ہے۔ اسباب کو چھوڑ دینا؛ یہ کامل توکل نہیں ہے۔ جس آدمی نے سبب اختیار نہیں کیا وہ تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے گا ہی۔ لیکن جس آدمی نے سبب اختیار کیا اور پھر سبب کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا، یہی حقیقی توکل ہے۔

اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے پوچھا: یارسول اللہ! میں اپنی سواری کے اونٹ کو کھونٹے سے باندھوں پھر توکل کروں یا کھلا چھوڑ دوں اور توکل کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: باندھو اور توکل کرو (مجمع الزوائد، طبرانی ۱۰/۲۹۱، سنن ترمذی ۴/۶۶۸) یعنی باندھنے کے بعد بھی بھروسہ اس پر نہ ہو کہ اس سے میرا اونٹ محفوظ رہے گا، بھروسہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر ہو، یہ اعلیٰ درجہ کا توکل ہے۔ اسباب کو انجام دینے کے بعد بھی اعتماد اسباب پر نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو تو یہ اصل چیز ہے۔ ہر جگہ اسباب کے اندر اس کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔

﴿ایک نبی کے صبر کا انداز﴾

عن أبی عبدالرحمن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قَالَ: كَأَنِّيْ أَنْظُرُ اِلیٰ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ يَحْكِيْ نَبِيّاً مِنَ الْأَنْبِيَاءِ صَلَوَاتُ اللّٰہِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِمْ ۔ضَرَبَهُ قَوْمُهُ فَأَدْمَوْهُ وَهُوَ يَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَجْهِهٖ. يَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں گویا نبی کریم ﷺ کو دیکھ رہا ہوں یعنی جس وقت وہ حدیث بیان کر رہے ہیں گویا یوں بتلانا چاہتے ہیں کہ اس وقت بھی میری نگاہوں میں وہ منظر ایک دم تازہ ہے۔ جیسے کوئی واقعہ کئی سال پہلے پیش آیا ہو لیکن بیان کرنے والا کہتا ہے کہ ابھی میری نگاہوں کے سامنے وہ منظر ہے۔ گویا اس سے یہ بتانا مقصود

ہوتا ہے کہ مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے۔ اسی طرح فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک نبی کا تذکرہ کررہے تھے کہ ان کی قوم نے ان کی پٹائی کی اور ان کے چہرے کو زخمی کردیا، اور وہ نبی اپنے چہرے پر سے اپنے ہاتھوں کے ذریعہ سے خون پونچھ رہے تھے، صاف کررہے تھے اور کہتے جارہے تھے ﴿اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِقَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لاَیَعْلَمُوْنَ ﴾ اے اللہ! میری قوم کو بخش دیجئے، معاف کردیجئے؛ وہ مجھے پہچانتے نہیں ہیں اور جانتے نہیں کہ میرا کیا مقام ہے، میرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا تعلق ہے، مَیں کون ہوں، اگر جانتے تو ایسا معاملہ نہ کرتے۔ یہاں نبی کریم ﷺ نے اس نبی کے صبر کا تذکرہ کیا چونکہ نبی کے افعال قابلِ اتباع ہوتے ہیں، اس لئے یہ روایت یہاں لائے ہیں۔

اب یہ کون سے نبی مراد ہیں؟ تو علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مصداق حضرت نوح علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ اور دوسرے حضرات فرماتے ہیں: کہ نہیں! یہ خود نبی کریم ﷺ اپنی ذات مراد لے رہے ہیں۔ سفرِ طائف کے موقع پر نبی کریم ﷺ کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا تھا آپ دعوت پیش کرنے کے واسطے طائف تشریف لے گئے تھے اور وہاں آپ کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئیں اور آپ کو لہولہان کیا گیا اس موقع پر آپ نے یہ دعا فرمائی تھی ﴿اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِقَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لاَیَعْلَمُوْنَ ﴾ اے اللہ! یہ مجھے جانتے نہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ غزوۂ احد کے موقع پر نبی کریم ﷺ کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئیں تھیں اس موقع پر بھی آپ نے یہ دعا فرمائی تھی۔

﴿ مؤمن کو پہنچنے والی معمولی تکلیف بھی ضائع نہیں ﴾

عن أبی سعید رضی اللہ عنہ و أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: مَایُصِیْبُ الْمُسْلِمَ مِنْ

نَصَبٍ وَلَاوَصَبٍ وَلَاهَمٍّ وَلَاحَزَنٍ وَلَاأَذىً وَلَاغَمٍّ حَتّٰى الشَّوْكَةُ يُشَاكُهَا اِلَّا كَفَّرَاللّٰهُ بِهَامِنْ خَطَايَاهُ.

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مسلمان کو جب کوئی تھکن پہنچتی ہے یعنی کسی کام کے نتیجے میں جو تھکاوٹ لاحق ہوتی ہے یا کوئی بیماری اس کو لگتی ہے اور اسی طریقہ سے کوئی فکر لاحق ہوتی ہے، آئندہ پیش آنے والی کسی مصیبت کے تصور سے آدمی کو جو فکر لاحق ہوتی ہے؛ اس کو (ھَمٌّ) کہتے ہیں اور جو مصیبت پہلے پیش آچکی ہے اس پیش آچکی ہوئی مصیبت کی وجہ سے جو تکلیف ہوتی ہے اس کو (حُزْن) سے تعبیر کرتے ہیں۔

اور جو کوئی ایذاء پہنچتی ہے، اور مؤمن کسی بھی طرح کی گھٹن محسوس کرتا ہے یہاں تک کہ کانٹا بھی اس کو چبھتا ہے تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ کردیتے ہیں اور گناہوں کو معاف کردیتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ مومن کو معمولی سی تکلیف بھی اگر پہنچے تو وہ ضائع نہیں جاتی ہے، اس کو پہنچنے والی ہر تکلیف کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے گناہوں کو معاف کیا جاتا ہے، اس لئے ہمیں جو چھوٹی چھوٹی تکلیفیں پہنچیں، ان پر بھی یہ خیال مستحضر ہونا چاہیے اور اس چیز کا ہر وقت تصور رہنا چاہیے کہ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے میرے گناہ معاف کئے جائیں گے۔

بلکہ حدیث میں یہاں تک آتا ہے کہ آدمی کے جیب میں پیسے اور رقم ہے، اور وہ اس نے خرچ کردئے، کسی کو دے دیے، بعد میں کسی موقع پر اس کو یاد نہیں تھا کہ میں فلاں کو یہ رقم دے چکا ہوں، وہ اس کو دے کر بھول گیا تھا، اور اب یوں سوچ کر کہ میرے پاس ہیں

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن جب وہ رقم نظر نہیں آئی تو ایک دم سے اس کی طبیعت کے اوپر ایک غم آ گیا کہ پیسے تھے، کہاں گئے؟ تھوڑی دیر بعد پھر یاد آ گیا کہ میں تو فلاں کو دے چکا ہوں، تو یہ یاد نہ رہنے کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے جو غم لاحق ہوا تھا؛ اس پر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو اجر وثواب ملتا ہے اور اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں

اس لئے جتنی بھی مصیبتیں، تکلیفیں اور مشقتیں یا بیماریاں جو کچھ بھی ہمیں لاحق ہوں ہم یہ سمجھیں کہ اس میں ہمارا فائدہ ہی فائدہ ہے، اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ بس! یہ تصور ہمیں ہر وقت رہنا چاہیے، جب یہ تصور اور خیال رہے گا تو ان شاء اللہ صبر کرنا بڑا آسان ہو جائے گا۔ ان چیزوں کو سوچتے رہیں۔

﴿خاص بندوں کے ساتھ خاص معاملہ ہوتا ہے﴾

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: دَخَلْتُ عَلٰی النَّبِیِّ ﷺ وَهُوَ يُوْعَکُ. فقلتُ: یارسولَ اللہ! اِنَّکَ تُوْعَکُ وَعُکاً شَدِیْداً. قَالَ: أَجَلْ اِنِّیْ أُوْعَکُ کَمَا یُوْعَکُ رَجُلانِ مِنْکُمْ. فقلتُ: ذٰلِکَ اَنَّ لَکَ أَجْرَیْنِ؟ قَالَ: أَجَلْ ذٰلِکَ کَذٰلِکَ مَامِنْ مُسْلِمٍ یُصِیْبُهٗ أَذًی شَوْکَةٌ فَمَافَوْقَهَا اِلَّا کَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا سَیِّئَاتِهٖ وَحُطَّتْ عَنْهُ ذُنُوْبُهٗ کَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو بہت سخت اور شدید بخار تھا۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کو تو بہت سخت اور بڑا شدید بخار ہے۔ بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ وہ اتنا شدید بخار تھا کہ نبی کریم ﷺ جو چادر اوڑھے ہوئے تھے اس کے اوپر سے بخار کی گرمی محسوس

ہورہی تھی۔تو حضور ﷺ نے فرمایا: جی ہاں! مجھے بخار کی اتنی شدت آتی ہے جتنی تم میں سے دوآدمیوں کو بخار میں ہوتی ہے۔یعنی عام انسانوں میں سے دوآدمیوں کے بخار کا جو حال ہوتا ہے مجھ اکیلے کو ایسا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے جو مخصوص بندے ہوتے ہیں ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے ﴿اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ بَلَآءً الْاَنْبِيَآءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ﴾ حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں میں سب سے زیادہ آزمائش ،ابتلاء اور مصائب انبیاء کرام پر آتے ہیں،اور پھر جو ان کے طریقے سے زیادہ مشابہ ہوگا اتنا ہی اس کے اوپر یہ کیفیات زیادہ رہیں گی۔اس لئے بخار کا بھی یہی حال ہے کہ اوروں میں جو بخار دو آدمیوں کو آتا تھا ایسا بخار تنہا حضور ﷺ کو آتا تھا۔اس پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! یہ بات اس لئے بھی ہے کہ آپ کو ثواب بھی دوہرا اور ڈبل ملتا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: جی ہاں! ثواب بھی ڈبل ملتا ہے یعنی اورلوگوں کو جتنا ثواب ملتا ہے اس سے زیادہ ملتا ہے۔

اسی لئے تو حدیث میں آتا ہے کہ آدمی اگر کھڑے ہوکر نماز پڑھے تو اس میں جو ثواب ملتا ہے بیٹھ کر پڑھنے میں اس سے آدھا ملتا ہے (بخاری ۱/۳۷۵) لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: مَیں بیٹھ کر پڑھوں گا تو آدھا نہیں بلکہ پورا ثواب ملے گا۔بات وہی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر چہ بخار کی شدت آپ کو اورلوگوں کے مقابلے میں دوہری اور ڈبل ہے تو ثواب بھی تو آپ کو ڈبل مل رہا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: جی ہاں۔

﴿تکلیف پہنچنے پر آدمی کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے پت جھڑ میں پتے﴾

پھر حضور ﷺ نے فرمایا: دیکھو! کسی مسلمان کو جب کوئی بیماری لاحق ہوتی ہے، کوئی تکلیف پہنچتی ہے یہاں تک کہ کانٹا بھی چبھتا ہے یا اس سے بھی کم درجہ کی کوئی چیز ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے گناہوں کو معاف کر دیتے ہیں اور اس کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے پت جھڑ کے زمانے میں، موسمِ خزاں میں درخت اپنے پتوں کو جھاڑتا ہے یعنی موسمِ خزاں میں، پان کھر (પાનખર) کا جو موسم ہوتا ہے اس میں درخت کے پتے کیسے جھڑتے ہیں، اسی طرح بیماری کی وجہ سے آدمی کے گناہ جھڑتے ہیں۔

حدیث پاک میں بھی آتا ہے کہ بخار کی وجہ سے آدمی گناہوں سے ایسا پاک اور صاف ہو جاتا ہے جیسے اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا ہو۔ اور یہ بخار کے اندر جو حرارت ہوتی ہے بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہنم کی آگ کی حرارت کا اثر ہے۔ (صحیح مسلم ۴/۱۷۳۱) گویا اس کا نمونہ ہے، تو اندر تک اس کے اثرات پہنچتے ہیں۔

﴿مقربین پر حالات کیوں آتے ہیں؟﴾

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: مَن يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيرًا يُّصِبْ مِنهُ

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو مصیبت میں گرفتار کرتے ہیں۔

اب دیکھئے! بعض مرتبہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے بعض ایسے مقرب بندے بھی ہوتے ہیں جن کے متعلق آدمی کو یہ خیال ہوتا ہے ان کے پاس تو گناہوں کا زیادہ ذخیرہ نہیں ہے؛ پھر وہ بیماری ان کے پاس کاہے کے واسطے آئی؟

جواب یہ ہے کہ اصل میں ان کے پاس دوسری حیثیت سے آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرنا چاہتے ہیں۔اسی لئے حدیث پاک میں آتا ہے مشکوٰۃ شریف میں روایت موجود ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کسی بندے کے لئے جنت میں ایک درجہ متعین کیا گیا ہے کہ یہ درجہ اس کو دینا ہے، لیکن وہ بندہ اپنے عمل کے ذریعہ سے وہاں تک پہنچ نہیں سکتا، اس کے پاس ایسا کوئی عمل نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے وہ اس درجہ تک پہنچ پاوے، تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو مصیبت میں گرفتار کرتے ہیں اور پھر اس کو صبر کی توفیق عطا فرماتے ہیں اور جب وہ صبر کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ مقام اس کو عطا کیا جاتا ہے۔ (ابوداؤد ۳/۱۸۳) اللہ تعالیٰ کا کیسا معاملہ ہے۔اس لئے اگر کسی کے اوپر کوئی مصیبت آئی ہے یا کسی تکلیف میں کوئی آدمی گرفتار ہے، تو پریشان نہ ہو، یہ نہ سوچے کہ معلوم نہیں کون سے گناہ کی سزا ہے۔

﴿ہمارا وجود ہی گناہ ہے﴾

بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ تو حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: ہمارا کون سا لمحہ اور کون سی گھڑی گناہوں سے خالی ہے کہ یہ جملہ منہ سے نکل رہا ہے کہ مَیں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ بلکہ ﴿وُجُوْدُکَ ذَنْبٌ لاَیُقَاسُ بِهٖ ذَنْبٌ﴾ ہمارا وجود ہی گناہ ہے۔ ہے یا نہیں؟ اس لئے یہ جملہ تو بہت غلط ہے کہ میں نے کون سا گناہ کیا ہے۔ باقی یہ ہے کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگنی چاہیے۔

اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ گناہ کی وجہ سے کوئی مصیبت آئی ہو، مصیبت کبھی گناہ کے بغیر کسی اور مصلحت سے بھی آتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو کسی خیر سے نوازنا چاہتے

ہیں، بڑی خیر عطا فرمانا چاہتے ہیں تو اس کی وجہ سے بھی مصیبت میں اس کو مبتلا کیا جاتا ہے بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ اس بندے کو بھی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ یہ فلانی مصیبت آئی تھی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس نعمت سے نوازا۔بعض دفعہ بعض لوگوں کو اس کا خاص احساس ہوتا ہے۔اس لئے کسی مصیبت کے آنے پر پریشان نہ ہو، بلکہ یوں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے میرے درجہ کو بلند کرنا چاہتے ہیں یا میرے گناہوں کو معاف کرنا چاہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ مصیبت کبھی گناہوں کی معافی کا ذریعہ بنتی ہے اور کبھی درجات کی بلندی کا ذریعہ بنتی ہے ۔جیسا جیسا آدمی ویسا ویسا اس کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے معاملہ کیا جاتا ہے۔گنہگار پر اگر آئی تو اس کے ذریعہ سے گناہ معاف ہوں گے۔کسی مقرب کے پاس آئی تو اس کے ذریعہ سے اس کے درجات بلند ہوں گے۔

﴿مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا مت کرو﴾

عن أنس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لَايَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ لِضُرٍّ أَصَابَهُ .فَاِنْ كَانَ لَابُدَّ فَاعِلاً.فَلْيَقُلْ: أَللّٰهُمَّ أَحْيِنِىْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْراً لِىْ وَتَوَفَّنِىْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْراً لِىْ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی موت کی تمنا نہ کرے کسی تکلیف کی وجہ سے جو اس کو پہنچی۔

بعض مرتبہ بعض لوگوں کو بیماری لاحق ہو جاتی ہے اور وہ بیماری طول پکڑ جاتی ہے، جلدی اچھی نہیں ہو رہی ہے تو وہ موت کی تمنا کرتے ہیں۔یا کوئی خطرناک بیماری لاحق ہو جاتی ہے تو اُس پر موت کی تمنا کرتے ہیں۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کسی بیماری کے لگنے

پر موت کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔

دیکھو! موت کی تمنا کرنے سے موت آجانے والی نہیں ہے۔ ہمارا آپ کا سب کا ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے، نہ اس سے پہلے آسکتی ہے نہ اس کے بعد۔ تو اگر اس بیماری کی وجہ سے تمنا کر بھی لی؛ تو اس سے کیا حاصل ہوا۔ موت تو اپنے وقت پر ہی آئے گی۔ اسی لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ کسی بیماری کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے۔ یہ تو بے صبری کی علامت ہے۔ حق تعالیٰ کے فیصلے پر ایک طرح کی ناراضگی کا اظہار ہے اور یہ بڑی بری بات ہے۔

﴿فَاِنْ كَانَ لَابُدَّ فَاعِلاً﴾ ہاں اگر کرنا ہی ہے یعنی کسی آدمی کو بہت تکلیف ہے اور اس کی وجہ سے بے چین ہے اور موت کی دعا کرنا ہی چاہتا ہے تو پھر یوں دعا کرے:

﴿اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْراً لِيْ وَتَوَفَّنِيْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْراً لِيْ﴾

اے اللہ! جب تک میرے لئے زندگی میں بہتری ہے؛ مجھے زندہ رکھ۔ اور جب میرے لئے موت بہتر ہو؛ مجھے موت عطا فرما۔ اگر موت کی دعا کرنی ہی ہے تو اس طرح کرے۔ یوں نہ کرے کہ اے اللہ! مجھے اٹھالے۔ بلکہ اس طرح کرے کہ اے اللہ! میرے لئے زندگی میں اگر خیر ہے تو مجھے زندہ رکھ اور اگر میرے لئے موت میں سلامتی اور خیر ہے تو مجھے موت دے دے۔ یوں دعا کر سکتے ہیں۔

﴿موت کی تمنا کرنے کی اجازت صرف ایک صورت میں﴾

ویسے علماء نے لکھا ہے کہ اگر دینی فتنے کا اندیشہ ہو یعنی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ اس آدمی کو خطرہ لاحق ہو کہ میں دینی فتنے میں مبتلا ہوؤں گا، میرے ایمان پر زد پڑے گی

تو اس صورت میں اگر وہ اپنے آپ کو اس دینی فتنے سے بچانے کے لئے موت کی تمنا کرے اور یہ دعا کرے کہ اے اللہ! میرے ایمان پر کوئی زد آئے اس سے پہلے پہلے مجھے دنیا سے اٹھا لے؛ تو اس کی گنجائش اور اجازت ہے۔(السنن الواردۃ فی الفتن) باقی اس کے علاوہ بیماری کی تکلیف سے پریشان ہوکر یا بیماری کی وجہ سے دل گرفتہ ہوکر موت کے مانگنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔۔

صبر
مجلس ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً ۔اما بعد ۔

حالات کی سختی پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی شکایت اور آپ علیہ السلام کی تنبیہ

عن أبی عبداللہ خباب بن الأرت رضی اللہ عنہ قال: شَکَوْنَا اِلٰی رسولِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم وَھُوَ مُتَوَسِّدٌبُرْدَۃًلَّہٗ فِیْ ظِلِّ الْکَعْبَۃِ. فَقُلْنَا: أَلَاتَسْتَنْصِرُلَنَا؟أَلَاتَدْعُوْلَنَا ؟فقَالَ: قَدْکَانَ مَنْ قَبْلَکُمْ یُؤْخَذُالرَّجُلُ فَیُحْفَرُلَہٗ فِی الْأَرْضِ فَیُجْعَلُ فِیْھَا.ثُمَّ یُؤْتیٰ بِالْمِنْشَارِفَیُوْضَعُ عَلٰی رَأْسِہٖ فَیُجْعَلُ نِصْفَیْنِ.وَیُمْشَطُ بِأَمْشَاطِ الْحَدِیْدِ مَادُوْنَ لَحْمِہٖ وَعَظْمِہٖ مَایَصُدُّہٗ ذٰلِکَ عَنْ دِیْنِہٖ.وَاللّٰہِ لَیُتِمَّنَّ اللّٰہُ ھٰذَا الْأَمْرَحَتّٰی یَسِیْرَالرَّاکِبُ مِنْ صَنْعَآءَ اِلٰی حَضْرَمَوْتَ. لَایَخَافُ اِلَّا اللّٰہَ.وَالذِّئْبَ عَلٰی غَنَمِہٖ. وَلٰکِنَّکُمْ تَسْتَعْجِلُوْنَ.

یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ مسلمان جب تک مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ نہیں گئے تھے اور مکہ والوں کی طرف سے ان پر بہت زیادتیاں، ایذا رسانیاں اور تکلیف دہی ہوا کرتی تھی تو حضرت خباب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مکہ والوں کی یہ ایذا رسانیاں جب انتہا کو پہنچ گئیں تو اس سے عاجز آ کر ایک مرتبہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، جس وقت ہم اپنی بات پیش کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت

آپ کعبۃ اللہ شریف کے سائے میں چادر سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب نہیں کرتے اور ہمارے واسطے دعانہیں کرتے؟ یہ کفار کی طرف سے ایذا رسانیاں حد سے تجاوز کر گئیں اب تو ضرورت ہے اس بات کی کہ آپ اللہ تعالیٰ سے مدد چاہیں تا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے شاملِ حال ہو اور ان کی ایذا رسانیوں سے ہم نجات پائیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے۔گویا ان کا صبر اب انتہاء کو پہنچ چکا تھا۔

اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم پر ان کفار کی طرف سے ایذاؤں کا یہ سلسلہ ہے اس کی وجہ سے اتنی جلدی تم تنگ آ گئے اور تمہارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا؟ حالانکہ تم سے پہلی امتوں میں صورتِ حال یہ تھی کہ اگر کوئی آدمی ایمان لاتا تھا تو اس کو نبی کے نہ ماننے والے کفار کی طرف سے جو ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایمان لانے والے کو پکڑ کر لاتے تھے اور زمین میں ایک گڑھا کھود کر اس میں اس کو کھڑا کر کے مٹی پاٹ دیتے تھے، آدھا بدن زمین میں رہتا اور آدھا بدن باہر ہوتا، اس کے بعد آرہ لایا جاتا تھا اور اس کے سر پر رکھ کر اس کے جسم کو چیر کر دو ٹکڑے کر دئے جاتے۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ لوہے کے دانتوں والے کنگھے لا کر اس کے جسم کے اوپر چلائے جاتے جس کے نتیجے میں ہڈی ہڈی رہ جاتی تھی اور کھال اور گوشت اتر جاتا تھا۔ گویا انتہا درجے کی تکلیف ان کو پہنچائی جاتی تھی۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں: اس کے باوجود وہ لوگ اپنے ایمان سے باز نہیں آتے تھے۔یعنی اتنی زیادہ ان کو ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں اور اتنی سخت تکلیفیں دی جاتی تھیں اور

ان تکلیف دینے والوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ جو ایمان لائے ہیں اس سے ہٹ جائیں لیکن اتنی تکلیفوں کے باوجود وہ لوگ اپنے ایمان سے ہٹتے نہیں تھے، اتنے مضبوط اور ثابت قدم ہوا کرتے تھے۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں: تم لوگ صبر سے کام لو جب اہلِ ایمان کی طرف سے مخالفین کی ایذا رسانیوں پر صبر کا مظاہرہ کیا جاتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہدایت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس لئے فرمایا: خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ دین کے معاملے کو تکمیل تک پہنچائے گا، یعنی دین کو مکمل کر کے رہے گا یہاں تک کہ اس کے نتیجے میں دنیا میں جو امن وامان قائم ہوگا، اس کا اثر یہ ہوگا کہ ایک سوار صنعاء سے لے کر حضر موت تک سفر کرے گا، اور راستے میں اس کو اپنی جان و مال کے متعلق کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

''صنعاء'' یہ یمن کا ایک بڑا شہر ہے اور حضر موت بھی یمن ہی کا ایک شہر ہے، لیکن بڑی دوری پر دوسرے کنارے پر واقع ہے۔ اس لئے کہ جس وقت حضور ﷺ یہ بات ارشاد فرما رہے تھے اس وقت حالت یہ تھی کہ کوئی بھی مسافر جب اپنے سفر پر نکلتا تھا تو اپنی جان و مال کے متعلق اطمینان نہیں ہوتا تھا بلکہ تنہا آدمی کبھی سفر کرنے کی جرأت ہی نہیں کرتا تھا۔ اس زمانے میں جب کوئی سفر کرنا ہوتا تھا تو قافلوں کی شکل میں کرتے تھے، تنہا آدمی تو نکلا کہ فوراً لُوٹ لیا جاتا تھا اور قافلوں کے متعلق یہ خطرے غالب رہتے تھے کہ معلوم نہیں یہ واپس آتا ہے یا نہیں۔

''قافلہ'' یہ عربی کا لفظ ہے، نیک فالی کے طور پر اس کا نام قافلہ رکھا گیا ہے۔ اہل عرب کے یہاں جو نام رکھے جاتے تھے تو اس میں نیک فالی کا اہتمام ہوتا تھا یعنی کوئی

اچھا مطلب لینا۔ عربی زبان میں ''قَفَلَ يَقْفُلُ '' کا معنٰی ہے لوٹنا۔ تو قافلہ کہتے ہیں کہ لوٹ کر واپس آنے والا۔ تو جب یہ جماعت سفر میں جاتی تھی تب ہی سے اس کا نام قافلہ رکھا گیا گویا اللہ تعالیٰ سے اس بات کی امید کی جارہی ہے کہ یہ جاوے اور صحیح سلامت واپس آوے اسی لئے اس کا نام قافلہ رکھا جاتا تھا۔

جیسے جس آدمی کو سانپ ڈس لے اس کو عربی میں سلیم کہتے ہیں، حالانکہ ''سلیم'' تو اس کو کہتے ہیں کہ جو سلامت اور محفوظ رہے، چونکہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جس کو سانپ نے ڈس لیا ہو؛ وہ بچتا نہیں ہے، مرجاتا ہے۔ تو اہل عرب نے اس کے لئے نام لفظِ سلیم وضع کیا۔ کسی کو سانپ نے ڈسا اور لوگ پوچھیں کہ بھائی! کیا ہوا؟ تو کہتے ہیں ﴿ هُوَ سَلِيْمٌ ﴾ تاکہ کسی کی زبان سے یہ جملہ نکلے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوجائے اور وہ بچ جائے۔ لہٰذا بہت سے ناموں میں ان لوگوں کے یہاں ایسا ہوتا ہے۔

تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ بڑے بڑے قافلے اور بڑی بڑی جماعتیں بھی جب سفر میں جاتی تھیں تو ان کے متعلق بھی یہ نام اس لئے تجویز کیا گیا کہ ان کی واپسی بھی خطرے میں ہوا کرتی تھی کہ پورا قافلہ واپس سلامتی کے ساتھ آتا بھی ہے یا نہیں۔ کبھی تو پورے قافلے پر شب خون مارا جاتا تھا اور سب ہی لوٹ لئے جاتے تھے۔ بہت سے مارے جاتے تھے، بچے اور عورتوں کو گرفتار کرکے غلام اور باندی بنالیا جاتا تھا، اس لئے اِکّا دُکّا آدمی کے سفر کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر تم لوگوں نے صبر سے کام لیا تو خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ دین کے اس سلسلے کو مکمل کرے گا اور اس کے نتیجے میں دنیا میں امن وامان قائم ہوگا اور اس

کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تنہا ایک مسافر صنعاء سے حضر موت تک بڑے اطمینان سے بغیر خطرے کے جائے گا اور اس کو اپنی جان اور مال کے متعلق کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ بلکہ بعض روایتوں میں تو یہ آتا ہے کہ ایک عورت سفر کرے گی اور اس کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ البتہ یہ ہے کہ اس کو اپنی بکریوں کے متعلق بھیڑیے کا تو ڈر لگا رہے گا لیکن کسی انسان سے اس کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ لیکن تم لوگ بہت جلدی سے کام لے رہے ہو۔

گویا نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام کو صبر کی تلقین فرمائی کہ ان کفار کی طرف سے تم کو جو ایذائیں اور تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں ان میں کوئی عجلت اور جلد بازی سے کام لینے کی ضرورت نہیں، تم آکر مجھ سے جو درخواست کرتے ہو کہ اے اللہ کے رسول! آپ اللہ تعالیٰ سے مدد نہیں مانگتے، دعا نہیں کرتے؟ ایسی عجلت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایذائیں سہتے رہو، تکلیفیں برداشت کرتے رہو۔ اللہ کے راستہ میں جو ایذائیں پہنچائی جائیں گی اور تکلیفیں سہی جائیں گی تو اس کے نتیجے میں ہدایت عام ہوگی، اور اس کا فائدہ پورے عالم کو پہنچے گا۔

حضور ﷺ کا سبق آموز طرزِ عمل

وعن بن مسعود رضی اللہ عنہ قَالَ: لَمَّا كَانَ يَوْمُ حُنَيْنٍ. اٰثَرَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ نَاسًا فِي الْقِسْمَةِ. فَأَعْطَى الْأَقْرَعَ بْنَ حَابِسٍ مِائَةً مِنَ الْاِبِلِ. وَأَعْطَى عُيَيْنَةَ بْنَ حِصْنٍ مِثْلَ ذٰلِكَ. وَأَعْطَى نَاسًا مِنْ أَشْرَافِ الْعَرَبِ، وَاٰثَرَهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْقِسْمَةِ. فَقَالَ رَجُلٌ: وَاللهِ اِنَّ هٰذِهٖ قِسْمَةٌ مَا عُدِلَ فِيْهَا. وَمَا أُرِيْدَ فِيْهَا وَجْهُ اللهِ. فَقُلْتُ: وَاللهِ لَاُخْبِرَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ. فَأَتَيْتُهُ فَأَخْبَرْتُهُ بِمَا قَالَ. فَتَغَيَّرَ وَجْهُهُ حَتّٰى كَانَ كَالصِّرْفِ. ثُمَّ قَالَ: فَمَنْ يَعْدِلُ اِذَا لَمْ يَعْدِلِ اللهُ وَرَسُوْلُهُ. ثُمَّ قَالَ: يَرْحَمُ اللهُ مُوْسٰى قَدْ أُوْذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هٰذَا، فَصَبَرَ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حنین کی جنگ ہوئی اور اس میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی تو بہت سارا مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔غزوۂ حنین کے موقعہ پر چالیس ہزار(۴۰۰۰۰) بکریاں اور چوبیس ہزار(۲۴۰۰۰)اونٹ غنیمت میں ہاتھ آئے تھے اس زمانے میں جنگ میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آتا تھا اس کا پانچواں حصہ الگ کرلیا جاتا تھا اور باقی چار حصے لشکر کے درمیان تقسیم کردئے جاتے تھے، یہ خمس جو الگ کیا جاتا تھا اس میں بہت سارے کام کئے جاتے تھے،اس میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار ہوتا تھا کہ آپ کسی کو دلجوئی کے طور پر عطا فرمانا چاہیں تو عطا فرما سکتے ہیں۔چوبیس ہزار(۲۴۰۰۰) کا پانچواں بھی اگر دیکھا جائے تو چار ہزار آٹھ سو(۴۸۰۰) ہوجائے گا۔اسی طرح بکریوں میں بھی آٹھ ہزار(۸۰۰۰) بکریاں خمس میں آئی تھیں۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خمس میں سے جو نومسلم تھے ان کو عطا فرمایا۔اس لئے کہ حنین کی جنگ فتحِ مکہ کے بعد پیش آئی ہے۔

۸ھ میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ ہی میں تھے تو قبیلۂ بنوثقیف اور دوسرے وہ قبائل جو مکہ مکرمہ سے باہر کے علاقے میں آباد تھے ان کو جب معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کو فتح کرلیا ہے تو انہوں نے سوچا کہ اب تو ہمارا نمبر ہے،اس لئے انہوں نے پہلے ہی یہ طے کرلیا کہ وہ حملہ آور ہوں اس سے پہلے ہی ہم تیاری کر کے ان پر حملہ کردیں چنانچہ ان لوگوں نے ایک بڑا لشکر وادئ حنین میں مسلمانوں سے مقابلے کے واسطے جمع کیا۔وادئ حنین عرفات سے طائف جاتے ہوئے راستے میں پڑتی ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ ہم پر حملہ کریں اس سے پہلے ہم ہی جائیں۔چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو لے کر ان کے مقابلے کے لئے تشریف لے گئے۔

حضور ﷺ جب مکہ مکرمہ فتح کرنے کے واسطے آئے تھے تو آپ کے ساتھ دس ہزار کا لشکر تھا اور پھر مکہ میں جو لوگ نئے مسلمان ہوئے اور دوسرے حضرات جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن اسلام کی طرف مائل تھے ان کی دو ہزار کی تعداد تھی، گویا بارہ ہزار کی جمعیت اور لشکر لے کر آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے حنین کی طرف روانہ ہوئے، اتفاق کی بات کہ ایک آدمی کی زبان سے یہ جملہ نکلا ﴿لَنْ نُغْلَبَ الیومَ عَنْ قِلَّةٍ﴾ کہ آج ہم تعداد کی کمی کی وجہ سے مغلوب نہیں ہوں گے۔ گویا اس بولنے والے کے ذہن میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ تعداد کی کثرت ہی کامیابی کا ذریعہ بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ایسی بات پسند نہیں۔ جب یہ حضرات حنین پہنچے تو جن قبائل کے ساتھ مقابلہ تھا وہ لوگ تیراندازی میں بڑے مشہور تھے، انہوں نے ایسا کیا کہ اپنے جو مخصوص تیرانداز تھے ان کو پہاڑوں کے اندر کمین گاہوں میں چھپادیا اور کچھ لشکر ان کا مقابلے پر آیا اور پیچھے ہٹا۔ مسلمان جب ان پر غلبہ پانے کے لئے آگے بڑھے تو اچانک وہ تیرانداز جو چھپے ہوئے تھے باہر آئے اور انہوں نے جو تیر چلانے شروع کئے تو مسلمانوں کا لشکر تِتّر بتّر ہونے لگا اور پیچھے ہٹنا شروع ہوا۔ اسی موقعہ پر نبی کریم ﷺ اور کچھ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جم گئے۔ اس واقعہ کی بڑی لمبی تفصیل ہے۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے حکایاتِ صحابہ میں بھی اس واقعہ کو تفصیل سے ذکر کیا ہے آپ حضرات سنتے ہیں اور پڑھا بھی ہوگا۔ بہرحال! پھر بعد میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مدد آئی اور فرشتے بھی مدد کے واسطے آئے اور مسلمانوں کو آخر میں کامیابی ہوئی اور اسی لڑائی میں بہت بڑا مال غنیمت کے طور پر ہاتھ لگا جیسا کہ میں نے ابھی تفصیل عرض کی کہ چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) بکریاں اور چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) اونٹ اور بھی سونا چاندی غلام باندیاں وغیرہ

بہت کچھ ملا۔ تو حضور ﷺ نے وہ جو پانچواں حصہ الگ کر کے نکالا گیا تھا اس کو ایسے لوگوں میں تقسیم فرمایا جو ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔حضور ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ ان کی دلجوئی ہو جائے اور ان کو اسلام کی طرف ذرا مائل کیا جائے،اس لئے ان کو انعام کے طور پر اس مال کے خمس میں سے بہت کچھ دیا،کسی کو پچاس اور کسی کو سو اونٹ دئے، چنانچہ اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ یہ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے ان کو آپ نے سو اونٹ دئے، اور عیینہ بن حصن رضی اللہ عنہ یہ بھی قبیلۂ بنوفزارہ کے سردار تھے؛ ان کو بھی سو اونٹ دئے۔اور بھی عرب کے دوسرے سرداروں کو ان کے مرتبہ اور حیثیت کے مطابق انعام کے طور پر اونٹ اور بکریاں عطا فرمائیں،لیکن جو غانمین کا حصہ تھا اس میں سے نہیں بلکہ خمس میں سے دیا تھا۔

بہرحال! جب آپ نے ان کو زیادہ دیا تو اس پر ایک آدمی نے اعتراض کیا۔ ذوالخویصرہ تمیمی اس کا نام تھا اسی کی نسل سے بعد میں جا کر خوارج پیدا ہوئے جن کے متعلق نبی کریم ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ ایک گمراہ جماعت پیدا ہونے والی ہے۔وہ ذوالخویصرہ تمیمی نامی شخص اٹھا اور اس نے کہا: اس تقسیم میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ نبی کریم ﷺ نے جو تقسیم فرمائی اس پر وہ یہ کہہ رہا ہے کہ برابر تقسیم نہیں کی گئی ہے اور اس تقسیم میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مدِنظر نہیں رکھی گئی ہے۔گویا اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے حضور ﷺ نے اتنے اتنے اونٹ دے دئے ،اللہ تعالیٰ کے حکم کو پیشِ نظر نہیں رکھا۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کی یہ بات سنی،وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے جی میں طے کیا کہ اس آدمی نے جو بات کہی ہے،مَیں جا کر حضور اکرم ﷺ کو بتلاتا ہوں کہ یہ آدمی ایسا بولا۔بعض روایتوں میں آتا ہے کہ بعد میں خود اس نے بھی

حضور ﷺ کے سامنے جا کر یہ جملہ بولا۔ خیر! حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جا کر اس کے اس جملے کی اطلاع دی۔ دیکھئے! یہ کتنی بڑی ایذاء پہنچانے والی بات تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں نے جا کر جب اطلاع دی تو یہ سن کر نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور کا رنگ بدل گیا اور بالکل خالص سونے کی طرح سرخ ہو گیا، اس موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ اور اس کا رسول ہی انصاف نہیں کرے گا؛ تو دنیا میں اور کون انصاف کرے گا؟ اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے کہ ان کو ان کی قوم کی طرف سے اس سے بھی زیادہ تکلیفیں پہنچائی گئیں لیکن انہوں نے صبر سے کام لیا۔ یہ فرما کر نبی کریم ﷺ نے بھی اس کے اس جملے کو برداشت کر لیا اور اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

کہنے کا حاصل یہ تھا کہ لوگوں کی طرف سے ایسی باتیں جو قلب کو دکھ اور تکلیف پہنچانے والی ہوں اس پر صبر کرنا چاہیے، چاہے اس کی طرف سے کیا جانے والا معاملہ ٹھیک ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی صحیح کام کیا اس پر بھی لوگ اعتراضات کرتے ہیں، خاص کر جو ذمہ دار حضرات ہوتے ہیں جب ان کی طرف سے کوئی فیصلہ وجود میں آتا ہے تو چاہے انہوں نے عدل و انصاف کے تقاضوں کی پوری رعایت کیوں نہ کی ہو؛ اس کے باوجود ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں میں سے بعض ان چیزوں پر اعتراضات کرتے ہیں۔ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کی طرف سے عملی طور پر ذمہ دار حضرات کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ ایسی باتیں اگر ان کی طرف سے کہی جائیں؛ تو اس پر صبر سے کام لینا چاہیے، ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سلسلہ تو چلا آ رہا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف سے اس قسم کی تکلیفیں پہنچائی گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس قسم کی باتیں کہی گئیں، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کہنے والے ایسا کہہ سکتے ہیں کہ انصاف سے کام نہیں لیا تو پھر ہما شما کا کیا؟ اس لئے جو دین کا کام کرنے والے ہیں یا قوم کی ذمہ داریاں جن کے کاندھوں پر ہیں، ایسے لوگوں کی طرف سے جب کوئی فیصلے ہوں، چاہے انہوں نے اپنے فیصلوں میں حق وانصاف کی پوری رعایت کی ہو؛ اس کے باوجود ان کی باتوں پر اگر کوئی اعتراض کیا جاوے تو ان کو اس بات کی تعلیم دی جارہی ہے کہ ان کو صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے، بلکہ ایسی چیزوں کو برداشت کریں، صبر کریں۔ اور جن لوگوں نے ان کے صحیح طرزِ عمل پر بھی ایسی باتیں کہی ہیں، ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ ورنہ یہ ہوگا کہ جب انتقامی کارروائی شروع ہوگی تو بجائے نفع کے نقصان ہوگا اور اپنے اجروثواب کو بھی غارت کردے گا۔ یہ تو شیطان کی طرف سے ایک سلسلہ جاری ہے۔

شیطان کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ شیطان کی اولین کوشش یہ ہوتی ہے کہ آدمی کو نیکی کے کام سے روکتا ہے کہ جو نیکی کا کام کرنے جارہا ہے؛ وہ نہ کرپائے۔ اور یہ کوشش مختلف طریقوں سے کرے گا، اگر اس میں کامیاب ہوگیا تو اس کا مقصد حاصل ہوگیا۔ اور اگر اس میں کامیاب نہیں ہوا بلکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ یہ تو کررہا ہے تو اب دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی نیت میں کچھ فتور ڈال دے، ریا میں مبتلا کردے، شہرت کی طلب اس کے دل میں پیدا کردے۔ مطلب یہ ہے کہ عمل سے تو روک نہیں سکا تو اب اس عمل میں خرابی لانے

کے لئے دوسرا حربہ آزمار ہا ہے کہ اب اس کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ میں یہ کام کروں گا تو لوگ میری تعریف کریں گے، خوش ہوں گے، ہدیے دیں گے، مطلب یہ ہے کہ ریا شہرت اور دکھلاوے والی بات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب اگر اس میں بھی ناکام ہو گیا اور اس کا اس پر کوئی داؤ نہیں چلا تو دوسروں کو اس کے خلاف کھڑا کرتا ہے۔ کام کرنے والے نے کام کرلیا اور اخلاص کے ساتھ بھی کیا لیکن اب ایسے لوگ کھڑے کر دئے جو اس کے خلاف اعتراضات کرتے ہیں کہ اس نے ایسا کیا۔ اب وہاں بھی اس کا امتحان ہے، اگر یہ ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور کوئی انتقامی کارروائی کرلی تو پھر اس کا مقصد حاصل ہو گیا، اور اگر یہاں بھی وہ صبر سے کام لیتا ہے اور کچھ نہیں کرتا تو پھر اور آگے وہ اقدام یہ کرتا ہے کہ کچھ لوگوں کو اس کے خلاف ایسے مسلط کر دیتا ہے کہ جو مختلف طریقوں سے، زبان سے، ہاتھ سے، شیاطین کے ذریعہ سے، سحر وغیرہ کے ذریعہ سے ایذا رسانی کا کام کرتے ہی رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان پیچھا تو چھوڑتا ہی نہیں، جب کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں لگتا ہے تو شیطان اخیر تک مختلف طریقوں سے اس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اخیر میں اس کا کوئی حربہ کامیاب نہیں ہوتا تب بھی کچھ لوگوں کو پیچھے لگا کر ایذا پہنچانے کے سلسلے جاری رکھتا ہے اور مختلف طریقوں سے آدمی کو مبتلا کرنا چاہتا ہے اس لئے آدمی کی سعادتمندی اور دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر شیطان کے ان حملوں سے اپنے آپ کو بچانے کی اور محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔

اس لئے کہ بہت سے تو وہ ہوتے ہیں جو اول وہلہ ہی میں اس کے داؤ میں آجاتے ہیں اور نیکی کے کام ہی نہیں کر پاتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر وہ ہوتے ہیں کہ کرلیا تو ریا اور

شہرت کی طلب میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہاں اس نے بے کار کر دیا۔ بعض وہ ہوتے ہیں کہ اس میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں تو جو مخالفین آئے تو یہ اپنا کام چھوڑ کر ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں تو تیسرے نمبر پر ان کو نا کام کر دیا۔ اور پھر اگر اعتراضات کرنے والوں کے بھی جوابات نہیں دیئے تو چوتھے نمبر پر سامنے آئے بغیر چھپ کر جو تکلیف پہنچاتے ہیں؛ ان کے اندر لگا دیتے ہیں۔ آدمی کو ان چاروں سے بچنے کی اور شیطان کے دوسرے حربوں سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔

﴿حاصلِ کلام﴾

بعض مرتبہ جو کام کرنے والے ہوتے ہیں وہ اپنے حالات پیش کرتے ہیں کہ ایسا ہو رہا ہے، فلاں پیچھے پڑا ہوا ہے اور یہ اعتراضات ہو رہے ہیں۔ تو بہت سی مرتبہ تو ان اعتراضات کی وجہ سے وہ آدمی کام کرنا ہی چھوڑ دیتا ہے۔ اور اگر نہیں چھوڑتا تو ان کے جواب میں پڑ جاتا ہے یا ان کی انتقامی کارروائی میں لگ جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بتلایا کہ ایسی دوسری تیسری چیزوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، صبر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے

﴿گناہوں کے باوجود عذاب نہ آنے کا مطلب کیا سمجھا جائے؟﴾

عن أنس رضي الله عنه قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِذَاأَرَادَاللهُ بِعَبْدِهٖ خَيْرًا عَجَّلَ لَهُ الْعُقُوْبَةَ فِي الدُّنْيَا، وَإِذَاأَرَادَاللهُ بِعَبْدِهِ الشَّرَّ أَمْسَكَ عَنْهُ بِذَنْبِهٖ. حَتّٰى يُوَافِيَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ إِنَّ عِظَمَ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ. وَإِنَّ اللهَ تَعَالٰى إِذَاأَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ. فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السُّخْطُ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ اپنے

بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے گناہوں کے اوپر دنیا ہی میں اس کو سزا دے دیتے ہیں اور اگر کسی بندے کے ساتھ برائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے گناہوں کے باوجود دنیا میں اس کو کوئی سزا نہیں دی جاتی، اس کا معاملہ موقوف رکھا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کو قیامت کے روز پوری پوری سزا دی جاتی ہے۔ اس لئے کہ جیسے دنیا فانی ہے دنیا کی نعمتیں بھی فانی ہیں، اور دنیا کی عقوبتیں سزائیں اور تکلیفیں بھی فانی ہیں۔ اور جیسے دنیا کی ہر چیز کمزور ہے، اسی طرح دنیا کی خوشی بھی فانی ہونے کے ساتھ ساتھ کمزور ہے، دنیا کی سزا بھی فانی ہونے کے ساتھ ساتھ کمزور ہے۔ اور آخرت میں جو کچھ بھی ہے وہ باقی رہنے والا اور قوی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اگر اس کی طرف سے گناہ صادر ہوئے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کی سزا دنیا ہی میں اس کو دے دیتے ہیں تاکہ آخرت میں جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچے تو گناہوں سے پاک صاف ہو، نیکیاں ہی نیکیاں ہوں اور اس کا اجر اس کو دیا جائے۔ گناہوں کی سزا کا کوئی سلسلہ باقی ہی نہ رہے، حساب کتاب پہلے ہی صاف ہو چکا ہو۔ اور اگر کسی کے ساتھ برائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو گناہوں کے باوجود اس کو کوئی سزا نہیں دی جاتی۔

اسی لئے اہلِ علم نے لکھا ہے کہ کسی آدمی کے گناہوں اور معصیتوں پر اصرار کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کوئی عذاب نہیں آرہا ہے، تو یہ کوئی خوش ہونے کی چیز نہیں ہے؛ بلکہ ڈرنے کی چیز ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ڈھیل دی جارہی ہے اللہ تعالیٰ جب پکڑیں گے تو اچانک پکڑ لیں گے۔ اس لئے اصل یہ ہے کہ ایسی چیزوں سے آدمی خوش نہ ہو بلکہ حق تعالیٰ شانہٗ سے ڈرتا رہے، گناہوں سے توبہ واستغفار کرتا رہے

مؤمن کی شان یہی ہوا کرتی ہے۔اور یہ بھی ہے کہ گناہوں سے توبہ و استغفار کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے عذاب وسزا سے بھی پناہ مانگتا رہے۔ چاہے دنیا کی سزا ہو یا آخرت کی، دنیا کی سزا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر سزا ہے تو وہ بھی ہم لوگوں کے لئے ناقابلِ برداشت ہی ہے۔اس لئے آدمی کو عافیت ہی مانگنی چاہیے۔

عافیت ہی مانگے

ایک آدمی کو نبی کریم ﷺ نے دیکھا کہ وہ بخار میں ایسا مبتلا ہے کہ اس کی وجہ سے بالکل کمزور ہو گیا ہے، چہرہ بھی اس کا پیلا پڑ گیا ہے،اور جسم بھی بالکل کمزور ہو چکا ہے۔ حضور ﷺ نے پوچھا بات کیا ہے؟ کیا تم کوئی دعا کرتے ہو؟اس نے کہا: ہاں یارسول اللہ! مَیں نے ایک دعا کی ہے کہ اے اللہ! تو مجھے جو سزا آخرت میں دینے والا ہے؛ وہ دنیا ہی میں دے دے۔حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندے! یہ بھی تو دعا کرسکتا تھا کہ اے اللہ! معاف کر دے۔ (ترمذی ۵/۵۲۱) جب دعا ہی کرنے بیٹھے ہیں اور مانگنے ہی بیٹھے ہیں تو یہ کیوں نہیں مانگا جاتا۔اس لئے آدمی خود تو مصیبت مانگے ہی نہیں، اللہ تعالیٰ سے عافیت ہی مانگے دنیا میں بھی یہی مانگے کہ اے اللہ! میرے گناہوں کو معاف کر اور میرے گناہوں کی وجہ سے نہ مجھے دنیا میں سزا دے اور نہ آخرت میں پکڑ۔اللہ تعالیٰ سے آدمی کو مغفرت اور رحمت ہی کا سوال کرنا چاہیے۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ دنیا میں ہوگی تو اس کو بھی برداشت کرنے کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔معلوم نہیں وہ پکڑ ہو اور کیا حالات پیش آئیں، بہت سی مرتبہ عقوبت اور سزا کے طور پر ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ اس کی وجہ سے آدمی ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔زبان سے ایسی چیزیں نکال دیتا ہے جن کی وجہ سے ایمان ہاتھ سے چلا

جاتا ہے، اس لئے آدمی کو عافیت ہی مانگنی چاہیے۔ لیکن خدانخواستہ اس کے باوجود اگر کوئی ایسے حالات آزمائش کے پیش آجائیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے اور تدبیر کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہے۔

﴿بڑی آزمائش کا بدلہ بھی بڑا﴾

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: بڑا اچھا بدلہ اس وقت ملتا ہے جب بڑی آزمائش ہو۔ جیسے امتحان بڑا ہو تو اس پر انعام بھی بڑا ہی ملتا ہے۔ چھوٹے امتحان پر انعام بھی چھوٹا ہی ملتا ہے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اگر آزمائش بڑی کی گئی ہے تو جو بدلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام کی شکل میں ملے گا؛ وہ بھی بڑا ہی ملے گا۔ یہ تو دنیا کا دستور ہی ہے۔

﴿محبتِ خداوندی کی ایک پہچان﴾

﴿وَاِنَّ اللهَ تَعَالیٰ اِذَا اَحَبَّ قَوْمًا اِبْتَلاهُمْ﴾ حضور ﷺ نے ایک دوسرا اصول بتلایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو ان کو آزمائش میں ڈالتا ہے یعنی ان کے لئے حالات پیدا کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے ان کی آزمائش کی جاتی ہے۔

﴿فَمَنْ رَضِیَ فَلَهُ الرِّضَا﴾ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی گئی ان مصیبتوں اور آزمائشوں پر جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے پر راضی رہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جس حال میں رکھے ہم راضی ہیں، ہم تو اللہ کے بندے ہیں؛ تو پھر اللہ تعالیٰ ان کے لئے آسانیاں پیدا فرما دیتے ہیں اور راضی ہو جاتے ہیں۔

﴿رضا بالقضا حاصل کرنے کا نسخہ﴾

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے ایک مصیبت کے ساتھ دو راحتیں اور اسی طرح ایک تنگی کے

ساتھ دو آسانیاں رکھی ہیں۔ یہ قاعدہ ہے۔اس لئے نعمتوں کا سلسلہ مصیبتوں کے مقابلے میں وسیع اور زیادہ ہوا کرتا ہے۔لہٰذا آدمی کو یوں سوچنا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اگر کوئی تکلیف پہنچی بھی ہے تو جس ذات کی طرف سے یہ تکلیف پہنچی،اس ذات کی طرف سے بے شمار نعمتیں بھی مجھے پہنچی ہیں،ان نعمتوں کا تقاضہ یہ ہے کہ اس تکلیف کو بھی مَیں خوشی خوشی برداشت کرلوں۔

شاید پہلے بھی مَیں نے بتلایا تھا کہ حضرت لقمان حکیم جب غلام تھے تو ان کی غلامی کے زمانے میں ایک مرتبہ ان کے آقا نے ان کو ککڑی کی ایک قاش کاٹ کر دی،انھوں نے کھالی،حالانکہ وہ کڑوی تھی لیکن چہرے سے ذرّہ برابر بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ کڑوی ہے۔ جب دوسری قاش کاٹ کر آقا نے خود کھائی تو کڑوی نکلی۔اس نے کہا: تم نے بتلایا بھی نہیں، پتہ بھی چلنے نہیں دیا؟ انہوں نے جواب دیا: جس ہاتھ سے اب تک اتنی شیرنیاں کھائی ہیں اگر ایک آدھ تلخی پہنچے؛ تو کیا مَیں اس کا اظہار کروں گا؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہمیں بے شمار نعمتیں پہنچتی ہی رہتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے کیا کم نعمتیں دی ہیں؟

انسان کی نادانی

بعض آدمی یوں سوچتے ہیں کہ کون سی نعمتیں ہیں؟ یہ بھی آدمی کی نادانی کی بات ہے۔ایک آدمی کسی بزرگ کے پاس گیا اور کہا کہ میں اس تکلیف میں ہوں اور اُس تکلیف میں ہوں۔ میرے پاس کوئی نعمت ہے ہی نہیں۔انہوں نے کہا: تیرے پاس تو اللہ تعالیٰ کی بہت ساری نعمتیں ہیں۔تو کہتا ہے کہ کونسی نعمتیں ہیں؟ انہوں نے کہا: اچھا دیکھو! یہ تمہاری

آنکھیں ہیں، کیا تم ان دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ پچاس ہزار روپے میں دینے کے لئے تیار ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ کان زبان ہاتھ پاؤں ہر ہر عضو کا تذکرہ کرکے پچاس ہزار اور لاکھ کی باتیں کہیں۔ وہ ہر ایک کے جواب میں انکار کرتا رہا۔ آخر میں ان بزرگ نے فرمایا: خود تیرے اقرار کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو لاکھوں کی ملکیت تیرے پاس ہے اور تو کہتا ہے کہ میں غریب ہوں، میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہ کیسی بات کرتا ہے؟

﴿ایک بزرگ کا قصہ﴾

حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں کو استعمال کرتے ہیں ان کا ہمیں احساس ہی نہیں ہے۔ ہمارے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ مولانا احمد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سناتے تھے کہ کسی وجہ سے ان کی پیشاب رک گئی تھی، تو آپریشن کرکے ایک نلی بٹھا دی گئی اور وہ تھیلی میں پیشاب کرلیا کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا: حضرت! یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ میرے گناہوں کی سزا ہے۔ پوچھا: کیا ہوا؟ فرمایا: زندگی بھر عافیت کے ساتھ پیشاب ہوتی رہی، کبھی پھوٹی زبان سے ایک مرتبہ بھی الحمد للہ نہیں کہا۔ یعنی پیشاب اپنے وقت پر اطمینان سے ہو جائے، یہ بہت بڑی نعمت ہے؛ جس کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے دعا سکھلائی کہ جب پیشاب سے فارغ ہو جائے تو آدمی یہ دعا پڑھے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ﴾ تمام تعریف اس اللہ کے لئے جس نے اس تکلیف پہنچانے اور گندگی والی چیز کو (جو میرے جسم میں تھی) مجھ سے دور کردیا اور مجھے عافیت عطا فرمائی۔ آدمی سوچے کہ یہ پیشاب جو اطمینان کے ساتھ

ہوتی ہے، اگر کسی وقت رک جائے، تو کیا حال ہوگا؟ اس پیشاب کو نکالنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کی جائیں گی، اور معلوم نہیں کتنا خرچ کرنے کے لئے آدمی تیار ہوگا۔

پوری سلطنت کی قیمت

ہارون الرشید ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے کہا: اتنی بڑی سلطنت ہے، اس کی کیا قیمت ہے؟ اگر آپ کو سخت پیاس لگ جائے اور آپ سے یوں مطالبہ کیا جائے کہ یہ آدھا گلاس پانی ہے، اگر آدھی سلطنت دیں گے، تو آدھا گلاس پانی ملے گا؛ آپ کیا کریں گے؟ انہوں نے کہا: دینے کے لئے تیار ہوں۔ پھر کہا: اچھا! اگر آپ کی پیشاب رک جائے اور آپ کو یوں کہا جائے کہ آدھی سلطنت دیں گے، تو آپ کی یہ پیشاب نکالی جائے گی؛ تو کیا کریں گے؟ انہوں نے کہا: دوں گا۔ اس نے کہا: آپ کی سلطنت کی قیمت کا اندازہ لگا لیجئے۔

قابلِ عبرت بات

فضائلِ صدقات میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جا رہے تھے، ایک آدمی اپاہج اور معذور پڑا ہوا تھا، نہ اس کے ہاتھ تھے، نہ پاؤں تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں کھڑے ہوگئے اور لوگوں سے کہا: اس کو دیکھو اور بتاؤ! اس آدمی پر اللہ تعالیٰ کی کیا نعمتیں ہیں؟ لوگوں نے کہا: اس پر کیا نعمتیں ہیں؟ نہ اس کا ہاتھ ہے، نہ پاؤں ہے، نہ اور کچھ سامان ہے؟ تو فرمایا: کیا وہ عافیت کے ساتھ اپنے وقت پر اطمینان سے پیشاب کر لیتا ہے؛ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت نہیں ہے؟

قدرِ نعمت بعدِ زوال

یہ حقیقت ہے اور میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں۔ یہ

تو ہم ناشکرے ہیں کہ ہمارا دھیان اس کی طرف نہیں جاتا۔جیسا کہ فارسی کا مقولہ ہے:۔ ’’قدرِ نعمت بعدِ زوالِ نعمت‘‘ آدمی کو نعمت کی قدر اس وقت ہوتی ہے؛ جب وہ نعمت نہیں ہوتی جب نعمت ہاتھ سے چھنتی ہے اس وقت آدمی کو پتہ چلتا ہے کہ اوہو! یہ کتنی بڑی نعمت تھی۔ ایک آدمی کے پاس لاکھوں روپے ہیں،لیکن وقت پر پیشاب ہی صحیح طریقے سے نہیں ہو پاتی،اوراس کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا ہے؛تو وہ لاکھوں روپے کیا کام آئے؟

دولت کس کام کی؟

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ ارشاد فرمایا کرتے تھے:ہمارے بچپن میں سنا تھا کہ ایک انگریز تھا،وہ اتنا رئیس اور مال دار تھا کہ اس کے متعلق مشہور تھا کہ جتنی دیر میں وہ ایک سگریٹ پیے؛اتنی دیر میں اس کے خزانے میں ایک ہزار روپے جمع ہوتے ہیں۔اس زمانے کے ایک ہزار،آج کے نہیں۔آج سے سو سال پہلے کی بات ہے۔لیکن وہ ایسا بیمار تھا کہ ڈاکٹروں نے کہہ رکھا تھا کہ اس کو کھانے کے لئے صرف دال کا پانی دیا جائے۔اس کے علاوہ اور کوئی چیز استعمال نہیں کرسکتا تھا۔اب بتلائیے کہ اس کے پاس لاکھوں اور کروڑوں کی دولت بھی ہے؛تو کیا کام کی؟

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں،ہر ہر نعمت کا اندازہ اس کو دیکھ کر لگائے جس کے پاس وہ نعمت نہیں ہے،اور اپنی اس نعمت پر جو اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہے؛قدر کرے،اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوجاتے ہیں

مَیں اسی کو عرض کررہا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جب کسی قوم سے محبت رکھتے ہیں تو

ان کو آزمائش میں ڈالتے ہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ﴿فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا﴾ اللہ تعالیٰ کی اس آزمائش کے جواب میں جو شخص اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے یعنی ناراضگی کی کوئی بات نہیں کرتا، شکوے شکایتیں نہیں کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے اس پر وہ خوش ہے؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو رضامندی کا سرٹیفکٹ دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اس سے خوش ہوجاتے ہیں۔

﴿اللہ تعالیٰ بھی ناراض﴾

﴿وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السُّخْطُ﴾ اور جو شخص اس آزمائش اور ابتلاء کے جواب میں بجائے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے پر راضی رہنے کے ناراضگی کا اظہار کرتا ہے، لوگوں کے سامنے شکوے شکایتیں کرتا ہے، روتا دھوتا رہتا ہے، کہ یہ مصیبت ہے اور فلاں ہے، گویا اس کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی شکایتیں لوگوں کے سامنے کرنا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کے لئے ناراضگی کا فیصلہ ہوجاتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ہمارے اوپر جو حالات آتے ہیں وہ ہمارا امتحان ہے۔ اب ہمیں سوچنا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس امتحان میں ہم ناکام ہوجائیں۔ کامیاب ہونے کی کوشش کرنی ہے۔ اور کامیاب ہونے کی کوشش یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس حال میں ڈالا ہے اس میں آدمی خوش رہے، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تصور کرتے ہوئے اس کا شکر ادا کرنے کی کوشش کرے، اور جو مصیبت ہے اس پر صبر کرنے کی کوشش کرے، کسی کے سامنے شکوہ شکایت نہ کرے۔

﴿مثالی صبر﴾

اسی کی مناسبت سے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا ایک چھوٹا بچہ

ڈیڑھ دو سال کا تھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ماں شریک بھائی تھا، وہ بیمار تھا، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کسی سفر میں تشریف لے گئے، ابھی وہ سفر میں تھے اس دوران وہ بچہ انتقال کر گیا اور اس کو دفن بھی کر دیا گیا۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اپنے سفر سے جب واپس آئے، شام کا وقت تھا، آتے ہی اپنی بیوی حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا (جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں) سے پوچھا: میرے بچے کا کیا حال ہے؟ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا: پہلے سے زیادہ سکون اور بہت اطمینان ہے۔ ظاہر ہے پہلے زندہ تھا اور بیمار تھا تو اس وقت تو تکلیف میں تھا، اب انتقال کر گیا تو انتقال جیسا سکون تو کہیں ہے ہی نہیں۔ اس لئے کہا: ﴿هُوَ أَسْكَنُ مَا كَان﴾ پہلے جو حالت تھی اِس وقت اُس سے زیادہ سکون ہے۔ گویا اپنے اعتبار سے انہوں نے جو جواب دیا وہ بالکل درست تھا، لیکن اس کا مطلب حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ یوں سمجھے کہ بیماری میں تخفیف ہوگئی ہے اور ٹھیک ہے۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے مناسب نہیں سمجھا کہ بچے کے باپ کو سفر سے آتے ہی بچے کی موت کی اطلاع دی جائے۔

﴿عورتوں کے لئے ایک سبق﴾

آدمی کبھی سفر سے آتا ہے اور سفر کی تکلیفوں کی وجہ سے پریشان ہوتا ہے، اور آتے ہی ایسی کوئی صورتِ حال اس کے سامنے رکھی جائے تو اور زیادہ پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لئے عورتوں کو بھی چاہیے کہ وہ ایسے موقع پر شوہر کے سامنے ایسے حالات ایک دم سے نہ رکھیں، بلکہ پہلے دیکھ لیں کہ اس کا مزاج ٹھیک ٹھاک اور سکون پذیر ہے، اس کے بعد اطمینان دیکھ کر وہ بات پیش کی جاسکتی ہے۔

بہر حال! حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے یہ جواب دے دیا اور شام کا کھانا بھی پیش

کر دیا۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو اطمینان ہو گیا تھا کہ بچہ سکون سے ہے تو انہوں نے کھانا بھی اچھی طرح کھالیا اور پھر سو گئے اور اپنی بیوی کے ساتھ صحبت بھی کی۔ اس لئے کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو یہ تو خبر ہی نہیں تھی کہ بچے کا انتقال ہو گیا ہے۔ کیونکہ حضرت ام سلیم نے ابھی اطلاع دی ہی نہیں تھی بلکہ مختصر سا جواب دے دیا تھا۔ جب صبح ہوئی اور وہ صحبت اور غسل وغیرہ سے فارغ ہو گئے تو حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے اطلاع دی کہ بچے کو تو لوگوں نے دفن کر دیا ہے۔ یہ سن کر حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو بڑا غصہ آیا کہ آتے ہی مجھے اطلاع کیوں نہیں کی۔ مَیں نے پوچھا تو یہ جواب دیا کہ زیادہ سکون میں ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے تو کھانا بھی کھالیا اور صحبت بھی کر لی۔ ایسے موقع پر آدمی کو افسوس یہ ہوتا ہے کہ ادھر میرے بچے کا انتقال ہو گیا تھا اور بے خبری میں مَیں نے یہ ساری حرکتیں کر لیں۔ افسوس اور ندامت سی ہوتی ہے، خاص کر کہ جب صحبت بھی کر لی تھی۔ اس لئے ندامت کے احساس کی وجہ سے صبح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور کے سامنے پورا واقعہ بیان کیا کہ یارسول اللہ! ایسا ہوا۔ میں سفر میں گیا تھا، بچہ بیمار تھا، جب میں واپس آیا تو میں نے بچے کے متعلق پوچھا: کیا حال ہے۔ اس نے کہا: پہلے سے زیادہ اطمینان ہے۔ میں تو یہ سمجھا کہ ٹھیک ہے اور تندرست ہے۔ اس نے کھانا پیش کیا، میں نے کھالیا اس کے بعد میں نے صحبت بھی کی۔ اب اس کے بعد وہ مجھے اطلاع دیتی ہے کہ بچے کا تو انتقال ہو گیا ہے۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ام سلیم نے مناسب کام کیا یا نہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا: تم نے رات کو صحبت کی تھی؟ کہا: جی ہاں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! ان کے لئے آج کی اس صحبت میں برکت عطا فرما۔ چنانچہ اسی صحبت

کے نتیجے میں حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کو ایک بچہ پیدا ہوا۔

تحنیک کی سنیت اور اس کا طریقہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کو نہلا دھلا کر ان کی والدہ نے میرے حوالے کیا کہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تحنیک کروانے اور نام پوچھنے کے واسطے لے جاؤ، اور ساتھ میں کچھ کھجوریں بھی دیں۔ مدینہ والوں کا دستور ہی تھا کہ جب کبھی کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو اس کو نہلا دھلا کر تحنیک کے واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچاتے ان کو بھی حضور کی خدمت میں بھیجا۔ جب حضرت انس رضی اللہ عنہ بچے کو لیکر وہاں پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نومولود کو دیکھ کر پوچھا: کچھ ساتھ میں لائے ہو؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں! کھجوریں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کھجوریں لیں اور اپنے منھ سے چبا کر نرم کیا اور پھر اپنے دہن مبارک سے اس کو نکال کر اس بچے کے تالو میں چپکا دی، اسی کو تحنیک کہتے ہیں۔

تحنیک کیوں؟

یہ مستحب ہے کہ جب بچہ پیدا ہو تو اس کو نہلا دھلا کر اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے اور کسی صالح و نیک آدمی کے پاس اس کو لے جائیں وہ کھجور یا کوئی میٹھی چیز کو نرم کر کے اس کے تالو سے چپکا دے گا؛ اسی کو تحنیک کہتے ہیں، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے جسم میں ایک صالح آدمی کے ثمرات ہوں اور اس کی وجہ سے آئندہ اس کے اندر صلاح کی صورتیں پیدا ہوں، اسی کو گھُٹی (ઘુટ્ટી) دینا کہتے ہیں، اب ہمارے یہاں یہ ہوتا ہے کہ تیار گھُٹی (ઘુટ્ટી) بازار سے لے آتے ہیں۔ یہ صورت

بیکار ہے۔ گھُٹی (گھٹی) کا مقصد تو یہ ہے کہ اس کے لئے صلاح اور نیکی کے راستوں کو ہموار کرنا ہے، اسی لئے کسی صالح آدمی کے پاس ہو۔ آج کل اس کا اہتمام نہیں رہا۔ اس کا بڑا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ایک ملنے والے نے بتلایا کہ ان کی بہن پیدا ہوئی تھی۔ اسپتال میں کسی ہندو عورت نے گھُٹی (گھٹی) دے دی تو اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ گوشت ہی نہیں کھاتی۔ گوشت سے اس کو نفرت ہے۔ یہ اس کا اثر ہے۔

بہرحال! واقعہ یہ ہے کہ جس کے ذریعہ سے تحنیک کرائی جاتی ہے اس کے اثرات بچے میں آتے ہیں۔ اس لئے یہ مسنون قرار دیا گیا ہے۔ تو حضور ﷺ نے تحنیک کی اور اس کا نام عبداللہ رکھا۔

ایک انصاری صحابی کہتے ہیں کہ چونکہ حضور ﷺ نے دعا کی تھی کہ اللہ ان کے لئے برکت دیجیے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ یہ بچہ جس کا نام عبداللہ رکھا تھا اور حضور نے اس کی تحنیک کی تھی، ان عبداللہ کے بیٹوں میں ۹ / بیٹوں کو میں نے دیکھا کہ سب کے سب بڑے عالم بنے۔ یہ حضور ﷺ کی دعا کا اثر تھا۔ اس صحبت سے جو بچہ پیدا ہوا اس بچے کی اولاد میں ۹ / بیٹے اس زمانے میں عالم بنے۔

اور اسی حدیث میں مسلم شریف کی روایت میں یہ ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا بیٹا جو حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوا تھا، اس کا انتقال ہوا۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ باہر تشریف لے گئے تھے، حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے خاندان والوں سے کہا کہ جب وہ واپس آئیں تو تم میں سے کوئی ان کو اطلاع مت دینا۔ بچے کے انتقال کی اطلاع میں خود دوں گی

آج کل تو حال یہ ہوتا ہے کہ ماں کی تو ہمت ہی نہیں ہوتی، ماں کا تو اس وقت کوئی نام ہی نہیں لے سکتا۔ اور وہاں دیکھئے کہ والدہ کتنا صبر کا اظہار کر رہی ہیں۔ جب وہ سفر سے واپس آئے تو حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کھانا پیش کیا، انہوں نے کھایا پیا، اور پھر حضرت ام سلیم ؓ نے ان کے لئے بناؤ سنگھار کیا۔ ویسے بھی سفر سے آئے تھے طبیعت میں تقاضہ تھا تو صحبت بھی کی۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے جب دیکھا کہ کھا پی کر سیراب بھی ہو گئے، اور اپنی جو طبعی ضرورت تھی وہ بھی پوری کر لی، اب طبیعت پر کوئی تقاضہ نہیں ہے۔ اب غور کیجیے کہ وہ کیسے اچھے انداز سے بچے کے انتقال کے متعلق ان کو کہہ رہی ہیں۔ انہوں نے کہا: ابوطلحہ! اچھا ایک بات بتلائیے، میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھتی ہوں اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز امانت کے طور پر رکھنے کے لئے دی ہو، چیز تو دوسرے کی ہے اس نے استعمال کے واسطے دی ہے، اگر وہ اپنی چیز واپس مانگے تو کیا وہ گھر والے انکار کر سکتے ہیں؟ کہ نہیں دیں گے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں! کیسے انکار کر سکتے ہیں۔ پھر کہا: اپنے بیٹے کی موت پر صبر سے کام لیجئے۔ اب اطلاع دی کہ بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ گویا یہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم کو استعمال کے واسطے دی گئی تھی، ماں باپ کو اولاد دی جاتی ہے تا کہ اس کے ذریعہ سے ان کا جی خوش ہو، اللہ تعالیٰ ایک وقتِ مقرر تک دیتے ہیں، جب وہ وقت پورا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔ اس کے لینے پر دل سے ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا پر ناراض ہوئے، ناراض اس اطلاع پر نہیں ہوئے بلکہ اس بات پر ہوئے کہ پہلے ہی خبر کیوں نہ دے دی۔ تم نے کھانا دیا؛ میں نے کھایا۔ پھر میں نے صحبت بھی کی اس کے بعد اب تم کہہ رہی ہو۔ پھر

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں گئے اور حالت بیان کی اس پر نبی کریم ﷺ نے دعا دی۔ راوی کہتے ہیں کہ اس صحبت کی وجہ سے حضرت ام سلیم کو حمل ٹھہرا۔

اب حضور ﷺ ایک سفر میں تشریف لے گئے اس میں حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا بھی اپنے شوہر حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریکِ سفر تھیں۔ نبی کریم ﷺ جب سفر سے واپس ہوتے تھے تو مدینہ میں رات کے وقت داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ باہر ٹھہر جاتے تھے۔ چنانچہ اس سفر سے بھی جب واپس آئے اور باہر ٹھہرے اسی وقت حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کو دردِزہ شروع ہوا۔ جب صبح ہوئی تو نبی کریم ﷺ تو رفقاء کے ساتھ مدینہ کے لئے روانہ ہوئے، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو تو بیوی کے دردِزہ کی وجہ سے وہیں رکنا پڑا۔ اور حضور ﷺ جب مدینہ منورہ جانے لگے تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: اے باری تعالیٰ! آج تک تو میرا معمول یہ رہا کہ جب نبی کریم ﷺ سفر میں تشریف لے جاتے تھے تو میں سفر میں ساتھ جاتا تھا، اور جب آپ مدینہ میں داخل ہوتے تھے تو میں آپ کے ساتھ ہی مدینہ میں داخل ہوتا تھا۔ لیکن اے اللہ! آج تو دیکھ رہا ہے کہ یہ بیوی کے ولادت کے درد کی وجہ سے مجھے یہاں رکنا پڑ رہا ہے۔ بس یہ دعا کی اور اسی وقت حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا: اے ابوطلحہ! میں جو درد محسوس کر رہی تھی وہ درد اب نہیں ہے۔ چلو۔ چنانچہ حضور ﷺ کے ساتھ ہی مدینہ میں داخل ہوئے۔ پھر دوسرے دن درد ہوا اور بچہ پیدا ہوا۔ یعنی حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی جو تمنا تھی کہ حضور ﷺ کے ساتھ واپسی ہو؛ وہ بھی پوری ہوئی۔

بہرحال! یہاں تو بتلانا یہ ہے کہ دیکھئے! بچے کی موت پر حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت ام سُلیم رضی اللہ عنہا نے کتنے بڑے صبر کا مظاہرہ کیا کہ اس بچے کی ماں ہونے کے

باوجود بچے کے باپ سفر سے واپس آئے توان کے سامنے فوراً اس واقعہ کی اطلاع نہیں دی، بلکہ ان کے لئے صبر آسان ہو،اس کے لئے ایک مثال دے کر ایک مسئلہ پوچھا؛ تاکہ وہ آسانی کے ساتھ صبر کرسکیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی صحیح توفیق عطا فرمائے

صبر
مجلس ۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاٰتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراًکَثِیْراً .اما بعد .

﴿حقیقی پہلوان﴾

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ:لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرْعَۃِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَہٗ عِنْدَالْغَضَبِ.

یہ بیان صبر کے سلسلہ میں جاری ہے یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا:﴿لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرْعَۃِ﴾ ’’صُرْعَۃ‘‘ عربی زبان میں اس آدمی کو کہتے ہیں جولوگوں کومقابلے کےوقت پچھاڑ دے یعنی پہلوان ۔ پہلوان قوت والا آدمی نہیں ہے یعنی اس کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ زورآور، بڑاقوی اور پہلوان ہے جولوگوں کوپچھاڑ دے ﴿اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَہٗ عِنْدَالْغَضَبِ﴾ قوی اورتوانا آدمی تو وہ ہے جو غصے کےوقت اپنے آپ کوکنٹرول میں رکھے، وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں توانااورقوی ہے۔حقیقت تو یہی ہے کہ جوآدمی اپنے نفس پرقابو پالے وہ حقیقی معنٰی میں بڑاپہلوان کہاجائے گا،مقابلے کے وقت لوگوں کو پچھاڑ دینا؛ یہ کوئی اونچی بات نہیں ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ آدمی غصے کے وقت اپنے آپ پر

کنٹرول کرے۔ ویسے بھی غصے کی وجہ سے عام طور پر آدمی کی غور وفکر اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے اور پھر وہ ایسے افعال اور ایسی حرکتیں انجام دیتا ہے جس کے نتیجے میں بعد میں اس کو بڑی ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے۔

﴿غصہ کے وقت کی دعا﴾

عن سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ كُنْتُ جَالِساً مَعَ النَّبِيِّ ﷺ وَرَجُلَانِ يَسْتَبَّانِ وَأَحَدُهُمَا قَدِ احْمَرَّ وَجْهُهُ، وَانْتَفَخَتْ أَوْدَاجُهُ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اِنِّى لَأَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْقَالَهَا لَذَهَبَ عَنْهُ مَايَجِدُ. لَوْقَالَ أَعُوْذُبِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ذَهَبَ عَنْهُ مَايَجِدُ. فَقَالُوْا لَهُ: اِنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: تَعَوَّذْ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ.

یہ صحابی حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور دو آدمی آپس میں سخت کلامی کر رہے تھے یعنی لڑ رہے تھے، زبانی لڑائی کر رہے تھے گالی گلوچ اور دشنام طرازی سے کام لے رہے تھے، اور دونوں آپس میں ایک دوسرے کو سب وشتم کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کی کیفیت یہ تھی کہ اس کا چہرہ ایک دم لال اور سرخ ہو گیا تھا اور اس کی گردن کی رگیں غصے کی وجہ سے پھول گئی تھیں۔ ان دونوں کی یہ کیفیت نبی کریم ﷺ دیکھ رہے تھے، خاص کر کہ وہ جس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور گردن کی رگیں پھول گئی تھیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر یہ آدمی اُس کلمہ کو پڑھ لے تو اس کی غصے کی جو یہ کیفیت ہے وہ سب ختم ہو جائے گی۔ اگر وہ ﴿**أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم**﴾ پڑھ لے تو یہ غصے کی جو کیفیت ہے اور غصے کی وجہ سے اس کا جو مزاج بدل رہا ہے؛ وہ غصے کا سارا زور ٹوٹ جائے گا اور ختم ہو جائے گا۔

غصہ دور کرنے کی عارضی تدابیر حدیث کی روشنی میں ......

غصے کو فرو کرنے اور دبانے کے واسطے مختلف تدبیریں احادیث میں آئی ہیں ان میں سے ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ غصے کے وقت آدمی تعوّذ پڑھے۔ اعوذ باللہ کا مطلب یہ ہے کہ شیطان مردود کے شر اور اس کی شرارتوں اور برائیوں سے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں۔ اس لئے کہ آدمی کو غصے میں مبتلا کرنا یہ شیطانی وسوسے کے نتیجہ میں ہوتا ہے جب آدمی اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور پناہ میں آئے گا تو شیطان کے اثر سے غصے کے جو آثار اس کے اوپر پیدا ہوئے تھے؛ وہ ان شاء اللہ دور ہو جائیں گے۔ ایک تدبیر تو یہ بتلائی ہے۔

دوسری تدبیر احادیث میں یہ آئی ہے کہ آدمی کو اگر غصہ آجائے اور وہ کھڑا ہے تو بیٹھ جائے یا بیٹھا ہو تو لیٹ جائے (رواہ احمد والترمذی، مشکوۃ ص۴۳۴) اس سے بھی فوری طور پر غصے کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک ترکیب یہ بھی آئی ہے کہ آدمی وضو کرلے۔ (ابوداؤد شریف) وضو کی وجہ سے بھی غصہ فرو ہو جاتا ہے، ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ غصہ کی حالت میں آدمی کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تھوڑی دیر کے لئے رخصت ہو جاتی ہے، اور اس حالت میں آدمی ایسی حرکتیں کر ڈالتا ہے کہ بعد میں خود اس کو اس پر ندامت اور پچھتاوا ہوتا ہے۔ اس لئے آدمی کو غصے سے بچنے کے لئے جو تدبیریں بتلائی گئیں ہیں ان کو اختیار کرنا چاہیے۔

لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہ تدبیریں تو عارضی ہیں یعنی فوری طور پر تو غصے کی حالت کو ختم کر دیں گی لیکن اس کی وجہ سے غصے کی عادت ختم نہیں ہوگی۔

غصہ دور کرنے کی دائمی تدبیر

غصے کی عادت ختم کرنے کے لئے آدمی کو یہ تدبیر بتلائی گئی کہ جس آدمی کو غصہ آتا

ہو؛ وہ یوں سوچے کہ مَیں کس پر غصہ کررہا ہوں؟ بیوی پر، بچے پر، یا اپنے نوکر پر، یا کسی اجنبی آدمی پر؟ میں نے اس کو پیدا نہیں کیا، اس کی آنکھ کان ناک ہاتھ پاؤں وغیرہ میں نے نہیں بنائے، اس کو روزی میں نہیں دیتا، میں اس کا مالک نہیں ہوں، اور اس نے ایسی بات کردی جو میری طبیعت کے خلاف ہے جس کی وجہ سے مجھے اس پر اتنا غصہ آرہا ہے؟ حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تو مجھے پیدا کیا، یہ سارے قویٰ اور ساری صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں، اللہ تعالیٰ مجھے روزی دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ساری نعمتیں میں استعمال کررہا ہوں، اور ساتھ ہی ساتھ ایسی حرکتیں کررہا ہوں جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہیں۔ تو میرا اس آدمی کے اوپر اتنا احسان اور میری اس کے اوپر اتنی نعمتیں نہیں ہیں جتنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کے احسانات میرے اوپر ہیں۔ اس کے باوجود میں اس کی معمولی بات پر ناراض ہوکر غصہ کا اظہار کررہا ہوں، اور میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانیاں ہر گھڑی اور ہر وقت کرتا ہوں، ہر لمحہ مجھ سے ایسی باتیں سرزد ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑنے والی اور اس کے حکم کے خلاف ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی میرے ساتھ وہ معاملہ ہونے لگے جو میں اس کے ساتھ اس کی ذراسی غلطی پر کررہا ہوں؛ تو پھر میں تو کہیں کا نہیں رہوں گا؟ آدمی کو یہ سوچنا چاہیے۔

حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ غصے میں آکر اپنے غلام کی پٹائی کررہے تھے، پیچھے سے ایک آواز سنی: ﴿اعلم أبا مسعود، اعلم أبامسعود﴾ اے ابومسعود! آگاہ ہوجاؤ، خبردار ہوجاؤ، سن لو۔ جب پیچھے مڑکر دیکھا تو نبی کریم ﷺ ہیں، آواز سن کران کا ہاتھ تو رک ہی گیا تھا۔ آگے حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿لَلّٰہُ اَقْدَرُ عَلَیْکَ

مِنْکَ عَلَیْہِ ﴾ اے ابومسعود! تم کو اس غلام پر جتنی قدرت حاصل ہے یعنی تم اپنی قوت اور قدرت کی وجہ سے اس پر اپنا غصہ جتنا نکال رہے ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ وہی معاملہ ہونے لگے جو تم اس کے ساتھ کرتے ہو؛ تو سوچو آخر کیا انجام ہوگا؟ حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں یہ سن کر لرز گیا اور فوراً میں نے کہا: یہ غلام اللہ کے واسطے آزاد ہے۔ یعنی مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی اس کی تلافی میں نے یوں کی کہ اس غلام کو آزاد کردیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابومسعود! اگر آپ اس کو آزاد نہ کرتے؛ تو جہنم کی آگ تمہیں اس حرکت کی وجہ سے اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ (صحیح مسلم ۳/۱۲۸۰)

تو بہرحال! یہ غصہ کی عادت کو دور کرنے کی دائمی تدبیر یہ ہے کہ آدمی روزانہ یہ سوچتا رہے، یہاں تک کہ یہ فکر اور سوچ اس پر غالب آجائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر کسی کے اوپر جب غصہ کرنے کے لئے طبیعت چاہے گی؛ تو یہ سوچ کر وہ باز رہے گا۔ اور اپنے آپ کو غصے سے روکے گا۔

غصہ بڑا عقلمند ہے

حضرت مولانا حکیم اختر صاحب دامت برکاتہم تو یوں فرماتے ہیں: بھائی! لوگ یوں کہتے ہیں کہ غصہ میں عقل نہیں ہے۔ پھر وہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی نوراللہ مرقدہٗ کا مقولہ نقل کرتے ہیں کہ بھائی! غصہ بھی بڑا عقلمند ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ غصے میں عقل نہیں، ایسا نہیں ہے۔ غصہ بھی بڑا عقلمند ہے۔ آدمی غصہ اسی پر کرتا ہے جو اپنے سے کمتر اور کمزور ہو۔ اگر سیر کا سوا سیر سے مقابلہ ہوجائے، تو یہ دیکھتا ہے کہ سامنے والا سوا سیر ہے لہٰذا اس کے جی

میں غصہ آئے تب بھی اس کا اظہار نہیں کرتا۔ اس لئے یہ کہنا کہ غصہ بے وقوف ہے، یہ بات بھی صحیح نہیں۔ وہ بھی بڑا عقلمند ہے کہ وہ ایسے موقع پر ہی نمایاں ہوتا ہے جب سامنے والے کو اپنے سے کمزور دیکھتا ہے۔ لیکن سامنے والا اگر اپنے سے قوی ہو تو اس نے چاہے اس سے زیادہ خطرناک بات کی ہو، گستاخی کا معاملہ کیا ہو؛ تب بھی سب پی کر رہ جائیں گے۔ اس لئے آدمی یہ سوچ لے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو مجھے جواب دینا ہے تو اس صورت میں ایسی نوبت نہیں آئے گی۔

﴿غصہ پی جانے کی فضیلت﴾

عن معاذبن أنس رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ قَادِرٌ عَلٰى أَنْ يُنْفِذَهٗ، دَعَاهُ اللّٰهُ سبحانہ وتعالیٰ عَلٰى رُؤُوْسِ الْخَلَائِقِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُخَيِّرَهٗ مِنَ الْحُوْرِ الْعِيْنِ مَاشَآءَ

حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنے غصہ کو دبا لے حالانکہ وہ اپنے اس غصہ پر عمل کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس کو اپنے کسی ماتحت پر، کسی ایسے آدمی پر جو اس کے مقابلے میں کمزور ہے؛ غصہ آیا، اور وہ اپنے اس غصہ کے تقاضے کو پورا کر سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ سوچ کر کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے غصہ کرنے سے منع کیا ہے، اپنے غصے کو دبا دے، اور غصے کے تقاضے پر عمل نہ کرے؛ تو قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو تمام مخلوق کے سامنے اختیار دیں گے کہ خوبصورت آنکھوں والی حوروں میں سے جس کو چاہو پسند کر لو۔ گویا اللہ تعالیٰ کی خاطر اس نے اپنے اس غصہ کو دبایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بدلے کے طور پر یہ نعمت عطا فرمائی۔ حقیقت یہی ہے کہ آدمی جب اللہ تبارک وتعالیٰ کا تصور کرے گا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب

دینا ہے تو اس صورت میں اس کے لئے غصہ کو فرو کرنا آسان ہو جائے گا۔

﴿امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ﴾

امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کا نام علی تھا، جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں۔نسب اس طرح ہے علی بن حسین بن علی۔ایک مرتبہ ان کا غلام گرم پانی ان کو دینے کے لئے آیا، پانی ان کے بچے پر گر گیا، یہ دیکھ کر ان کو غصہ آ گیا اور چہرہ سرخ ہو گیا۔فوراً اس غلام نے آیت پڑھی ﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ کہ وہ لوگ جو اپنے غصہ کو دبانے والے ہیں۔فوراً سمجھ گئے اور غصہ کی ساری کیفیت اسی وقت ختم ہو گئی اور دور ہو گئی۔ پھر آگے اس نے پڑھا ﴿وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ یعنی لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔تو انھوں نے کہا: مَیں نے تمہیں معاف کر دیا۔پھر اس نے آیت پڑھی ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔تو کہا: جا! میں نے تجھے آزاد کر دیا (شعب الایمان ۶/ ۳۱۷) یعنی آیت کے تینوں جزو پر انھوں نے اس طرح سے عمل کیا۔اتنا ہی نہیں کہ اس سے انتقام نہیں لیا بلکہ معاف بھی کر دیا اور آزاد بھی کر دیا، حالانکہ وہ ان کا غلام اور ماتحت تھا، اس کو بڑی سے بڑی سزا دینا چاہتے تو دے سکتے تھے۔

﴿غصہ مت کرو﴾
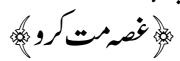
عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم: اَوْصِنِيْ. قَالَ: لَا تَغْضَبْ. فَرَدَّدَ مِرَاراً. قَالَ: لَا تَغْضَبْ.. (رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی نصیحت فرما دیجئے؟ کوئی مخصوص نصیحت جو تاکید کے طور

پر کی جاتی ہے اس کو وصیت کہتے ہیں۔اس نے کہا: آپ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: غصہ مت کرو۔اس نے پھر بار بار اپنی یہ درخواست پیش کی یعنی دوسری تیسری مرتبہ بھی اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ لَا تَغْضَبْ ﴾ غصہ مت کرو۔جتنی مرتبہ اس نے پوچھا اتنی مرتبہ نبی کریم ﷺ نے یہی جواب دیا۔

﴿سوال ایک، جواب الگ الگ﴾

ایک بات یاد رہے کہ احادیث میں مختلف مواقع پر ایسا آیا ہے کہ کسی آدمی نے آکر نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ اللہ کے رسول! مجھے کوئی نصیحت کیجئے، تو آپ نے کوئی بات نصیحت کے طور پر ارشاد فرمائی۔مختلف لوگوں کو مختلف جوابات دئے۔یہاں جو آدمی آیا اس نے جب آپ ﷺ سے نصیحت کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے اس کے جواب میں اس کو غصہ نہ کرنے کی تاکید فرمائی۔لہٰذا مختلف لوگوں کی طرف سے ایک ہی طرح کا سوال کیا گیا لیکن جواب میں نبی کریم ﷺ نے ہر موقع پر ہر آدمی کے مناسبِ حال بات ارشاد فرمائی، وہ اس لئے کہ آپ ﷺ تو طبیبِ روحانی تھے، آپ روحانی بیماریوں کا علاج فرمایا کرتے تھے۔جو جس قسم کا بیمار آیا اس کے مناسب اس کے لئے آپ ﷺ نے دوا تجویز فرمائی۔اس آدمی کو جس نے سوال کیا تھا اور آپ ﷺ سے نصیحت کی درخواست کی تھی، اس کے حالات کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ اس آدمی میں غصہ کی عادت ہے، اس لئے نبی کریم ﷺ نے اس کو تاکید فرمائی کہ غصہ مت کرو۔بار بار اس نے درخواست کی، بار بار نبی کریم ﷺ نے یہی جواب ارشاد فرمایا۔

﴿حالات کی حکمت﴾

عـن أبی هریرةؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَـایَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْمُؤْمِنِ وَالْمُؤْمِنَةِ فِیْ نَفْسِهٖ وَوَلَدِهٖ وَمَالِهٖ حَتّٰی یَلْقَی اللهَ تَعَالٰی وَمَاعَلَیْهِ خَطِیْئَةٌ . (رواہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آزمائشیں ایمان والے مرد اور ایمان والی عورت پر ان کی جان میں ان کی اولاد میں ان کے مال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برابر آتی رہتی ہیں؛ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملتا ہے کہ اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

پہلے بھی بتلایا تھا پچھلی روایتوں میں بھی آیا کہ آدمی پر جو مختلف حالات و مصائب آتے ہیں، کبھی اس کی جان میں جیسے اس کو خود کوئی تکلیف پہنچی، بیماری لاحق ہوگئی، بخار آیا اور کسی بیماری میں مبتلا ہوا، کوئی عضو ٹوٹ گیا، ہڈی ٹوٹ گئی، کسی عضو کی صلاحیتوں سے محروم ہوگیا، یا اور کسی طریقے سے اس کی جان کو تکلیف پہنچی۔ یا اس کی اولاد بیمار ہوئی اولاد کو کوئی حادثہ پیش آیا، اولاد کی نعمت ہی چھن گئی، جو بھی شکل ہو، یا مال کے سلسلے میں کوئی مالی نقصان پہنچا، کاروبار میں کوئی کمی آگئی۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی پر جو حالات آتے ہیں وہ تین قسم کے آسکتے ہیں۔ جان پر، اولاد پر یا مال پر۔ تو ان تینوں چیزوں پر مختلف آزمائشیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہیں اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ یہ چیزیں اس پر بھیج کر اس کو گناہوں سے پاک صاف کرتے رہتے ہیں یعنی ان مصائب کی وجہ سے اس کے گناہ دھلتے ہیں، گناہوں کی صفائی ہوتی ہے، یہاں تک کہ جب موت کا اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا وقت آتا ہے؛ تو ان مصائب کی

وجہ سے وہ بالکل پاک صاف ہوکر اللہ تعالیٰ سے ملتا ہے اور کوئی گناہ اس پر نہیں ہوتا۔ گویا ایسے حالات جب آدمی پر آئیں تو ان کی وجہ سے دل گرفتہ یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ یوں سمجھے کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے میرے اوپر نعمت ہی نعمت ہے۔

بہرحال! اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے، آدمی اس میں صبر کا اظہار کرے، اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہے، اور جیسا موقع ہو اس کے مناسب حال اللہ تعالیٰ کے ان فیصلوں پر عمل کرتا رہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر کوئی مصیبت آئی ہے تو صبر سے کام لے۔ کوئی نعمت ملی ہے تو شکر کا اظہار کرے۔ جیسا کہ پہلے بھی آ گیا۔ یہ مصائب جو آتے ہیں وہ بے کار نہیں ہیں، ان کی وجہ سے آدمی گناہوں سے پاک صاف ہوتا رہتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک قصہ

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں امورِ مملکت کے اندر اپنی جو شوریٰ یعنی مشورہ کے لئے کمیٹی بنائی تھی اس میں علماء اور قراء ہی کو (یعنی جو کتاب اللہ اور حدیث کے علوم کے ماہر تھے انہیں کو) شامل کیا تھا۔ حر بن قیسؒ ایک تابعی ہیں، بڑے عالم ہیں؛ وہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس مشاورت کے ایک رکن تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے چچا عیینہ بن حصن رضی اللہ عنہ - جو صحابی ہیں لیکن ان کے مزاج میں کچھ ذرا اکھڑ پن تھا - اپنے بھتیجے حر بن قیسؒ کے یہاں مہمان ہوئے۔ اور انھوں نے کہا: دیکھو! امیر المؤمنین کے یہاں تمہارا رسوخ ہے، تمہاری بات وہاں مانی جاتی ہے، تمہارا ایک مقام ہے، تم ان کی مجلسِ مشورہ کے

ایک رکن ہو، اس لئے مجھے بھی ان کی خاص مجلس میں حاضری کا جی چاہتا ہے، تم میرے لئے اجازت لے لو۔ ویسے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ملاقات کے لئے ہر کس و ناکس کو اجازت تھی لیکن ان کی جو خصوصی مجلس مشورہ کے لئے ہوتی تھی اس میں ہر آدمی نہیں جا سکتا تھا۔ انھوں نے اپنے بھتیجے کو جو اس مجلس کے رکن تھے یہ کہا: آپ کل کے دن میرے واسطے اس کی اجازت لے لو کہ میں بھی آپ کے ساتھ ساتھ اس مجلس میں حاضر ہو سکوں۔ چنانچہ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے درخواست کی: کہ امیر المؤمنین! میرے چچا میرے یہاں مہمان آئے ہوئے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ وہ بھی کل میرے ساتھ آپ کی مجلس میں حاضر ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی کہ ٹھیک ہے، ان کو اپنے ساتھ لے آنا۔ وہاں پہنچنے کے بعد انھوں نے وہی اپنے مزاج کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے کہا: اے ابن خطاب! تو ہمارے ساتھ کوئی اچھا معاملہ نہیں کرتا، احسان کا معاملہ نہیں کرتا اور انصاف سے ہمارے ساتھ پیش نہیں آتا۔ حالانکہ ان کی یہ بات غلط تھی ﴿فَغَضِبَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ حَتّٰى هَمَّ اَنْ يُّوْقِعَ بِهٖ﴾ ان کی اس نامناسب بات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور وہاں تو فوراً سزا کے لئے ہاتھ میں کوڑا رہتا ہی تھا، سزا دینے کا ارادہ کیا کہ ایسی بے کار اور غلط بات کیوں کی۔ خواہ مخواہ ہی انھوں نے ایسا کہا تھا۔ جب حر بن قیس رحمہ اللہ نے دیکھا کہ اب تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ان کی خبر لے لیں، فوراً حر بن قیس رحمہ اللہ نے موقع کی نزاکت پا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا: اے امیر المؤمنین دیکھئے! قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو تاکید کی ہے ﴿خُذِ الْعَفْوَ﴾ لوگوں کو معاف کرنے کا طریقہ اپنائیے، یعنی لوگوں کو معاف کر دیجئے۔ ﴿وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾ اور لوگوں کو بھلی بات کا حکم کیجئے ﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ اور ایسے ناواقف اور جاہل

لوگوں سے درگذر کیجیے۔انھوں نے یہ آیت پڑھی اور اپنے چچا کی طرف اشارہ کر کے یہ بھی کہا: ﴿وَاِنَّ ھٰذَامِنَ الْجَاھِلِیْنَ﴾ یہ بھی جاہلین میں سے ہیں، اس لئے آپ ان سے درگذر کیجیے۔ یہ آیت پڑھ کر انھوں نے یہ درخواست کی۔ (بخاری۴/۱۷۰۲)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک خاص مزاج اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قصہ

تو دیکھئے! حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ ایک خاص مزاج تھا۔ پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ جہاں ان کو کسی بھی حالت میں اسلام کی کسی تعلیم کا یا قرآن کی آیت کا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کا حوالہ دے دیا جائے، پھر غصہ کیسا ہی کیوں نہ ہو؛ فوراً فرو ہو جاتا تھا۔ اور اسی وقت اس سے باز آ کر اس موقع کے مناسب جو حالت اختیار کرنی ہوتی تھی، فوراً وہ اختیار کر لیتے تھے، اس میں ذرہ برابر دیر نہیں کرتے تھے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جب تہمت کا معاملہ پیش آیا اور بعد میں قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کی برأت نازل ہوئی، اس معاملے میں جن لوگوں نے حصہ لیا تھا ان میں ایک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خالہ زاد بہن کے صاحبزادے بھی تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کو وظیفہ دیا کرتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو تاجر آدمی تھے، ان کے پاس مال تھا، تو وہ سب کو دیا کرتے تھے، ان کی بھی مدد کرتے تھے۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت ظاہر ہوئی اور معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ جو اتہام کا معاملہ کیا گیا وہ غلط تھا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ ان کو اب نہیں دوں گا۔

دیکھو! ابھی تک تو انھوں نے قسم نہیں کھائی تھی۔ جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف

سے برأت نازل نہیں ہوئی تھی تب تک انھوں نے کچھ نہیں کیا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے برأت نازل ہوئی تو اب معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو اتہام کا معاملہ کیا گیا تھا؛ وہ غلط تھا، اب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ میں ان پر جو خرچ کرتا تھا اب نہیں کروں گا اب ان کو نہیں دوں گا، وظیفہ بند کردیا اور قسم بھی کھالی، قسم کھا کر کہا کہ نہیں دوں گا۔ اس پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ﴾ جو تم میں سے فضیلت والے ہیں، اہلِ فضل ہیں، وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے مال میں سے رشتہ داروں کو اور مسکینوں کو نہیں دیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کے لئے خاص یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں آخر میں ہے ﴿أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کریں؟ جوں ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیتیں سنائیں اسی وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ﴿بَلَىٰ! أُحِبُّ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لِي﴾ کیوں نہیں! میں تو اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے۔ اسی وقت انھوں نے اپنی قسم توڑ دی اور کہا کہ میں جو وظیفہ دیتا تھا؛ وہ دیتا رہوں گا، بلکہ دوگنا کردیا۔ اور اب تک جو روک رکھا تھا؛ وہ بھی دے دیا۔

یہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان تھی کہ ان کے سامنے جب ایسی کوئی بات ان کی کسی غلطی پر متنبہ کر کے قرآن یا حدیث کا حوالہ دے کر کہی جاتی تھی تو وہ فوراً عمل کے لئے آمادہ ہو جاتے تھے۔

﴿ہمارا مزاج قابل اصلاح﴾

ہم لوگوں کا مزاج ایسا ہے کہ اگر ہم کو کبھی ایسا کوئی موقع پیش آجاوے اور کسی نے ہم کو قرآن کی آیت یا حدیث کے حوالے سے کوئی بات سمجھانی چاہی تو ہم فوراً جواب کے لئے تاویلات کرتے رہتے ہیں کہ اصل بات یوں ہے اور فلاں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، تاویل کرنے کی گنجائش ہر ایک کے لئے رہتی ہے لیکن یہ حضرات کبھی کسی چیز میں اس کو گوارا نہیں کرتے تھے اور بھی بے شمار ایسے واقعات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہیں۔

یہاں دیکھئے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے جب حر بن قیس رحمہ اللہ نے وہ آیت کریمہ پیش کی اور یوں کہا کہ یہ بھی جاہلین میں سے ہیں، آپ ان سے درگذر کیجئے، اللہ تعالیٰ قرآن میں ایسے لوگوں سے درگذر کا حکم دے رہے ہیں تو فرماتے ہیں ﴿وَاللہِ مَاجَاوَزَهَا عُمَرُ حِیْنَ تَلَاهَا وَکَانَ وَقَّافًا عِنْدَ کِتَابِ اللہِ تَعَالٰی﴾ جوں ہی انھوں نے یہ آیت پڑھی کہ فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، اس سے ذرا بھی آگے نہیں بڑھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتاب پر بڑی تاکید سے عمل کرنے والے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو جب اللہ اور اس کے رسول کی ہدایتوں کا حوالہ دیا جائے تو فوری طور پر عملی جامہ پہنانا چاہیے، اس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں رکھنی چاہیے۔

﴿جب کھلی ناانصافی دیکھے تو کیا کرے﴾

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اِنَّھَا سَتَکُوْنُ بَعْدِیْ اَثَرَۃٌ وَاُمُوْرٌ تُنْکِرُوْنَھَا قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللہِ فَمَاتَأْمُرُنَا؟ قال: تُؤَدُّوْنَ الْحَقَّ الَّذِیْ عَلَیْکُمْ وَتَسْأَلُوْنَ اللہَ الَّذِیْ لَکُمْ (متفق علیہ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے بعد ایسی صورتیں پیش آئیں گی کہ تمہارے مقابلے میں دوسروں کو ترجیح دی جائے گی یا ایسی باتیں تم دیکھو گے جن کو تم اجنبی اور اُوپرا (અપરિચિત) سمجھو گے یعنی اس سے پہلے ایسی صورتیں پیش نہیں آئی ہوں گی۔

بات دراصل یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ ایک انصاری صحابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے ایک اور آدمی کو کوئی کام سونپا تھا، کوئی منصب اور عہدہ دیا تھا، کسی جگہ کا ان کو عامل بنایا تھا۔ تو انھوں نے آکر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے فلاں کو تو یہ منصب دیا، مجھے نہیں دیا؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: دیکھو! ایسی بات نہیں ہے، میں ایسا نہیں کرتا۔ لیکن ایک بات یاد رکھو کہ بعد میں ایسے حالات پیش آنے والے ہیں کہ تمہارے مقابلے میں دوسروں کو ترجیح دی جائے گی اور ایسی صورتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے جو اس وقت نظر نہیں آرہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تو کچھ نہیں ہوا، آگے ایسا ہونے والا ہے، اس وقت پھر ان حضرات نے پوچھا: اللہ کے رسول! اچھا! جب ایسے حالات پیش آئیں تو آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ یعنی ایسے حاکموں کے ساتھ ہم کیا معاملہ کریں؟ کیا تلوار لے کر ان کے مقابلے کے لئے میدان میں آجائیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں ﴿تُؤَدُّوْنَ الْحَقَّ الَّذِیْ عَلَیْکُمْ﴾ تمہارے اوپر ان کا جو حق ہے؛ وہ تم ادا کرتے رہو ﴿وَتَسْأَلُوْنَ اللّٰہَ الَّذِیْ لَکُمْ﴾ اور تمہارا ان کے اوپر جو حق ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو۔

﴿خوشگوار معاشرت کا راز﴾

دیکھئے! اسلام کی تعلیمات میں یہ خاص بنیادی پوئنٹ (point) اور نکتہ ہے۔ جہاں کہیں بھی ایسا کوئی معاملہ پیش آئے گا جن کا تعلق دو فریق سے ہو، کوئی بھی معاملہ جس میں دو گروہ ملوث ہوتے ہیں تو ایسے حالات میں نبی کریم ﷺ ہر فریق اور ہر گروہ کو دوسرے فریق کے حقوق سے متعلق کچھ ہدایتیں فرماتے ہیں اور ان کو اس کی تاکید کرتے ہیں کہ اس پر عمل کرو۔ اسی لئے اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تمہارا فلاں پر یہ حق ہے۔ آپ تمام احادیث کا مطالعہ کر لیجئے، وہاں یہ آئے گا کہ تم پر فلاں کا یہ حق ہے۔ بیویوں کو یوں خطاب کیا کہ تم پر شوہروں کا یہ حق ہے۔ شوہروں کو یوں خطاب کیا کہ تم پر بیویوں کا یہ حق ہے۔ ماں باپ کو یوں کہا کہ تم پر اولاد کا یہ حق ہے۔ اور اولاد کو یوں کہا کہ تم پر ماں باپ کا یہ حق ہے۔ اولاد کو یوں نہیں کہا کہ تمہارا ماں باپ پر یہ حق ہے۔ یعنی اس پر دوسرے کا جو حق آتا ہے وہ تو بتایا۔ گویا اس کو یوں تاکید کی جارہی ہے کہ یہ حق اس کا تمہارے اوپر ہے؛ تم اس کو ادا کرو۔ اور تمہارا اس پر کیا حق ہے؛ وہ نہیں بتایا۔ گویا اسلام اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ تمہارے اوپر جو دوسروں کے حقوق ہیں ان کی ادائیگی کا آپ اہتمام کیجئے، اور اس کی کوشش کیجئے۔ اور تمہارا حق جو دوسرے پر ہے اس کا مطالبہ مت کرو۔ اگر وہ نہیں ادا کرتا؛ تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔

آج کل جو جھگڑے چل رہے ہیں وہ اسی لئے ہیں کہ ادا کوئی کرتا نہیں، اور مانگ سب رہے ہیں۔ ہر ایک دوسرے سے کہتا ہے کہ میرا تیرے اوپر یہ حق ہے۔ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ مجھ پر تمہارا کیا حق ہے؟ لہٰذا لڑائی اور کھینچا تانی ہی ہوگی۔ جب ہر ایک یوں سوچے کہ میرے اوپر فلاں کا یہ حق ہے۔ باپ یوں سوچے کہ اولاد کا یہ حق ہے اس لئے میں

ادا کرتا ہوں۔ شوہر یوں سوچے کہ بیوی کا یہ حق ہے لہٰذا میں ادا کرتا ہوں، لیکن میرا بیوی پر کیا حق ہے وہ اس سے مطالبہ نہ کرے؛ تو کبھی کوئی جھگڑا ہی نہ ہوگا۔

﴿اسلام کی اہم تعلیم﴾

اس لئے اسلام نے جو تعلیمات دیں ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں کہیں دو فریق ہوں، دو گروہ ہوں، دو پارٹی ہوں؛ وہاں ایک کا دوسرے پر کیا حق ہے وہ بتلایا ہے دوسرے کا اس پر کیا حق ہے؛ وہ نہیں بتلایا۔

اسی لئے حکومت کرنے والے جو حُکّام ہیں ان کے بارے میں رعایا کو تو یوں کہا کہ ان کا تمہارے اوپر حق یہ ہے کہ وہ تم کو جو حکم دیں اس کو بجالاؤ، ان کے احکام کی خلاف ورزی مت کرو، نافرمانی مت کرو، سمع اور طاعت کو شیوہ بناؤ۔ یہاں تک کہ حدیث میں آتا ہے ﴿اِسْمَعُوْا وَأَطِيْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ كَأَنَّ رَأْسَهُ زَبِيْبَةٌ (رواہ البخاری (مشکوۃ ۳۱۹)﴾ تم حکام کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو، ان کی باتیں مانو، اس کے اوپر عمل کرو، ان کے حکم پر چلو؛ چاہے تم پر حاکم بنایا جائے ایسا حبشی غلام کہ جس کا سر اتنا چھوٹا ہو جیسے کہ کشمش (منقیٰ) ہوا کرتی ہے۔ اس لئے کہ حبشیوں کے سر ان کی جسامت کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے ہیں، اور ایسا حبشی اور زیادہ کمزور سمجھا جاتا ہے، پھر بھی جب وہ تم پر حاکم بنا دیا جائے؛ تو تم بات کو مانو۔ گویا حاکموں کی اطاعت کی بڑی تاکید آئی ہے۔ اور اگر ان کی طرف سے تم پر کوئی زیادتی ہو تو ان کے مقابلے پر نہ اترو، تمہارا ان پر جو حق ہے اس کو مانگنے کے لئے تم طاقت کا استعمال یا بغاوت کا ارادہ بھی مت کرو؛ بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرتے رہو۔ اگر یہ سلسلہ رہے گا تو کبھی حکومت میں بدامنی نہیں

پھیلے گی۔ یہ اسلام کی اہم تعلیم ہے۔

اسی طرح مثلاً ایک سائل اور مانگنے والا ہے۔ حدیث پاک میں سائل کا کیا حق ہے وہ بھی بتادیا کہ اگر کوئی مانگنے والا سائل اور بھکاری آپ کے پاس آئے اور وہ آپ سے کچھ مانگے تو حدیث میں آتا ہے کہ مانگنے والے کو دو ﴿وَلَوْ جَاءَ عَلٰی فَرَس﴾ چاہے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر مانگنے کے واسطے آیا ہو۔ آپ اس سے یوں کہیں کہ ارے تو تو گھوڑا لے کر آیا ہے، تو کیا بھیک مانگتا ہے؟ آپ کو ایسا کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ معلوم نہیں اس کے کیا حالات ہیں اور وہ کیوں سوال کر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ جس سواری پر سوار ہو کر آیا ہے، وہ اس کی نہ ہو، کسی اور کی لے کر آیا ہو۔ مطلب یہ کہ اس کی ظاہری حالت چاہے تم کو یہ بتلا رہی ہے کہ یہ بظاہر محتاج معلوم نہیں ہوتا لیکن جب وہ آپ سے سوال کر رہا ہے تو آپ دیجیے۔ یہ ایک بات ہوئی۔ تو دیکھو! جن سے مانگا جا رہا ہے ان کو تو یہ تاکید ہے۔

اور دوسری طرف حضور ﷺ نے فرمایا: جو آدمی سوال کرتا ہے، قیامت کے روز اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا (متفق علیہ (مشکوۃ ۱۶۲)) یعنی اس کا چہرہ بغیر گوشت کے ہوگا، گویا یہ سوال اس کے چہرے کی رونق کو ختم کرنے والا ہے۔ قیامت کے روز اس کے چہرے پر خراشیں لگی ہوئی ہوں گی (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی۔ مشکوۃ۔ ص۔۱۶۲) اور یہ بھی فرمایا: جو آدمی سوال کا دروازہ کھولتا ہے؛ اللہ تعالیٰ اس کے لئے فقر کے دروازے کھولتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سوال سے بہت سختی کے ساتھ منع کیا گیا۔

بلکہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ سے یہ درخواست کی: یارسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ آپ نے ان کو یہ نصیحت فرمائی ﴿لَا تَسْئَلْ﴾ کسی سے سوال مت

کرنا۔ آپ ﷺ کی اس نصیحت پر ان صحابی نے ایسا عمل کیا کہ اگر گھوڑے پر سوار ہوتے اور کوڑا گر جاتا تھا تب بھی کسی سے نہیں مانگتے تھے کہ میرا کوڑا دے دو، خود گھوڑے سے اتر کر لے لیتے تھے۔

بہرحال دیکھئے! یہاں پر دونوں فریق سے تعلق ہوا۔ سوال کرنے والے کو تو یوں کہا کہ سوال مت کرو، سوال کی وجہ سے یہ مصیبت اٹھانی پڑے گی۔ اور اُدھر ان کو یوں کہا کہ اگر کوئی سوال کرنے والا آوے تو دو، چاہے گھوڑے پر سوار ہو کر آیا ہو۔ اب جو ہدایت اور حکم اس پیسے والے کو اور مسئول کو دیا گیا ہے، اگر اس کو سائل یاد کر لے، اور فقیر کو جو ہدایت کی گئی ہے اس کو مسئول یاد رکھے؛ تو کیا نتیجہ ہوگا؟

مثلاً کوئی مانگنے کے لئے آیا تو یہ اس کو دینے کے بجائے یوں سنا رہا ہے کہ بھائی! تو سوال کرتا ہے؟ حدیث میں تو سوال کرنے پر وعید آئی ہے۔ حدیث میں تو یوں آیا ہے کہ جو سوال کا دروازہ کھولتا ہے؛ اس کے لئے فقر کا دروازہ اللہ تعالیٰ کھول دیتے ہیں۔ یہ حدیث حضور ﷺ نے اس (مسئول) کے یاد کرنے کے لئے ارشاد نہیں فرمائی ہے۔ یہ تو اس (سائل) کے لئے فرمائی تھی، یاد اُس نے کر لی۔ اور جب فقیر اس کے پاس جاتا ہے تو فقیر اس کو یوں قرآن کی آیت سناتا ہے ﴿و أما السائل فلا تنهر﴾ مانگنے والے کو جھڑکو مت۔

﴿بھکاری مفسر﴾

ہمارے بھائی نے ایک قصہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ منشی اللہ دتہ مرحوم کے ساتھ جماعت میں گئے تھے (منشی اللہ دتہ حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ کے خلیفہ تھے) اور وہ بڑے تیز مزاج تھے ہمیشہ جماعتوں میں چلتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی جگہ جانا ہوا اور کوئی مانگنے کے لئے آیا۔ اس کو

انھوں نے بھگانے کے واسطے ڈانٹ دیا تو اس پر اس نے یہ آیت پڑھی ﴿وأما السائل فلا تنهر ﴾ مانگنے والے کو جھڑکو مت۔ تو انہوں نے کہا: جا جا! تیرے جیسے بھکاری مفسر بہت دیکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے۔

مطلب یہ ہے کہ ﴿فلا تنهر ﴾ والا حکم فقیر کو نہیں دیا ہے۔ اس کو یہ آیت ہدایت کے طور پر نہیں کی گئی۔ اِس کو تو اِس کی کہی گئی تھی۔ جس سے مانگا جارہا ہے اُس کو یوں کہا گیا تھا کہ مانگنے والے کو جھڑکو مت۔ یا کوئی گھوڑے پر سوار ہو کر آوے تب بھی اس کو انکار مت کرو، اس کو دو۔ لیکن اب یہ دونوں باتیں وہ بھکاری یاد کرلے، اور آ کر کہے کہ دیکھو! حدیث میں یوں آیا ہے۔ تو اب اس صورت میں جھگڑے ہی ہوں گے۔ لہٰذا فقیر کو کہیں گے کہ یہ ہدایت تجھے نہیں دی گئی ہے۔ یہ ہدایت تو اُن کو دی گئی ہے؛ وہ سمجھیں۔ تجھے جو ہدایت دی گئی ہے، اگر اس پر تو عمل کرتا؛ تو ایسا کہنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

لہٰذا ہر مقام پر نبی کریم ﷺ نے خاص یہ انداز اختیار فرمایا ہے۔ جہاں کہیں معاملہ دو گروہ کا ہوا تو ہر ایک گروہ کو اس کی ذمہ داری بتلائی۔ اِس گروہ کو تو یوں کہا کہ اُن کا تم پر یہ حق ہے۔ اور اُن کو یوں کہا تم پر اِن کا یہ حق ہے۔ اب اگر ان میں سے ایک گروہ بھی اس کو دی گئی ہدایتوں کو عملی جامہ پہناوے؛ تو کبھی کوئی جھگڑا ہوگا ہی نہیں۔

سیٹھ کا ملازم اور نوکر پر کیا حق ہے، وہ ملازم کو بتایا، سیٹھ کو نہیں۔ اور ملازم کا کیا حق ہے وہ سیٹھ کو بتایا۔ آج کل سب نے سبق الٹا کردیا۔ ہر گروہ سامنے والے گروہ کو جو تعلیم دی گئی ہے؛ وہ یاد کرلیتا ہے۔ اور خود کو جو تعلیم دی گئی ہے؛ وہ بھول جاتا ہے۔ نتیجے میں جھگڑے ہو رہے ہیں۔ یہ جھگڑے اسی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ اسلام کی تعلیم تو یہی ہے کہ تم پر

جو دوسروں کا حق ہے؛ وہ تم ادا کرو۔ اور تمہارا جو حق دوسروں پر ہے؛ وہ ان سے مانگو مت۔ اگر وہ ادا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، اللہ سے مانگو۔ اللہ تعالیٰ اس کو توفیق دے۔ ان شاء اللہ معاملہ سلجھ جائے گا۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے یہاں بیان فرمایا ہے۔

﴿تم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے تو صبر کرو﴾

عن أبی یحییٰ أسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اَنَّ رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ قَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! أَلَا تَسْتَعْمِلُنِیْ کَمَا اسْتَعْمَلْتَ فُلَانًا. فَقَالَ: اِنَّکُمْ سَتَلْقَوْنَ بَعْدِیْ أَثَرَۃً فَاصْبِرُوْا حَتّٰی تَلْقَوْنِی عَلَی الْحَوْضِ.

انصار میں سے ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ مجھے کوئی منصب نہیں دیتے جیسا کہ فلاں کو دیا؟ اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے بعد تم کو ایسی چیزیں پیش آئیں گی لیکن تم صبر سے کام لینا یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر مجھ سے ملاقات کرو۔

مطلب یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی صاحبِ اختیار لوگ ہوتے ہیں ان کے پاس کچھ اختیارات ہوتے ہیں۔ حکومت کا معاملہ ہے، کوئی عہدہ کسی کو دیا، دوسرے کو نہیں دیا، تو جس کو نہیں دیا گیا ہے اس کو گویا اس بات کی تاکید کی جا رہی ہے کہ تم صبر سے کام لو اور مقابلہ پر اڑ مت جاؤ۔ اس لئے کہ وہ اگر مقابلے پر آئے گا تو فتنہ ہوگا، حالات خراب ہوں گے، بدامنی پھیلے گی۔ اور یہ چیز اسلامی حکومت کو ختم کرنے والی ہے۔ جہاں کہیں بھی ایسے حالات پیش آتے ہیں تو نتیجے میں بغاوتیں پھیلتی ہیں اور اس کی وجہ سے ایک بہت بڑی جماعت کا نقصان ہوتا ہے۔ ابھی تو ایک آدمی کا نقصان ہے، لیکن جب حالات خراب ہوں گے تو پوری قوم اور پوری جماعت کا نقصان ہوگا۔ اس لئے مصلحت کا تقاضہ یہی ہے کہ

آدمی اپنے نقصان کو برداشت کرتے ہوئے صبر سے کام لے۔ اوراسی میں دوسروں کے لئے خیر ہے۔ یہ خاص تاکید نبی کریم ﷺ نے امت کوارشادفرمائی۔

﴿نہ چھیڑو نہ چھوڑو﴾

عن أبی ابراھیم عبداللہ بن أبی أوفی رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ فِی بَعْضِ أَیَّامِہٖ الَّتِیْ لَقِیَ فِیْھَا الْعَدُوَّ، اِنْتَظَرَ، حَتّٰی اِذَامَالَتِ الشَّمْسُ قَامَ فِیْھِمْ. فَقَالَ: یَآأَیُّھَا النَّاسُ! لَاتَتَمَنَّوْا لِقَآءَ الْعَدُوِّ. وَأسْأَلُوْا اللّٰہَ الْعَافِیَۃَ. فَاِذَالَقِیْتُمُوْھُمْ فَاصْبِرُوْا. وَاعْلَمُوْا أَنَّ الْجَنَّۃَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ. ثُمَّ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: أَللّٰھُمَّ مُنْزِلَ الْکِتَابِ وَمُجْرِیَ السَّحَابِ وَھَازِمَ الْأَحْزَابِ، اِھْزِمْھُمْ وَانْصُرْنَا عَلَیْھِمْ.

آپ ﷺ کسی غزوے میں تشریف لے گئے تھے تو وہاں آپ ﷺ نے سورج کے ڈھلنے کا انتظار کیا۔ جب سورج ڈھلا تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو ایک خطبہ دیا: اے لوگو! دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا مت کرو یعنی کبھی یہ خواہش نہیں کرنی چاہیے کہ کاش ان سے مقابلہ ہوتا تو ہم بھی ان کو بتاتے، دودو ہاتھ کرتے، دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہیں کرنی چاہیے، ایک تو یہ بات ارشادفرمائی۔ کیوں کہ دشمن سے مڈبھیڑ ایک طرح کی آزمائش اور ابتلاء ہے اور آدمی کو چاہیے کہ اپنی زبان سے ایسا مطالبہ نہ کرے۔ ﴿وَأسْأَلُوْا اللّٰہَ الْعَافِیَۃَ﴾ مانگنا ہے تو اللہ سے عافیت مانگو۔

پہلے بھی میں نے بتلایا تھا کہ ایک آدمی کو حضور ﷺ نے دیکھا کہ بہت کمزور ہوگیا ہے تو اس سے پوچھا: کیا بات ہے؟ ہمیشہ تجھ کو بخار رہتا ہے۔ تو نے کوئی دعا کی تھی؟ تو اس نے کہا: ہاں! میں نے یہ دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے آخرت میں جو سزا دینے والا ہے وہ

دنیا ہی میں دے کر مجھے پاک کردے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: جب تو یہ دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا نہیں کرسکتا کہ عافیت دے؟ عافیت مانگ، یہاں بھی عافیت رہے وہاں بھی عافیت رہے۔

مطلب یہ ہے کہ کبھی یہ سوال نہیں کرنا چاہیے کہ دشمن سے مڈبھیڑ کی نوبت آئے، اللہ تعالیٰ سے عافیت اور سلامتی مانگنی چاہیے، لیکن جس کی دشمن سے مڈبھیڑ ہوجائے، اللہ تعالیٰ نے مقدر فرمائی تھی اور مڈبھیڑ کی نوبت آگئی تو پھر پیٹھ بھی نہیں پھیرنی چاہیے، پھر تو جم کر ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ گویا یہ خاص تاکید کی کہ صبر سے کام لو۔

اور حضور ﷺ فرماتے ہیں: جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب جہاد کا موقع آجائے تو پھر آدمی کو پیچھے ہٹ (پیچھے ہٹنا) اور پسپائی اختیار نہیں کرنی چاہیے، لیکن اپنی زبان سے مقابلہ اور مڈبھیڑ کا سوال بھی نہ کرے، اور موقع آجاوے تو بزدلی سے بھی کام نہ لے، بہادری اختیار کرے۔

﴿ثم قال النبی ﷺ: أَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ وَمُجْرِيَ السَّحَابِ وَهَازِمَ الْأَحْزَابِ، اِهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَيْهِمْ﴾ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے اللہ! جو قرآن پاک کو نازل کرنے والا اور بادلوں کو چلانے والا ہے، دشمن کے لشکر کو تو شکست دے دے اور ہماری ان کے خلاف مدد فرما۔ گویا اللہ تبارک وتعالیٰ سے ایسے موقع پر مدد کی دعا بھی کرے۔

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ لَااِلٰہَ اِلَّااللہُ اَلْاَحَدُالصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدًا. لَااِلٰہَ اِلَّااللہُ الْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِیْعُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ ذُوْالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ. اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کُلُّہٗ وَلَکَ الشُّکْرُ کُلُّہٗ وَلَکَ الْمُلْکُ کُلُّہٗ وَاِلَیْکَ یَرْجِعُ الْاَمْرُ کُلُّہٗ. اَللّٰھُمَّ لَآاُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَامُحَمَّدٍ وَّعَلٰیٓ اٰلِ سَیِّدِنَاوَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ صَلٰوۃً تُنَجِّیْنَابِھَا مِنْ جَمِیْعِ الْاَھْوَالِ وَالْاٰفَاتِ وَتَقْضِیْ لَنَا بِھَا جَمِیْعَ الْحَاجَاتِ وَتُطَھِّرُنَا بِھَا مِنْ جَمِیْعِ السَّیِّئَآتِ وَتَرْفَعُنَا بِھَا عِنْدَکَ اَعْلَی الدَّرَجَاتِ وَتُبَلِّغُنَا بِھَآ اَقْصَی الْغَایَاتِ مِنْجَمِیْعِ الْخَیْرَاتِ فِی الْحَیٰوۃِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر.

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔ اے اللہ! ہم بے حد گنہگار ہیں۔ گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اے اللہ! تو محض اپنے فضل وکرم سے ہمیں گناہوں کے دلدل میں سے نکال دے۔ اے اللہ! تو ہماری، ہمارے والدین کی، ہمارے اہل وعیال کی، ہمارے بھائی بہنوں کی، ہمارے اعزاء واقارب کی، اساتذہ ومشائخ کی، دوست واحباب کی، محسنین ومتعلقین کی، جنہوں نے ہم کو دعاؤں کے لئے کہا یا لکھا، یا جو ہم سے دعاؤں کی توقع اور امید رکھتے ہیں ان کی اور تمام مؤمنین ومؤمنات، مسلمین ومسلمات پوری امتِ محمدیہ کی مغفرت فرما۔ اے اللہ! تو ہمارے چھوٹے اور بڑے ظاہر وپوشیدہ اگلے اور پچھلے سارے گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری سیئات کو حسنات سے مبدّل فرما۔ اے اللہ! نبی کریم ﷺ کے طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! مجلس میں

جتنے بھی موجود ہیں سب کی پوری پوری مغفرت فرما کر بیماروں کوصحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ اور بھی جن لوگوں نے اپنے بیماروں کی صحت کے لئے دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں، اے اللہ! ان تمام کے بیماروں کوصحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما۔ جن کی اولاد شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہے ان کو صالح جوڑ عطا فرما۔ جن کے لئے شادی کے اسباب نہیں ہیں عافیت کے ساتھ ان کو نکاح کے اسباب مہیا فرما۔ اے اللہ! جو بے اولاد ہیں ان کو اولادِ صالح عطا فرما۔ جن کی اولاد نافرمان ہے ان کو مطیع وفرمانبردار بنادے جو لوگ نرینہ اولاد کے خواہش مند ہیں ان کو نرینہ اولاد عطا فرما۔ اے اللہ! جو لوگ جیلوں میں بند ہیں، ایک مدت سے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ٹاڈا کے نام سے گرفتار ہے۔ اے اللہ! ان تمام کو عافیت کے ساتھ رہائی نصیب فرما۔ اے اللہ! محض اپنے فضل سے سب کے لئے رہائی مقدر فرما، اپنا خصوصی فضل فرما۔ اس امت کے حال پر رحم فرما۔ اے اللہ! جن لوگوں پر مقدمات ہیں عافیت کے ساتھ ان کو بری فرمادے۔ اے اللہ! جن کی جو جو حاجتیں ہیں محض اپنے فضل وکرم سے پوری فرما، اس مجلس میں جتنے بھی موجود ہیں سب کے دلوں کے بھید سے اور دلوں کے حال سے تو واقف ہے اور تیرے خزانے بھرے ہوئے ہیں اے اللہ! سب کی جائز مرادیں محض اپنے فضل سے پوری فرما۔ اے اللہ! حضور اکرم ﷺ نے جتنی خیر و بھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہم کو عطا فرما اور حضور اکرم ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی ان سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہماری دعاؤں کو محض اپنے فضل وکرم سے قبول فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ...